گزارا نہیں ہوتا

مستنصر حسین تارڑ



فہرست

تارڑ صاحب آلو بخارے

"تارڑ صاحب آلو بخارے" کسی راہگیر نے آواز اکسا۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھنا مناسب نہ سمجھا کہ پتہ نہیں کون نا ہنجار ہے جو دن دہاڑے مجھے آلو بخارے کے لقب سے نواز رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ موٹر سائیکل روکتا اور فٹ پاتھ پر چلتے لوگوں سے دریافت کرتا کہ صاحبو آپ میں سے وہ کون بدتمیز شخص ہے جس نے راہ چلتے مجھے آلو بخارہ کہا ہے اول تو سب لوگ مسکراتے اور ان میں وہ شخص بھی شامل ہوتا جس نے مجھے اس القاب سے نوازا تھا اور ظاہر ہے مسکراتے ہی چلے جاتے اور اگر بفرض محال وہ شخص اپنے جرم کا اقرار کر بھی لیتا تو میں اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ یہی کہہ سکتا تھا کہ بھئی آپ کو شرم نہیں آتی ایک شریف آدمی کو آلو بخارہ کہتے ہوئے اور آپ خود آلو بخارے ہوں گے...... چنانچہ میں پیچھے مڑے بغیر اپنے کان لپیٹ کر مائل سفر رہا۔

اصل مسئلہ گوالمنڈی سے گورنمنٹ ہاؤس تک پہنچنا تھا کیونکہ راستے میں ٹریفک کی بھرمار تھی۔ البتہ گورنمنٹ ہاؤس کے بعد راستہ نسبتاً صاف ہو گیا اور میں اپنے موٹر سائیکل کے پھٹے ہوئے سائلنسر اور شاٹ پلگ سے بے نیاز مزے سے مال روڈ کی ہریاول کی باس محسوس کرتا ہوا چلتا گیا۔ ایچیسن کالج کے قریب پیپل کا ایک سالخوردہ درخت مال روڈ کے عین درمیان میں بکھرا پڑا تھا پولیس کی کاریں ٹریفک سارجنٹ اور دوسرا عملہ بے حد مستعد دکھائی دے رہا تھا اور درخت کو

سڑک سے ہٹانے کی کوششیں جاری تھیں، ایک ویگن اور سکوٹر کے سوار جو درخت
گرنے سے شدید زخمی ہو گئے تھے ہسپتال پہنچائے جا رہے تھے .... حسب عادت
لاہور کے جرأت مند شہری کاریں اور موٹر سائیکل .... روک کر اس حادثے سے
لطف اندوز ہو رہے تھے اور وہاں ایک میلے کا سا سماں تھا۔ میں اس میلے میں
سے گزر رہا تھا کہ کار میں سوار دو بچوں نے نعرہ لگایا "تارڑ آلو بخارے" وہ میری
طرف اشارے کرتے ہوئے بار بار اپنے والدین سے بہ آواز بلند "تارڑ آلو بخارے"
کہہ رہے تھے .... آپ یقیناً میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ یہ بچے اخلاقی حدود
پھلانگ کر بدتمیزی کی حد تک آ گئے تھے۔ میں ان کے والد کی عمر کا تھا اور اس لحاظ
سے ان کا بزرگ ٹھہرتا تھا۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا بہر حال میں جو ہمیشہ بچوں
کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتا ہوں اور انہیں "ہیلو کڈز" وغیرہ کہتا ہوں بے حد
سنجیدہ ہو گیا اور اپنے چہرے پر رعونت اور خشونت (اس لفظ کو میں اب بھی غلط ذات
پڑھ جاتا ہوں) وغیرہ سجا کر آگے بڑھ گیا مال روڈ سے نہر کی طرف مڑتے ہوئے میں
نے اطمینان کا ایک طویل سانس اپنے پھیپھڑوں میں کھینچا کیونکہ ٹریفک کا ہجوم اب
ختم ہو چکا تھا اور میرے دونوں طرف صرف درخت تھے .... درخت؟ ....
یہ گر بھی سکتے ہیں جیسے کہ مال روڈ پر پیپل کا ایک درخت گر گیا تھا اور میرے جیسے
کسی گھر جاتے ہوئے شخص کو ہسپتال بھیج دیا تھا چنانچہ میں نے اپنے تئیں ان گرنے
والے درختوں سے بچاؤ کی خاطر رفتار اتنی تیز کر دی کہ میرا اشارٹ بلگ پھٹ پھٹ
آ آ پھٹ" کرنے لگا بہر حال درختوں سے بچنے کے لیے میں یہ صدائے احتجاج برداشت
کرتا رہا۔

نہر کے کنارے سے جب میں ایف سی کالج کی جانب مڑا تو پٹرول پمپ کے
نزدیک کھڑے ایک باریش اور مدبر بزرگ نے جو اچکن اور جناح کیپ میں ملبوس

تھے مجھے دیکھ کر ہاتھ اٹھایا اور نعرہ لگانے کے انداز میں کہا "تارڑ آلو بخارے"....
اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ بچے تو خیر بچے ہوتے ہیں، لیکن ایک مستعلیق
قسم کے بزرگ جو میرے والد صاحب کے ہم عمر ہوں گے یوں سڑک پر کھڑے ہو کر
"اگر آلو بخارے" کی نعرہ بازی کرنے لگیں تو انہیں کون سمجھائے بہت جی چاہا کہ
موٹر سائیکل وہیں روک دوں اور اسی طرح ہاتھ ہلاتا ہوا ان کے قریب جا کر کہوں
کہ جناب قبلہ بزرگوار آپ آلو بخارے، آپ کے والد آلو بخارے .... بس خون
کے گھونٹ پی کر رہ گیا، اور غصے سے کھولتا ہوا اپنے گھر کی جانب سفر کرتا رہا۔
بالآخر جب گھر سامنے آیا تو میں نے اپنے ایکسیلیٹر کو زور زور سے گھمایا تاکہ
انجن کی "گھوں گھوں" کی آواز سن کر بچوں میں سے کوئی باہر آئے اور گیٹ کھولے ہارن
اس لیے نہ بجایا کہ وہ بجتا نہ تھا بیٹری بے حد کمزور ہو چکی تھی، خاصی دیر بعد میری
بیٹی قرۃ العین باہر آئی اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی "ابو آلو بخارے" چنانچہ میں نے
جلدی سے موٹر سائیکل سٹینڈ پر کھڑا کیا اور عینی پر برس پڑا "اگر ابو صبح کے گئے ہوئے
شام کو خیر سے آ جائیں تو انہیں آلو بخارہ کہتے ہیں؟ کتنی بری بات ہے۔ بس آج
سے پارٹی بند، ٹافیاں بند اور خبردار جو میرے ساتھ بات کی تو میں بے حد ناراض
ہوں اور غصے میں ہوں اور .... " اتنی دیر میں میری بیگم باہر آ گئیں اور چڑھی ہوئی
تیوری کو مزید چڑھا کر بولیں "خواہ مخواہ کیوں ڈانٹ رہے ہیں عینی کو؟"
"خواہ مخواہ؟" میں نے ہاتھ لہرا کر بولا "اس نے مجھے آلو بخارہ کہا ہے!"
"کیوں عینی؟" اس نے حیرت سے بچی کی طرف دیکھا
عینی نے اس قسم کی شکل بنا رکھی تھی جس قسم کی شکل پکار پکار کہہ رہی ہوتی
ہے کہ مجھے ڈانٹتے ہو، شرم نہیں آتی چھوٹی سی بچی کو ڈانٹتے ہوئے اور میں ابھی
رونے والی ہوں۔

عینی آپ نے کیا کہا تھا ابو کو؟ میری بیگم نے پھر پوچھا۔

"امی" عینی منہ بسورتے ہوئے بولی۔ میں نے آج صبح جب ابو جا رہے تھے تو ان سے کہا تھا کہ واپسی پر میرے لئے آلو بخارا لے کر آنا...... اب آئے ہیں تو میں نے صرف یہ کہا ہے کہ ابو آلو بخارے...... بس امی یہی کہا تھا۔"

"اوہو" میں جہاں تھا وہیں بیٹھ گیا۔ عینی درست کہہ رہی تھی اس نے آج صبح مجھ سے آلو بخارے لانے کی فرمائش کی تھی...... اور میں نے بطور خاص گوالمنڈی سے ایک کلو آلو بخارا خرید کر لفافے میں ڈال کر کیریئر کے پیچھے بڑے اہتمام سے باندھا تھا۔

"بالکل آلو بخارے عینی، ابھی دیتا ہوں" میں نے کیریئر کی طرف دیکھا تو وہاں ایک پھٹا ہوا لفافہ میرا منہ چڑا رہا تھا۔ ہوا یہ کہ آلو بخاروں کے چھلکنے سے لفافہ راستے میں پھٹ گیا اور وہ ایک ایک کر کے مال روڈ اور نہر کے کنارے گرتے چلے گئے۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ اور وہ تمام حضرات جو "تارڑ صاحب آلو بخارے" کے نعرے لگا رہے تھے دراصل مجھے خبردار کر رہے تھے کہ تمہارے آلو بخارے گر رہے ہیں اور میں ان کی آوازوں پر کان دھرے بغیر سفر کرتا رہا۔ اور اب اپنی بیٹی کے سامنے شرمندہ کھڑا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سچ مچ ہی ایک آلو بخارا محسوس کیا۔ میں ایک ایسی قوم کی طرح تھا جو اپنا رخت سفر باندھتی ہے۔ سفر کا آغاز کرتی ہے اور اس دوران اپنے آس پاس سے لاپرواہ ہو کر چلتی جاتی ہے۔ اس کا رخت سفر...... اس کی تہذیب، اخلاقی اقدار، نظریات ایک ایک کر کے گرتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ آواز دیتے ہیں کہ دیکھو تم بہت کچھ کھو رہے ہو لیکن وہ ان آوازوں پر کان نہیں دھرتی اور بالآخر جب منزل پر پہنچتی ہے تو اس کے ہاتھ خالی ہوتے ہیں...... بالکل میری طرح۔



گھوڑے جنگ نہیں کرتے

پچھلے دنوں مجھے اپنی پرانی لینڈ لیڈی مسز کارٹر بہت یاد آئیں۔ میں انگلستان کے ساحلی قصبے ساؤتھ اینڈ میں بالکل نووارد تھا۔ چنانچہ رہائش کی تلاش کی اسی سلسلے میں مسز کارٹر سے آمنا سامنا ہو گیا۔ یہ آمنا سامنا کالج کے پرنسپل کے توسط سے ہوا تھا جنہوں نے مجھے مسز کارٹر کا پتہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ خاتون نہایت ہمدرد اور رقیق القلب واقع ہوئی ہیں اور تم شکل سے خاصے مسکین لگتے ہو اس لئے میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے قیام و طعام کا مناسب بندوبست کر دیں گی۔

"کیا تم جانوروں سے محبت کرتے ہو؟" یہ تھا پہلا سوال جو مسز کارٹر نے اپنے گھر کا دروازہ کھولتے ہی مجھ پر داغ دیا۔ میں نے فوراً دماغ پر زور دے کر سوچا کہ کیا ماضی میں میری زندگی میں کوئی ایسا کتا، لومڑ، بلی یا ریچھ وغیرہ داخل ہوا تھا جس کے ساتھ مجھے والہانہ محبت وغیرہ ہو گئی ہو لیکن میرے ماضی میں جاندار تو بہت تھے جن سے محبت ہوئی تھی لیکن جانور کوئی نہ تھا۔ بہر حال میں نے ان کا دل دکھانا مناسب نہ سمجھا اور نہایت ادب سے عرض کیا کہ بندے کو تو جانوروں سے عشق ہے۔ لیلیٰ ہو نہ ہو اس کا کتا ہی کافی ہے۔ مسز کارٹر پہلے تو مسکرائی اور پھر زار و قطار رونے لگیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ میڈم کیا ہوا؟ کہنے لگیں مجھے روزی بہت یاد آ رہی ہے۔ میں بت بنا کھڑا رہا کیونکہ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ روزی کون ہے اور انہیں کیوں یاد آ رہی ہے پھر انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے اطلاع دی کہ بے چاری روزی فوت ہو چکی ہے۔ اس پر میں نے قدرے تاسف کا اظہار

کیا اور روزی کی موت کا سبب دریافت کیا مسز کارٹر نے ایک لمبی "شوں" کر کے ناک پونچھی اور بتایا کہ غریب روزی نمونیے میں مبتلا ہو کر ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوئی تھی۔ میں ابھی انگلستان کے موسم سرما کی شدت کے بارے میں اظہار خیال کر رہا تھا کہ مسز کارٹر نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا "کیا تم روزی کی قبر دیکھنا پسند کرو گے؟"

"قبر؟" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں" انہوں نے سر ہلایا "وہ یہیں میرے گارڈن میں ہی دفن ہے۔"

اب یہ اطلاع میرے لئے قطعی طور پر خوشگوار نہ تھی کہ جس گھر میں میرا قیام کا ارادہ تھا اس کے گھر میں مردے دفن کئے جاتے ہیں چنانچہ میں اجازت لے کر رخصت ہوا ہی چاہتا تھا کہ انہوں نے میرا ہاتھ تھاما اور اسی طور روتی ہوئی پچھواڑے میں لے گئیں۔

"یہ ہے میری ڈارلنگ روزی کی قبر" انہوں نے ایک ۸×۸ کے سیمنٹ کے بلاک کی طرف اشارہ کیا۔

"بہت ہی بچپن میں فوت ہو گئی تھیں، جو اتنی چھوٹی قبر ہے۔"

"نہیں آٹھ ماہ کی عمر میں فوت ہوئی تھی۔ روزی میری رنگین چڑیا کا نام تھا۔"

اگلی صبح میری ناشتے کی میز پہ بھی مسز کارٹر جانوروں کا تذکرہ کرتی رہیں، یکدم ان کا اداس چہرہ کھل اٹھا، اور وہ دروازے کی طرف دیکھ کر کہنے لگیں، "آجاؤ جارج ان سے ملو، یہ ہیں ہمارے نئے کرائے دار تارڑ صاحب......" میں اس مسٹر جارج سے دست پنجہ لینے کے لئے اٹھنے کو تھا کہ ہلکی سی "ووف" کی آواز آئی۔ جارج صاحب لمبے چوڑے بالوں والا ایک پستہ قد کتا تھا۔ جس نے مجھ پر ایک

تنقیدی نگاہ ڈالی، پہلے میرے بوٹوں کو سونگھا اور پھر اچھل کر میری گود میں آ بیٹھا۔

"اوہ! مسٹر تارڑ تم کتنے خوش قسمت ہو کہ یہ پہلی ملاقات میں ہی تمہاری گود میں آ بیٹھا ہے، ورنہ جارج تو ہر کسی کو پسند ہی نہیں کرتا۔"

میں ابھی اس مخمصے میں تھا کہ اپنی خوش قسمتی پر ناز اں کس طرح ہوا جائے کہ جارج نے اپنی رال ٹپکاتی لمبی زبان باہر نکالی اور میری تازہ شیو شدہ گال کو ٹپڑ پپڑ کر کے چاٹنے لگا۔

"اوہ اسے تو تم سے محبت ہو گئی ہے۔" مسز کارٹر نے خوشی کی ہلکی سی چیخ ماری قصہ مختصر میں کسی بہانے سے اٹھا اور باتھ روم میں جا کر دوبارہ شیو کی اور پھر اپنے آپ کو سونگھتا ہوا کالج چلا گیا۔

سہ پہر واپسی ہوئی تو جارج صاحب میرے استقبال کو موجود تھے، انہوں نے میری نئی پتلون کا پائنچہ دانتوں میں دبا کر اپنے والہانہ جذبات کا اظہار کیا، چونکہ مسز کارٹر بڑی محبت سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اس لئے میں ایک زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پر سجائے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

مسز کارٹر کا گھر آرام دہ تھا اور کرایہ بھی مناسب اس لئے میں جارج کے گیلے بوسوں اور اس کی وحشی محبت کے باوجود وہیں ٹکا رہا، ایک روز کالج سے واپسی ہوئی تو مسز کارٹر شاپنگ کے لئے باہر گئی ہوئی تھیں اور ان کا جارج میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ کوئی عینی گواہ تو موجود نہیں اور پھر ایک چھڑی کے ساتھ مسٹر جارج کی پٹائی شروع کر دی۔ جارج صاحب قدرے بوکھلائے اور پھر "چوؤں چوؤں" وہاں سے فرار ہو گئے۔ اس واقعے کے بعد جارج نے مجھ میں اور اپنے آپ میں ایک فاصلہ رکھنا شروع کر دیا۔ مسز کارٹر بہت حیران کہ اس کتے کو کیا ہو گیا ہے، تمہارے نزدیک ہی نہیں آتا۔ اور میں مسٹر جارج کو گھورتے

ہوئے چمکار تا کر آجاؤ کتے، ہیلو جارج . . . . مگر جارج صاحب سیانے تھے پاس نہ آتے تھے۔ دور بیٹھے دم ہلاتے رہتے۔

ایک شام ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے مسز کارٹر بہت اپ سیٹ ہوئیں کیونکہ جنگ کے دوران ایک منظر میں کسی گھوڑے کو گولی لگ گئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ مسز کارٹر صرف گھوڑے ہی نہیں انسان بھی تو مر رہے ہیں پر آپ کو افسوس نہیں ہوتا؟ کہنے لگیں انسان تو جنگ کرتے ہیں انہیں مرنا چاہیے۔ گھوڑے تو جنگ نہیں کرتے . . . . تم مشرقی لوگ دراصل اب بھی نیم وحشی ہو، اور جانوروں سے پیار نہیں کرتے۔

ایک روز کالج سے واپسی پر جارج کو اکیلا پا کر میں حسب معمول اسے پچکی لگا رہا تھا کہ مسز کارٹر وارد ہو گئیں۔

"وحشی مشرقی" وہ چیخیں "تم جانوروں سے محبت نہیں کرتے، نکل جاؤ میرے گھر سے۔"

میں نے اپنا سامان سمیٹا اور ان کے گھر سے نکل گیا اور پچھلے دنوں مجھے مسز کارٹر کیوں یاد آئیں!

میرے گھر کے ساتھ ایک وسیع کوٹھی کا بیک یارڈ ہے۔ کوٹھی کے مالک سرگودھا کے ایک لینڈ لارڈ ہیں جو سال میں ایک دو مرتبہ ہی نظر آتے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں ان کے ملازم کوٹھی کی رکھوالی کرتے ہیں اور کوئی چھ سات ریچھوں کی جسامت والے گرانڈیل کتے لان میں لوٹتے رہتے ہیں۔ میں ٹیلی ویژن کے ایریل کی سمت درست کرنے کی خاطر کوٹھے پر گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک مریل سا ملازم کتوں کے آگے گوشت کے ٹکڑے ڈال رہا ہے اور وہ آپس میں گتھم گتھا ہوتے اسے ہڑپ کر رہے ہیں، آٹھ دس کلو سے کم مقدار نہ تھی جو کتوں کے پیٹ میں گئی . . . . اس کام سے فارغ ہو کر ملازم نے ایک چھیچھڑے میں سے ایک سوکھی ہوئی روٹی نکالی اور اسے نگلنے لگا میرے پاس مسز کارٹر کا پتہ نہیں تھا ورنہ میں انہیں لکھتا کہ ہم مشرقی لوگ اب وحشی نہیں رہے اور جانوروں سے بہت پیار کرتے ہیں۔

لنڈن کی کائٹ اور موچی دروازے کی پتنگ

انگلستان میں بسنت کے دن قریب آئے تو اقبال عرف جمی جٹ جو خالص لاہوریا تھا کہنے لگا۔ یار تارڑ اس وقت ہمارے شہر لاہور میں کیا کیا بہاریں ہوں گی۔ ہر طرف گڈیاں ہی گڈیاں اور پتنگیں اوپیچے ہی پیچے . . . . . اور یہاں انگلستان میں انگریز قوم کو پتہ ہی نہیں کہ رُت بدلنے والی ہے اور بسنت آرہی ہے۔

میں نے کہا کہ بھائی جمی ہر ملک کے تہوار لوگوں کے مزاج اور موسموں کے مطابق ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے مزاج میں تو کنجوسی شامل ہے انہیں کیا پتہ کہ کروڑوں روپے کی پتنگیں اور ڈور اڑا دینے میں کیا مزے ہیں . . . . اور پھر یہاں کا موسم . . . . پتنگ چڑھانے کے لئے تو ایک مخدوش چھت، سنہری دھوپ، دنیا جہان سے فراغت اور مال وجان سے لاپرواہی درکار ہے۔ یہاں ڈھلوان چھتیں ہیں۔ ہر وقت سرد اور برفیلی بارش ہوتی رہتی ہے۔ لوگ کمپیوٹر کی طرح کام کرتے ہیں۔ یہاں پتنگ بازی کے لئے حالات سازگار نہیں . . . . لیکن جمی جٹ کی تسلی نہ ہوئی۔ جوں جوں بسنت کا دن قریب آرہا تھا اس کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر ایک ویک اینڈ پر وہ غائب ہو گیا۔ اتوار کی شام کو واپس آیا تو اس کے تھیلے میں سرخ ڈور کا ایک پنّاں تھا۔ اور پلاسٹک میں لپٹی ہوئی دو پتنگیں . . . . .

"تم پاکستان گئے تھے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں میں بریڈ فورڈ گیا تھا۔ اسے بھی پاکستان ہی سمجھو، وہاں ایک دریا ئیاں

ہیں جو بسنت کے موقع پر موچی دروازے اور لوہاری کی پتنگیں امپورٹ کرتی ہیں۔ وہاں سے لایا ہوں۔"

اب جمی جٹ روزانہ صبح اٹھتے ہی کھڑکی پر سے پردہ ہٹا کر باہر جھانکتا اور رونی شکل بنا کر کہتا "بیڑہ غرق آج بھی بارش ہو رہی ہے۔ یار تار ڑ دعا کرو بسنت والے دن بارش نہ ہو۔ چار دن رہ گئے ہیں۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ اگر اس روز بارش نہ بھی ہو تو ان پتنگوں کو اڑاؤ گے کہاں پر؟

کہنے لگا "سمندر کے کنارے چلے جائیں گے، ہوا بھی ٹھیک ہو گی۔" اگلے روز ہمارے ایک کلاس ٹیچر مسٹر جان ملر لیکچر دے رہے تھے۔ لیکچر کے دوران انہوں نے کسی گتھی کو سلجھانے کے لئے تمام طالب علموں سے پوچھا کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟ جمی جٹ کی باری آئی تو وہ کہنے لگا "سر بارہ فروری کو بارش نہیں ہونی چاہیئے۔" مسٹر جان ملر نے حیران ہو کر اس عجیب و غریب خواہش کا سبب پوچھا تو جمی جٹ نے اپنی شاندار انگریزی میں انہیں بتایا کہ جناب ہمارے ملک میں اور خاص طور پر ہمارے شہر لاہور میں اس روز بسنت فیسٹول منایا جائے گا جس میں گڈیاں اور پتنگیں اڑائی جائیں گی۔ گڈیاں کا انگریزی ترجمہ اس نے ڈولز کیا اور پتنگوں کو پاکستانی بنا دیا۔ ظاہر ہے مسٹر ملر تک بسنت کی روح نہ پہنچ سکی اور وہ کہنے لگے کہ مسٹر جمی آپ ڈولز کو ہوا میں کس طرح اڑا لیتے ہیں۔ شاید آپ ایسی کائٹ بناتے ہیں جس کی شکل ڈول سے ملتی ہو؟ جمی نے اس کو غنیمت جانا اور کہنے لگا "بالکل سر" اس پر مسٹر ملر نے اپنے ذہن میں کچھ حساب لگاتے ہوئے کہا مسٹر جمی..... میں بھی تمہارے ساتھ شریک ہو جاؤں؟

جمی نے جب یہ سنا کہ مسٹر ملر بھی ایک گڈی باز ہیں تو وہ وفور جذبات

سے مغلوب ہو کر اٹھا اور استاد شاگرد کے رشتے کو بھول کر مسٹر ملر کو گلے لگا لیا۔ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی اور وہ بار بار "تھینک یو مسٹر ملر..... تھینک یو مسٹر ملر" کہہ رہا تھا..... مسٹر ملر نے بڑی مشکل سے اسے اپنے آپ سے علیحدہ کیا کیونکہ انگریز حضرات مردوں کے آپس میں بغل گیر ہونے کو خاصا معیوب سمجھتے ہیں۔

بالآخر بسنت آ گئی۔ اور جمی کی قسمت کہ اس روز آسمان بالکل صاف تھا۔ جمی نے ڈور اور پتنگیں مجھے تھما دیں۔ لینڈ لیڈی کے مرحوم خاوند کا ایک بگل جو ڈرائنگ روم میں آتش دان کے اوپر ٹنگا ہوا تھا اتار کر اوور کوٹ کی جیب میں رکھا اور پھر ٹیپ ریکارڈر اٹھا کر ہم دونوں باہر آ گئے۔ باہر بارش تو نہ تھی، مگر ایک ایسی برفیلی ہوا چل رہی تھی کہ سمندر کے کنارے پہنچتے پہنچتے ہم بالکل یخ ہو چکے تھے اور ہمارے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ ہم چونکہ حسب معمول پورے وقت پر نہیں پہنچے تھے اس لئے ہماری آمد سے پیشتر مسٹر ملر تشریف لا چکے تھے اور اپنی کائٹ اڑا رہے تھے۔ جمی نے کائٹ کو دیکھا تو سخت مایوس ہوا کہنے لگا "یار اسے یہ لوگ پتنگ کہتے ہیں۔ پلاسٹک کا باوا سا ہے اور ایک لمبی ساری دم ہے۔ اور اس کی ڈور دیکھو۔ پارسل باندھنے والا دھاگہ ہے۔" جمی نے اپنی پتنگ نکالی۔ بڑے اہتمام سے اس میں تناویں ڈالیں اور اسے ہوا میں بلند کر دیا۔ اب مسٹر ملر کے حیران ہونے کی باری تھی "مائی گاڈ یو کال اٹ اے کائٹ..... دس از اے ورک آف آرٹ..."

ہوا تیز تھی اور سمندر کی نمی نے چند ہی لمحوں میں پتنگ کو پھاڑ دیا۔ جمی نے دوسری پتنگ نکالی اور اسے اڑاتے ہوئے کہنے لگا اس سے پہلے کہ یہ بھی پھٹ جائے میں مسٹر ملر سے پیچا لگانے لگا ہوں۔ تم بگل تیار رکھو اور پاکستانی گانوں کی کیسٹ بھی لگا دو، ذرا بسنت کا ماحول تو پیدا ہو"..... اس سے پیشتر کہ مسٹر ملر کو ہماری سازش کا علم ہو جمی نے اپنی پتنگ کو ان کی کائٹ کے نیچے رکھا اور ڈھیل دے دی، کائٹ

سنے کچھ دیر تو حیرت سے مقابلہ جاری رکھا لیکن کہاں لنڈن کی کائٹ اور کہاں موچی دروازے کی پتنگ...... مسٹر ملر نے بھی شور مچا دیا کہ یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو۔ اتنی دیر میں کائٹ کٹی اور سمندر میں جا گری میں نے "ہا بو کاٹا" کا نعرہ لگایا اور بگل بجانے لگا۔ جی نے بھنگڑہ ڈالنا شروع کر دیا اور مسٹر ملر کا نام لے لے کر بڑکیں لگانے لگا..... مسٹر ملر اس دوران بے حد حیرت سے ہم نیم پاگل پاکستانیوں کو شور مچاتے ہوئے دیکھتے رہے..... ہم نے اپنے تئیں پہلی مرتبہ برطانیہ عظمیٰ کی آسمانوں سے باتیں کرتی ہوئی پتنگ کاٹ دی تھی..... کم از کم اس معاملے میں موچی دروازے کو لنڈن پر فتح حاصل ہو چکی تھی۔

تارڑ صاحب سبحان اللہ

ایک عجیب و غریب کردار ہے جو میرے بازار میں سے روزانہ گزرتا ہے۔ لگتا ہے کہ اس کا خفیف سا تعلق فنون لطیفہ کے ساتھ ہے کیونکہ رنگ اس کا قدرے مشکی ہے اور چمکیلا ہے بلکہ فن موسیقی سے تعلق ہے کیونکہ بال اس کے چپڑے ہوئے ہیں اور مونچھیں "تلوار تیکھی" ہیں اور چلنے میں ایک ہلکا سا نسوانی انداز ہے اور بے حد فرمانبردار اور ڈرپوک اور "بسم اللہ......

"آہاہا" اس کا تکیہ کلام ہے۔ تعارف کچھ یوں ہوا کہ ایک روز وہ میرے ہاں آیا اور میرے بالکل سامنے کھڑے ہو کر مسکرانے لگا میں نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

وہ مسکراتا رہا۔

میں نے جھلا کر پوچھا "کیا بات ہے؟"

اس نے ہاتھ لہرا کر کہا "آہاہا"

میں نے پوچھا "آہاہا؟"

کہنے لگا "جی سبحان اللہ...... میں نے کہا تارڑ صاحب سبحان اللہ......؟"

میں نے کہا "بیٹھ جائیں"

وہ کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا "بسم اللہ"

میں نے پھر پوچھا "فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

وہ پھر کھڑا ہو گیا "جی سبحان اللہ...... تارڑ صاحب سبحان اللہ"

میں نے سوچا یہ کوئی ماڈرن فقیر ہے مجھے تنگ کرے گا چنانچہ میں تیوری چڑھا کر کہا" بھی فی الحال بے حد مصروف ہوں پھر کسی وقت تشریف لائیے گا"

وہ اسی طور مسکراتا رہا اور پھر کہنے لگا" صدقے جائیے تارڑ صاحب میں تو رات کے ڈرامے کی مبارک دے رہا تھا...... سبحان اللہ جی کیا اداکاری کی ہے آپ نے....... آہاہا"

یہ نواز علی تھا جو میرے قریب ایک تکئے میں رہتا ہے۔

اس پہلی ملاقات کے بعد جب بھی ٹیلی ویژن پر میرا کوئی ڈرامہ چلتا وہ رکتا اور خاموش کھڑا مسکراتا رہتا اور بالآخر" آہاہا..... سبحان اللہ......" میں نے کہا تارڑ صاحب سبحان اللہ"

میں بھی اس کی اس بے جا تعریف اور انداز تعریف سے لطف اندوز ہوتا اور اسے چائے کا ایک کپ پلا کر فارغ کر دیتا نواز علی بالکل فارغ ہی تھا مجھے کچھ پتہ نہیں کہ وہ کیا کرتا تھا اور اس کا حال کچھ اتنا اچھا نہیں ہوتا تھا ایک مرتبہ میں نے پوچھا کہ نواز علی تم کرتے کیا ہو تو وہ کہنے لگا" مولا کا کرم ہے تارڑ صاحب....؟

ایک سگریٹ اس کے پاس ضرور ہوتا اور ماچس مجھ سے مانگ کر وہ جلاتا اسے پیتا اور پھر چلا جاتا وہ صرف ان دنوں میں میرے پاس ٹھہرتا جب میرا کوئی ڈرامہ چلتا ورنہ سیدھا تکئے کی طرف چلا جاتا۔

ایک روز وہ میرے ہاں آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک ڈبہ تھا جو اس نے میرے سامنے رکھا اس میں سے ایک لڈو نکالا اور میرے منہ کی طرف بڑھایا۔

میں نے پوچھا" نواز یہ کاہے کی مٹھائی ہے بھئی؟"

نواز مسکرایا اور کہنے لگا" آہاہا تارڑ صاحب...... واہ واہ..... میں نے کہا سبحان اللہ"

پچھلی شب میرا ایک ڈرامہ ٹیلی کاسٹ ہوا تھا جس میں میں نے نہایت بے ہودہ قسم کی اداکاری کی تھی اور اب نواز اس کے حوالے سے" آہاہا کر رہا تھا بہرحال میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ یہ لڈو کس سلسلہ میں کھلایا جا رہا ہے۔

" لو جی آپ کمال کر دیا ایکٹنگ میں تو نواز علی منہ نہ میٹھا کرائے آپ کا..... آپ تو جی استاد ہو گئے ہو لو کھاؤ لڈو....... بسم اللہ"

میں نے لڈو کھا لیا۔

وہ باہر جانے لگا تو مٹھائی کا ڈبہ میز پر چھوڑ گیا میں نے واپس بلایا اور ڈبہ لے جانے کو کہا۔

" نہ جی تارڑ صاحب...... آہاہا یہ تو آپ کے لئے ہے آپ استاد ہو جی.... نہ جی نہ مجھے مجبور نہ کرو..... میری خوشی ہے...... اللہ خوش رکھے سا..... سلاما علیکم" اور وہ چلا گیا۔

ٹیلی ویژن اور ادب کے حوالے سے تحفے تحائف وصول کرنا میرے لئے ہمیشہ ایک چھوٹا سا عذاب رہا ہے۔ کچھ لوگ صدق دل سے اپنی پسندیدگی کے اظہار کے طور پر آپ کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور مجھے ایک بال پوائنٹ کا تحفہ وصول کرتے ہوئے بھی یوں لگتا ہے جیسے میں کوئی مداری ہوں جس کے تماشے سے متاثر ہو کر لوگ اسے پیسے دے رہے ہیں یہ ابھی پچھلے برس کی بات ہے کہ ایک بالکل اجنبی صاحب میرے ہاں آئے سانس پھولا ہوا اور قدرے شرمندہ میرا ہاتھ پکڑا اور اس میں کچھ نوٹ تھما کر بولے بس جی ہم تو آپ کے چاہنے والے ہیں بس یہی خدمت کر سکتے ہیں۔

میں نے وہ نوٹ جس طرح واپس کئے وہ میں جانتا ہوں کیونکہ ایک تو وہ صاحب مانتے نہیں تھے اور دوسرے نوٹ بھی کافی تھے بہرحال نواز علی مجھے

مٹھائی کا ڈبہ دے گیا۔

دو تین ہفتوں کے بعد وہ پھر آیا اور کہنے لگا "سبحان اللہ۔۔۔ آہا ہا تارڑ صاحب"
میں نے کہا "نواز ان دنوں تو میں ٹیلی ویژن کے گیٹ کے اندر بھی نہیں گیا تم کس سلسلہ میں آہا ہا کر رہے ہو؟"

کہنے لگا بس آج ویسے ہی میرا جی چاہا کہ تارڑ صاحب کو مٹھائی کھلاؤں اس نے قلاقند کا ایک ٹکڑا نکالا اور "بسم اللہ"

اس مرتبہ وہ ایک کی بجائے دو ڈبے مٹھائی چھوڑ گیا میں اس صورت حال سے بے حد پریشان تھا اور شرمندہ بھی تھا کہ یہ غریب آدمی ہے پتہ نہیں کس طرح پیٹ کاٹ کر میرے لئے مٹھائی خریدتا ہو گا۔

اگلی مرتبہ نواز آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک سنہری ہار بھی تھا جو اس نے آتے ہی میرے گلے میں زبردستی ڈالا اور سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا آہا ہا اور پھر حسب سابق مٹھائی کے ڈبے میں سے ایک لڈو نکال کر میرے منہ کی طرف بڑھا دیا "بسم اللہ"

میں نے ہار اتار کر میز پر رکھا اور نواز علی کو گھورا "دیکھو بہت ہو چکی۔۔۔۔ یہ تم خواہ مخواہ مٹھائی کس لئے لے آتے ہو ہر دوسرے دن اور یہ ہار وغیرہ پہنانے کا کیا تک ہے۔۔۔ مجھے ایسی حرکتیں بالکل پسند نہیں۔۔۔۔ سمجھے تم؟"

نواز علی یکدم بجھ گیا اور اس کا منہ لٹک گیا "سرکار۔۔۔۔ میں تو خادم ہوں۔۔۔۔ بس جی میری خوشی ہوتی ہے آپ دل کو اچھے لگتے ہو مجھ سے اچھا بولتے ہو تو چلا آتا ہوں۔۔۔۔ میرا دل نہ توڑا کریں" وہ سر جھکائے باہر چلا گیا لیکن ڈبہ وہیں چھوڑ گیا۔

تقریباً دو ہفتے بعد وہ پھر میرے سامنے کھڑا تھا ہاتھ میں لڈو اور "آہا ہا۔۔ بسم اللہ"

میں اس شخص کا کیا کرتا چنانچہ میں نے ہتھیار ڈال دیئے اور مٹھائی کا ڈبہ پہلی مرتبہ گھر لے گیا میں نے بیگم کو تفصیل بتائی تو کہنے لگی بچے اور میں تو ہرگز یہ مٹھائی نہیں کھائیں گے پتہ نہیں کس قسم کی ہے تم بے شک کھا لینا یا جمعدارنی کو دے دیں گے۔۔۔۔۔ لیکن" اس نے ڈبے کو غور سے دیکھا "یہ پتوکی کی مٹھائی لاہور میں کیسے"

وہ درست کہتی تھی ڈبے پر مون سویٹ ہاؤس پتوکی چھپا ہوا تھا اگلی مرتبہ جو مٹھائی آئی اس پر گجرات کی کسی دکان کا پتہ تھا۔۔۔۔۔ ساہیوال، ٹوبہ ٹیک سنگھ گوجرہ، کامونکی اور کالا شاہ کاکو کے حلوائیوں کی مٹھائیاں کھانے کے بعد میں نے ایک روز نواز سے پوچھ ہی لیا کہ ان ڈبوں پر مختلف شہروں اور قصبوں کے نام کس سلسلہ میں ہوتے ہیں نواز کچھ نروس ہوا اور پھر کہنے لگا "بسم اللہ تارڑ صاحب میرے یار دیلی ہیں ان علاقوں میں ان سے منگواتا ہوں آپ کے لئے" اس جواب سے میری تسلی تو نہ ہوئی لیکن میں چپ ہو گیا۔

ایک روز ایک بڑا سارا ڈبہ تھا اور اس پر ابھی گدڑی کا غذ لپٹا ہوا تھا میں اسے گھر لایا اور کھولا تو اندر ایک چٹ تھی۔۔۔۔۔۔

"پیارے یار علی احمد کے لئے مہر خدا بخش کی طرف سے" اگلے روز میں نے نواز علی کا انتظار کیا اور جونہی وہ بازار میں سے گزرا میں نے آواز دے کر اسے بلا لیا "یہ علی احمد کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بسم اللہ تارڑ صاحب کونسا علی احمد؟"

"اور مہر خدا بخش تمہارا واقف ہے؟"

"کیا کہتے ہو مہربان۔۔۔۔۔ کس کی بات کرتے ہو؟"

میں نے جیب میں سے چٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دی "یہ کل والے ڈبے میں تھی۔۔۔۔۔ شاہ کوٹ والی مٹھائی کے ڈبے میں"

نواز علی نے آنکھیں جھپکیں اور پریشان ہو کر بولا "بسم اللہ تارڑ صاحب"

میں نے کہا "بسم اللہ بعد میں پہلے یہ بتاؤ کہ یہ چکر کیا ہے ؟"

اس نے ہاتھ جوڑ دیئے کوئی چکر نہیں مائی باپ"......

"چکر تو ہے نواز علی..... جو ڈبہ آتا ہے کسی مختلف شہر کا ہوتا ہے......

سچ سچ بتا دو ورنہ آئندہ میں تم سے بات نہیں کروں گا"

"بسم اللہ جی..... بس جی...... آپ یوں سمجھ لیں کے یہ دوبئی کی کمائی ہے تارڑ صاحب"

"تم دوبئی گئے تھے"

"نہیں جی...... وہ دراصل آپ ناراض تو نہیں ہوں گے ؟"

"ناراض میں تب ہوں گا اگر تم بتاؤ گے نہیں"

"یہ جی کاروبار تو تھا شیدے بلاکی کا...... اس نے مجھے بھی ساتھ ملا لیا میں بے کار تھا اس لئے شامل ہو گیا...... پہلے تو جی پتہ کرتے ہیں کہ دوبئی اور لندن کی فلیٹ کس دن ہے اور کس وقت ہے اس دن وہاں ایئر پورٹ پہ پہنچ جاتے ہیں وہاں کسی ایک آسامی کو تاڑ لیتے ہیں جی...... دیکھیں ناں اب ایک بندہ گجرات سے دوبئی جا رہا ہے تو لاہور ایئر پورٹ پر اس کو کم سے کم بیس پچیس رشتے دار یار دوست تو چھوڑنے آئیں گے...... تو ہم بھی ان میں شامل ہو جاتے تھے اور ہر ایک کو "سلام بھائی جان...... ماسی جی سلام اے...... سلام چاچا" کہہ کر سب کو یقین دلا دیتے کہ ہم بھی ان میں سے کوئی ہیں دوبئی جانے والا تو اس وقت پریشان ہوتا ہے اسے کون پوچھتا ہے کہ یہ کون ہیں جو تمہیں چھوڑنے آئے ہیں...... اچھا تو جناب جتنے یار دوست یا رشتے دار آتے ہیں وہ سب کے سب یا تو ہار لے کر آتے ہیں یا مٹھائی کے ڈبے...... جس وقت سامان

کا وزن ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ زیادہ نکلتا ہے چنانچہ مٹھائی کا ایک آدھ ڈبہ رکھ کر باقی ڈبے وہ واپس کر دیتے ہیں...... اس وقت ہم آگے بڑھتے ہیں اور وہ ڈبے جو لوگوں کو تنگ کر رہے ہوتے ہیں کہ انہیں کہاں رکھیں اور کیسے اٹھائے پھریں ان کے ہاتھوں سے لے لیتے ہیں کہ...... اسے میں اٹھا لیتا ہوں ماسی...... بھائی جان اسے میں رکھ آتا ہوں...... اس طرح پندرہ بیس ڈبے جمع ہو جاتے ہیں اور بعد میں کوئی بھی نہیں مانگتا...... بس جی تارڑ صاحب اگلے دن ہم اس مٹھائی کو چھابڑی میں رکھ کر بیچ دیتے ہیں بس اتنی سی بات ہے چونکہ لاہور ایئر پورٹ پر آنے والے مسافر مختلف قصبوں اور شہروں سے آتے ہیں اس لئے مٹھائی بھی وہیں کی ہوگی....."

"اور وہ ڈبے جو مجھے دیئے جاتے تھے"

"مائی باپ" نواز نے ہاتھ جوڑ دیئے" جو بچ جاتی تھی بکتی نہیں تھی وہ پیک کر کے آپ کو دے جاتا تھا...... پر جی ہوتی تازہ تھی...... میری خوشی تھی...... اور وہ ہار جو آپ کے گلے میں ڈالا تھا وہ بھی دوبئی کا مال تھا......

واہ واہ تارڑ صاحب...... آہا ہا...... میں نے کہا سبحان...... اللہ...... آہا ہا"

میں ایک میاؤں ہوں

السلام علیکم ...... جناب میں روزنامہ 'مشرق' کی جانب سے آپ کو عید مبارک کہتا ہوں۔ ہم نے اپنے اخبار میں "خوش و خرم خاندان" کے عنوان کے تحت ایسے خاوندوں کے انٹرویو شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو ہمیشہ خوش رہتے ہیں اور ان کے اہل خاندان ان سے بے حد مطمئن ہیں چنانچہ پہلا انٹرویو آپ کا ہوگا...... آپ یہ فرمائیے کہ آج عید کا دن ہے لیکن آپ کو آپ ہی کے گھر کے ایک چھوٹے کمرے میں بند کردیا گیا ہے اور آپ اس وقت صرف ایک لنگوٹ میں ملبوس ہیں ایسا کیوں ہے؟"

"معاف کیجئے گا یہ لنگوٹ نہیں بلکہ لنگوٹی ہے...... ایک تو صحافی حضرات کی گرامر درست نہیں اور دوسرے یہ کہ اگر عید کے روز بھی ایک کمرے میں بند ہوں تو آپ کو کیا تکلیف ہے؟"

"جی مجھے تو کوئی تکلیف نہیں لیکن ہمارے قارئین یقیناً اس کی وجوہات جاننا چاہیں گے......؟"

"میں ایک میاؤں ہوں......؟"

"جی کیا فرمایا آپ نے؟"

"میں ایک میاؤں ہوں' میاؤں میاؤں"

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں آپ تو اچھے بھلے انسان ہیں بلّی وغیرہ تو نہیں ہیں۔"

اچھا اچھا...... آپ بھی مجھے بلی سمجھتے ہیں، بھائی میں بلی تو نہیں ہوں میں تو ایک میاؤں ہوں"

"جی جی بالکل...... اچھا آپ یہ فرمائیں کہ آپ میاؤں کیسے بن گئے؟"

"کیسے بن گئے! بھئی جس طرح سب لوگ شادی کرتے ہیں اور میاؤں ویسے ہم بھی بن گئے...... بات سنیئے۔ ادھر کان میں...... کیا آپ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ میں بلی ہوں؟"

"بالکل نہیں، بالکل نہیں"

"لیکن میرے گھر والے یہی سمجھتے ہیں......"

"کب سے سمجھتے ہیں؟"

"آج صبح سے...... تبھی تو انہوں نے مجھے کمرے میں بند کردیا۔"

"ذرا تفصیل سے بتائیے کہ یہ سب کچھ ہوا کیسے؟"

"دیکھئے بھائی رپورٹر صاحب میں درمیانے درجے کا ایک درمیانہ سا ملازم ہوں اور اللہ کے فضل سے شکر کرتا ہوں اور صبر کرتا ہوں اور جو مل جاتا ہے اس پر سجدہ کرتا ہوں ہوا یہ کہ جب عید قریب آئی تو بچوں نے کہا کہ ہمیں نئے کپڑے اور نئے جوتے درکار ہیں......"

"وہ تو بچے کہتے ہی ہیں......"

"درمیان میں کیوں بولتے ہیں اچھے صحافی ہیں...... اب مت ٹوکئے گا...... چنانچہ جناب میں نے کچھ رقم کا بندوبست کیا اور انہیں بازار لے گیا۔ اور وہاں میرے بچے کچھ زیادہ بھی نہیں بس یوں سمجھ لیجئے کہ آخری گنتی کے وقت درجن سے ایک دو کم ہی تھے...... سب سے پہلے ہم جوتوں کی دکان میں گئے۔ وہاں سب بچوں نے جوتے پسند کئے جو پڑنے تھے میرا مطلب ہے پہننے تھے جب ان

کا بل بنا تو معلوم ہوا کہ پونے دو ہزار روپے کے ہیں۔۔۔۔۔“

”پونے دو ہزار کے جوتے؟

”جی۔۔۔۔۔ پھر آپ کہتے ہیں کہ میں میاؤں کیسے ہوگیا۔۔۔۔۔ بالکل جوتے۔۔۔۔۔ اور میں ایک ہزار روپیہ رکھ گیا تھا کپڑوں۔۔۔۔۔ جوتوں۔۔۔۔۔ چوڑیوں اور کھانے پینے وغیرہ کے لئے بہر حال ادھر ادھر سے مانگ تانگ کر یہ بل پورا کیا اور جوتے گھر لے آئے۔۔۔۔۔ نئے کپڑوں کی چھٹی کرادی گئی۔۔۔۔۔ اب جناب آج نماز عید کے بعد لوگ آنے شروع ہو گئے صفائی کرنے والی، دودھ والا، چوکیدار، سامنے پارک کا مالی، ڈاکیہ، عید مبارک صاحب عید مبارک صاحب۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کون کون لوگ تھے سب کو دس دس پانچ پانچ تھمانے پڑے اور ہماری جیب خالی ہوگئی، آخر میں چوکیدار آیا تو جیب چونکہ خالی ہو چکی تھی اس لئے میری بیوی نے کہا کہ چوکیدار بہت کام کا آدمی ہے اسے خالی ہاتھ نہیں بھیجا جانے اس لئے اسے یہ والا کرتہ شلوار دے دیتے ہیں جو تم نے پہن رکھا ہے ابھی استری تو خراب نہیں ہوئی چنانچہ میں نے اپنا وہ سوٹ اتار کر چوکیدار کو پیش کر دیا۔۔۔۔۔ میں اس دوران بالکل نہیں بولا مسکراتا رہا۔۔۔۔۔ لیکن جب میرا کرتہ شلوار اتروا یا گیا تو میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ کچھ تو میرا خیال کرو میں ایک میاؤں ہوں۔۔۔۔۔ تمہارا میاؤں ہوں۔۔۔۔۔“

”قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں آپ نے اپنی بیوی سے کہا ہوگا کہ میں ایک میاں ہوں یعنی خاوند ہوں“

”جی بالکل میں نے یہی کہا کہ میں ایک میاؤں ہوں“

”میاؤں ہوں یا میاں ہوں؟

”یہی دوسرے والا جس کا مطلب خاوند ہوتا ہے۔۔۔۔۔ بس یہی کہا کہ بیوی بیگم تم کچھ تو میرا خیال کرو، آج میں اس لنگوٹی میں ملبوس ہوں اور عید کا دن ہے۔۔۔۔۔

تمہارا باپ ہوں اور تمہارا میاؤں ہوں۔۔۔۔۔ بس جی یہ کہنا تھا کہ میری بیوی نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا کہ میرے سرتاج کو کیا ہو گیا ہے آپ بلیوں کی طرح میاؤں میاؤں کیوں کرنے لگے ہیں مجھے سخت تاؤ آیا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ تم میری بیگم ہو اور میں تمہارا میاؤں ہوں۔۔۔۔۔ لیکن وہ بھلی لوگ اور زور زور سے رونے لگی اسے دیکھ کر بچے بھی رونے لگے۔ تب مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے کہا کہ کون کہتا ہے کہ میں میاؤں نہیں ہوں میں تمہارا میاؤں ہوں۔ ایک عرصے سے میاؤں ہوں اور ہمیشہ میاؤں رہوں گا۔۔۔۔۔ میاؤں، میاؤں، میاؤں۔۔۔۔۔ پھر پتہ نہیں انہیں کیا ہوا ان سب نے مجھے پکڑ کر اس کمرے میں بند کر دیا اس لنگوٹی سمیت۔۔۔۔۔“

”اچھا اچھا۔۔۔۔۔ بالکل۔۔۔۔۔ اخراجات کی وجہ سے انسان کچھ میڈ تو ہو ہی جاتا ہے۔۔۔۔۔“

”آپ ہوں گے میڈ میں تو میاؤں ہوں۔۔۔۔۔“

”اچھا جناب انٹرویو کا بہت بہت شکریہ اب اجازت دیجئے“

”بات سنئے“

”جی فرمائیے“

”ذرا اور قریب آ جائیے“

”جی“

”آپ کا کیا خیال ہے کہ میں سچ مچ میاؤں ہو گیا ہوں؟۔۔۔۔۔ ابھی نہیں صاحب میں ایک میاں ہوں اور میاؤں نہیں ہوں“

”تو پھر آپ۔۔۔۔۔؟

”دیکھیں ناں بھائی ابھی تو عید کی صبح ہے۔۔۔۔۔ ابھی میری ہمشیرگان آئیں گی

اپنے درجنوں بچوں کے ساتھ پھر بھائی آئیں گے ان کے بعد بیگم کے رشتے دار شروع ہو جائیں گے اور آپ ستارے شمار کر سکتے ہیں لیکن انہیں اور ان کے بچوں کو نہیں گن سکتے...... اور ان تمام بچہ لوگ کو اگر پانچ پانچ روپے عیدی بھی دوں تو سارے سال کی تنخواہ لگ جائے گی چنانچہ صرف آج کے دن کے لئے میں ایک میاؤں میاؤں ہوں...... لوگ آئیں گے اور میری بیوی کو آبدیدہ دیکھ کر پوچھیں گے کہ کیا ہوا اور وہ کہے گی کہ میرے خاوند بلی ہو گئے...... اور وہ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے چلے جائیں گے اور میں عیدیوں کی رقم بچا لوں گا...... یہ ہے عیدیاں بچانے کا صحیح طریقہ...... میری طرف سے آپ کو بھی میاؤں عید مبارک...... میاؤں میاؤں۔

ہور سناؤ کی حال چال اے ؟

"اچھا تو پھر خدا حافظ!"

"بھئی ٹھہرو تو سہی اتنی جلدی بھی کیا ہے...... کوئی بات رہ تو نہیں گئی؟"

"نہیں...... پچھلے آدھ گھنٹے سے ہم لوگ فون پر گفتگو کر رہے ہیں، تمام باتیں تو ہو چکیں"

"لیکن پھر بھی یار...... کیا حال ہے؟"

"بتایا تو ہے ٹھیک ہے...... اچھا تو پھر......"

"اوہو تمہیں جلدی کس بات کی ہے...... باقی سب خیریت ہے ناں؟"

"ہاں بتا تو چکا ہوں کہ خیریت ہے......"

"اور اس کے علاوہ بھی خیریت ہے...... اچھا تو پھر خدا حافظ......"

"اوہو اب یاد آیا کہ ایک بات تو پوچھنا ہی بھول گیا!"

"وہ کیا بات ہے"

"ہور سناؤ کی حال چال اے......"

یہ آخری فقرہ ہم پاکستانیوں کا تکیہ کلام ہے اور یہ عموماً اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب ہم دنیا جہان کی باتیں کر چکے ہوتے ہیں۔ اور کہنے کو کچھ باقی نہیں رہتا تب پوچھا جاتا ہے کہ ہور سناؤ کی حال چال اے......

شنید ہے کہ ایک سابق صدر سے ملنے کے لئے جب ایک غیر ملکی سربراہ مملکت

تشریف لائے، تو مترجم کے توسط سے جو گفتگو ہوئی وہ کچھ یوں تھی۔

سابق صدر کہتے ہیں" ان سے پوچھو ان کی طبیعت کیسی ہے؟

غیر ملکی سربراہ اپنی زبان میں جواب دیتا ہے اور مترجم اس کا ترجمہ کر کے کہتا ہے کہ جناب فرماتے ہیں کہ میں بالکل ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔

"اچھا ان سے پوچھو ان کے بال بچے کیسے ہیں؟

اس کا جواب بھی آ گیا۔

"اچھا ان سے پوچھو کر ان کا کیا حال چال ہے؟

بتایا گیا کہ غیر ملکی سربراہ کہتے ہیں کہ حال چال ٹھیک ہے"۔

"اچھا۔۔۔۔ تو ان سے پوچھو کہ طبیعت تو ٹھیک ہے؟

مترجم نے بصد ادب کہا کہ جناب یہ پوچھا جا چکا ہے۔ اس پر کہا گیا کہ اچھا ان سے پوچھو کہ بال بچے راضی ہیں؟۔۔۔۔۔ مترجم نے پھر کہا کہ جناب یہ بھی پوچھ چکے ہیں اس پر سابق صدر نے کہا کہ اچھا تو پھر اس سے یہ پوچھا کہ ہور کی حال چال اے۔۔۔۔۔؟

میرے ایک دوست مشتاق بٹ ایک طویل عرصہ سے امریکہ میں مقیم ہیں اور بال بچوں کے ہمراہ مقیم ہیں ہر دو سال بعد وطن کا چکر ضرور لگاتے ہیں، اور ایئر پورٹ پر اترتے ہی پہلا سوال یہ کرتے ہیں کہ ہور سناؤ کی حال چال اے؟۔۔۔۔۔ چونکہ بہت عزیز دوست ہیں اس لئے سب لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں گھمایا پھرایا جائے ان کی خاطر تواضع کی جائے۔ مگر بٹ صاحب سفر کی تھکن اتارنے کے بعد سب سے پہلی فرمائش یہ کرتے ہیں کہ بھائیو مجھ سے باتیں کرو۔۔۔۔۔ میں ترس گیا ہوں باتیں کرنے کے لئے۔۔۔۔۔۔ صرف باتیں؟ ہم شروع شروع میں بے حد حیران ہوئے کہ مشتاق کو کیا ہو گیا ہے شاید اپنی امریکی معلومات عامہ کا

رعب جمانے کے لئے ہم سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ نہیں مشتاق صرف ایسی باتیں کرنا چاہتا ہے جن کا کوئی مطلب نہ ہو۔ کوئی سر پیر نہ ہو جیسی باتیں برائے باتیں۔۔۔۔۔۔ ہمیشہ کہتا ہے کہ یار و امریکہ میں کسی کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ وہ تم سے باتیں کر سکے اپنے بیٹے کے ساتھ گپ لگانے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ کہتا ہے، ڈیڈی آپ میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ بیٹی کہتی ہے ڈیڈی آپ ذرا اپنا میڈیکل چیک اپ کروائیے۔ مینٹل چیک اپ اس لئے نہیں کہتی کہ ابھی پوری طرح امریکی نہیں ہوئی۔۔۔۔۔۔ اور یار میں ان تئیس برسوں کا کیا کروں جو میں نے اپنے وطن میں گپیں لگاتے گزارے ہیں۔ میں باتیں نہیں کر سکتا تو میرا پیٹ اپھر جاتا ہے اور اسی اپھرا کو درست کرنے کے لئے میں ہر دوسرے برس پاکستان آ جاتا ہوں چنانچہ مجھ سے باتیں کرو۔ اور جب باتیں ختم ہو جاتیں تو مشتاق بٹ کے پاس ایک اور ٹرمپ کارڈ ہوتا تھا اور وہ مسکراتا ہوا کہتا تھا۔ ہور سناؤ کی حال چال اے؟ جب اس کے ساتھ باتیں کرتے کرتے تمام دوستوں کے حلق سوکھ جاتے تو وہ میری دکان پر آ جاتا اور وہاں سڑک پر کھڑے خوانچہ فروشوں اور ریڑھیوں والوں کے ساتھ گفتگو کا آغاز کر دیتا۔۔۔۔۔ واپسی پر ہمیشہ بے حد خوش و خرم ہوتا اور اپنے وسیع پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہتا۔ بس پاکستان آنے کا مقصد پورا ہو گیا ہے اب میں آئندہ دو سال کے لئے بالکل تندرست رہوں گا۔۔۔۔۔۔"

"ہور سناؤ کی حال چال اے؟" صرف گفتگو کو طول دینے کے لئے یا گپ بازی کے لئے استعمال نہیں ہوتا بلکہ یہ فقرہ کئی سنجیدہ محفلوں میں بھی سننے میں آتا ہے مثلاً ہمارے ایک دوست کے والد کا انتقال ہو گیا۔ بیشتر دوست دوسرے کے روز تعزیت کرنے کے لئے پہنچے، ہم سر جھکائے ہوئے بیٹھے تھے کہ ایک صاحب

تشریف لائے۔ تعزیت کی، وجہ مرگ دریافت کی دنیا کی بے ثباتی پر چند فقرے کہے اور پھر نیم دراز ہو کر پوچھا اچھا تو پھر باقی سب خیریت ہے ناں؟..... ہور سناؤ کی حال چال اے؟

ہمارے گاؤں کی ایک بزرگ خاتون ہیں۔ خاوند فوت ہو چکے ہیں۔ دو بیٹے انگلستان میں رہائش پذیر ہیں خود ایک پکے مکان میں تن تنہا رہتی تھیں پھر بیٹوں نے منت سماجت کی کہ اماں زندگی کا کچھ پتہ نہیں ہوتا یہاں ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ ہم دونوں کی خواہش ہے کہ تم اب یہیں ہمارے پاس آجاؤ ...... بڑی اماں نے مکان کو تالا لگایا اور چادر اوڑھ کر ولایت چلی گئیں..... چار ماہ قیام کیا اور پھر واپس آگئیں...... کہنے لگیں وہاں ماشاءاللہ میرے بیٹے ہیں پوتے پوتیاں ہیں کاریں اور فریج ہیں سب کچھ ہے پر مجھ سے باتیں کرنے والا کوئی نہیں بیٹے اپنے سٹور میں مصروف رہتے ہیں بچے اپنے سکول کالجوں کو چلے جاتے ہیں اور بہورانیاں گھر کے کام کاج میں مگن ہو جاتی ہیں۔ مجھے کہتے تھے کہ اماں جی جا کر سیر کر آؤ پارک میں..... میں پارک میں بیٹھی رہتی تھی چھٹی کے دن سارے آرام کرتے تھے...... پتر تین مہینوں میں تو میری زبان کو تالی لگ گئی۔ میں نے سوچا دفع کرو ولایت کو بھلا آخری عمر میں بھی انسان منہ بند کر کے فوت ہو جائے تو اس انگلستان کا کیا فائدہ...... اس وقت بڑی اماں کے پاس محلے کی کوئی درجن بھر عورتیں جمع تھیں جنہیں وہ لہک لہک کر ولایت کے قصے سنا رہی تھیں جب کبھی سانس لینے کے لئے رکتیں تو کسی نووارد خاتون کو "ہور سناؤ کی حال چال اے سکینہ؟" کہہ کر پھر شروع ہو جاتیں وہ بے حد خوش تھیں اور بے حد صحت مند تھیں۔

کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آپ کسی وجہ سے بے حد پریشان ہیں یا کسی ضروری کام کے لئے جا رہے ہیں تو کوئی صاحب آپ کو پہچان لیتے ہیں اور قریب

آ کر کہتے ہیں "السلام وعلیکم" ظاہر ہے آپ رک کر وعلیکم السلام کہتے ہیں اور ہاتھ ملاتے ہیں اس پر وہ ہاتھ تھامے ہوئے پوچھتے ہیں کہ کیا حال چال ہے آپ بتاتے ہیں کہ الحمدللہ بالکل ٹھیک ہوں وہ تھوڑی دیر چپ رہتے ہیں جس کے دوران آپ خوشگوار ہونے کے لئے زبردستی مسکراتے رہتے ہیں اور پھر وہ کہتے ہیں ہور سناؤ کی حال چال اے؟..... آپ پھر کہتے ہیں کہ بس جی دعا ہے آپ کی۔ وہ بدستور ہاتھ تھامے رہتے ہیں اور ایک طویل وقفے کے بعد کہتے ہیں اچھا پھر ہور کی حال چال اے؟...... آپ ہاتھ چھڑاتے ہیں اور غصے سے ابلتے ہوئے چلے جاتے ہیں پیچھے سے آواز آتی ہے "یہ لوگ بڑے بد دماغ ہوتے ہیں تمیز سے بات بھی نہیں کرتے"

جس طرح ایک سکھ نے جب بزبان انگریزی چند گالیاں دی تھیں اور پھر تسلی نہ ہونے پر "فردر مور" کہہ کر خالص پنجابی میں اپنے دل کی بھڑاس نکالی تھی اس طرح ہمارے ہاں جب دنیا جہان کی باتیں ختم ہو جاتی ہیں اور پھر بھی تسلی نہیں ہوتی تو پھر ہور سناؤ ہور کی حال چال اے استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس فقرے کا ایک مختلف استعمال پچھلے دنوں عید شاپنگ کے دوران مجھ پر کیا گیا بچوں کے ہمراہ ایک سٹور میں داخل ہوا تاکہ ان کے لئے نئے کپڑے اور بوٹ وغیرہ خریدے جا سکیں۔ مجھے دیکھ کر ایک سیلزمین آگے آیا اور کہنے لگا۔ فرمایئے تارڑ صاحب کیا خدمت کر سکتا ہوں...... چونکہ بجٹ مختصر تھا اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے اشیاء کی قیمتوں کا اندازہ لگا لیا جائے...... بچے کی ایک ٹی شرٹ کی قیمت پوچھی تو جواب ملا پونے دو سو روپے صرف...... بوٹ بھی دو سو روپے کے تھے۔ غرض کہ کوئی ایسی چیز نہ تھی جو سو روپے سے کم ہو سوائے جرابوں یا بنیانوں کے...... چونکہ یہ سٹور میرے پرائس رینج سے باہر تھا۔ اس لئے میں باہر آنے لگا تو سیلزمین نے مسکراتے ہوئے پوچھا "ہور سناؤ کی حال چال اے......؟ یعنی لگ پتہ گیا ہے ناں... میرا خیال

ہے کہ ان دنوں تمام اشیاء پر ان کی قیمتیں درج کرنے کے علاوہ یہ فقرہ بھی لکھ دینا چاہیے یعنی بچے کی پتلون دو سو روپے۔ ہور سناؤ کی حال چال اے؟..... ایک عید کارڈ، بیس روپے' ہور سناؤ...... بچی کا فراک سوا دو سو روپے' ہور سناؤ... مردانہ سوٹ ساڑھے تین سو روپے' ہور سناؤ...... وغیرہ وغیرہ

دراصل آج صبح سے میں اپنے کالم کے لئے کسی نئے موضوع کی تلاش میں تھا کیونکہ یار لوگ میرے کتوں بلیوں، گھوڑوں، طوطوں، موٹر سائیکل لاہور کی سڑکوں اور مہنگائی وغیرہ کے کالموں سے بے حد بیزار ہو چکے تھے لیکن نیا موضوع مل نہیں رہا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ سب کچھ کہنے کے بعد قارئین سے پوچھ لیا جائے کہ ہور سناؤ کی حال چال اے؟......

ماسٹر اور ٹیچر میں فرق ہوتا ہے

"میرا بیٹا نیا نیا سکول میں داخل ہوا تو میں نے اس سے پوچھا" بیٹا آپ کے ماسٹروں کے کیا نام ہیں؟"

وہ کہنے لگا" کونسے ماسٹر ابو؟

میں نے کہا" بیٹے وہی ماسٹر جو آپ کے سکول میں ہوتے ہیں"

"نہیں ابو ہمارے سکول میں تو کوئی ماسٹر نہیں ہوتے" وہ بولا

ہائیں! غضب خدا کا سکول میں ماسٹر نہیں ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

"کہہ جو رہا ہوں کہ ہمارے سکول میں ماسٹر نہیں ہیں"

"ماسٹر نہیں ہیں تو پھر تمہیں پڑھاتا کون ہے؟

"ہمیں ٹیچر پڑھاتے ہیں"

"اچھا...... بہت خوب..... بہر حال آپ کے سکول میں ہیڈ ماسٹر ہوگا"

"وہ بھی نہیں ہے...... ہمارے پرنسپل ہیں"

یہاں پہنچ کر میں خاموش ہو گیا کیونکہ میرے زمانے میں تو ماسٹر ہوا کرتے تھے اور میرے بیٹے کے زمانے میں ٹیچر اور پرنسپل تھے چنانچہ گفتگو آگے کس طرح بڑھتی۔

تھوڑی دیر کے بعد میرا بیٹا کہنے لگا" ابو آپ کے زمانے میں تو ماسٹر ہوا کرتے تھے ناں تو ماسٹر اور ٹیچر میں کیا فرق ہوتا ہے؟

میں نے کہا" بھئی ماسٹر اور ٹیچر میں بہت فرق ہوتا ہے ماسٹر ہوتا ہے شلوار قمیض پہنے اوپر سے بند گلے کی واسکٹ، سائیکل تھامے، ہینڈل پر تھیلا لٹکائے اور اس تھیلے میں اکثر اوقات حسب پسند ایک عدد چھڑی..... اور بہت غریب غربا

قسم کی مخلوق، خواہ مخواہ بچوں کو پڑھاتا رہتا ہے ٹیوشن نہیں پڑھاتا، خواہ مخواہ پڑھاتا ہے اور صرف اس لئے کہ اس کا رزلٹ اچھا آئے اور سینہ تان کر سکول میں چل سکے ...... اب ٹیچر کے بارے میں تو تم ہی بتا سکتے ہو کہ ٹیچر کیا ہوتا ہے؟

"ابو ہمارا ٹیچر تو سوٹ پہنتا ہے اور اس کے پاس مائیکل جیکسن کی ڈھیر ساری کیسٹیں ہیں۔"

"بس یہی فرق ہے ماسٹر اور ٹیچر میں"

یہ گفتگو مجھے یاد آئی کہ کل شام ہمارے سکول میں پڑھنے والے اولڈ بوائیز کا ایک اجلاس تھا جس میں بے شمار بوڑھے، گنجے، دبلے پتلے، موٹے، امیر غریب، لائق اور نالائق "بوائیز" جمع تھے پہلے تو حسب معمول کلاس میں کی گئی شرارتوں کے تذکرے ہوئے گفتہ اور ناگفتہ کا بیان ہوا ایک دوسرے پر خوشی کیچڑ اچھالا گیا اور پھر گفتگو کا رُخ "ماسٹروں" کی جانب مڑ گیا ہر ایک نے حسب توفیق اپنے ماسٹروں کی توصیف کی کہ کس طرح وہ مشقت سے بغیر لالچ کے ہمیں پڑھایا کرتے تھے اور آج ہم جو کچھ بھی ہیں ان کی "پڑھائیوں" کے بدولت ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر دے گا ہم کیا دے سکتے ہیں سوائے دعاؤں کے...... تب میرے ذہن میں وہ تمام ماسٹر آئے جنہوں نے مجھے پڑھایا یا بلکہ یوں کہیے کہ پڑھانے کی کوشش کی اور اگر ہم آج تک نالائق چلے آ رہے ہیں تو اس میں ان کا قصور نہ تھا میرا خیال ہے بارے ماسٹروں کے کچھ بیاں ہو جائے۔

سب سے دہشت ناک یاد ماسٹر دین محمد کی ہے ہم چھٹی جماعت میں تھے پہلے روز فارسی پڑھانے کے لئے ماسٹر دین محمد تشریف لائے کسرتی اور گٹھا ہوا جسم، حجامت فوجیوں ایسی بڑے مزے سے پہلا سبق پڑھا، گپ شپ لگائی اور

چلے گئے۔ دوسرے روز بھی آئے اور مسکراہٹیں بکھیرتے پڑھاتے رہے۔ چنانچہ وہ ہمارے پسندیدہ ماسٹر ہو گئے نہ ہاتھ میں چھڑی نہ چہرے پر خشونت اور نہ کسی کو کچھ کہنا اور نہ ہی سننا...... ہماری سمجھ میں یہ نہ آیا کہ سکول کے پہلے دن سینئر لڑکوں نے یہ کیوں کہا تھا کہ ماسٹر دین محمد سے بچ کے رہنا قصائی ہے قصائی...... بھلا اتنے خوشگوار شخص کو قصائی کہنا کہاں کی شرافت ہے...... بہر حال ایک روز ماسٹر صاحب فرمانے لگے کہ بھئی بچو میں نے تمہیں محنت سے پڑھایا ہے، میری درخواست ہے کہ کل آپ سارا سبق یاد کر کے آئیں میں سنوں گا...... دوسرے روز حسب سابق آئے بچوں سے سبق سنا جس بچے کو یاد ہوتا اسے ایک طرف کھڑا کر دیتے اور جسے نہ یاد ہوتا اسے دوسری طرف، جب یہ کام مکمل ہو گیا تو معلوم ہوا کہ جن بچوں کو کچھ یاد تھا ان کی تعداد چھ ہے اور بقیہ حضرات تقریباً تیس ہیں جو کھڑے مسکرائے چلے جا رہے تھے...... ماسٹر صاحب پیچھے مڑے ہم نے سمجھا کمرے سے باہر جانے لگے ہیں لیکن نہیں انہوں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگائی پھر ایک لمبی ساری دبیز چھڑی (بلکہ سوٹی)، پتہ نہیں کہاں سے برآمد کی اور اسی طرح مسکراتے ہوئے کہنے لگے "میرے پیارے طالب علمو! جن بچوں نے سبق یاد کیا ہے وہ ذرا ادھر ہو جائیں کیونکہ یہ سارے جنتی ہیں اور جنہوں نے یاد نہیں کیا وہ جہنمی ہیں اور جہنم میں رہنے والوں کو سزا ملنی چاہیئے......" اس کے بعد انہوں نے چھڑی کو تلوار کی طرح فضا میں بلند کیا اور "یا علی" کا نعرہ لگا کر جہنمیوں پر ٹوٹ پڑے دروازہ بند تھا اور پورے دس منٹ ماسٹر دین محمد نے جہنمیوں کو مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا۔ جب وہ کمرے سے باہر گئے تو کلاس روم میں میدان جنگ کے بعد کا نقشہ تھا۔ امی جانوں کو یاد کیا جا رہا تھا، ہائے ہائے کیا جا رہا تھا، متاثرہ حصوں پر پھونکیں ماری جا رہی تھیں اور آنسو تھے کہ تھمنے میں نہ آتے تھے......

میں نے ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے یہ تمام یک طرفہ جنگ دیکھی کیونکہ خوش قسمتی سے میں جنتیوں میں شامل تھا۔

اگلے روز جب فارسی کا پیریڈ آیا تو ہم سب کو نہ صرف "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" کا مطلب بھی آتا تھا بلکہ ہم نے شیخ سعدی کے اشعار بھی زبانی یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ ماسٹر دین محمد حسب معمول مسکراتے ہوئے آئے لیکن لڑکوں کو دیکھ یک دم سنجیدہ ہو گئے "یہ جنتی اور جہنمی آپس میں گھل مل کے کیوں بیٹھے ہوئے ہیں جنتی ایک طرف اور جہنمی دوسری طرف۔۔۔۔۔!" بے چارے جہنمیوں نے عرض کی کہ ماسٹر صاحب سب یاد ہے، بے شک سن لیں لیکن ماسٹر صاحب نے چھڑی گھمائی اور جنتیوں کو الگ بٹھایا اور جہنمیوں کو الگ۔۔۔۔۔ حسب معمول انہوں نے "یا علی" کا نعرہ لگایا اور جہنمیوں پر ٹوٹ پڑے پانچ منٹ تک انہیں پیٹتے رہے پھر کتاب اٹھا کر آرام سے اگلا سبق پڑھانے لگے اس کے بعد روزانہ یہی ہوتا کہ وہ کلاس میں داخل ہوتے پہلے پانچ منٹ جہنمیوں کی پٹائی کرتے اور پھر پڑھائی کرتے جہنمیوں نے لاکھ منت سماجت کہ ماسٹر صاحب اب تو سن لیں ہمیں یاد ہے ہمیں یاد ہے لیکن ماسٹر صاحب کہتے کہ جو ایک مرتبہ جہنم میں چلا گیا سو چلا گیا واپس نہیں آ سکتا۔۔۔۔۔ پورے دس روز بعد انہوں نے پھر سبق سنا اور اس مرتبہ سارے ہی جنتی ہو گئے۔

جب کبھی ایران سے گزر ہوا مجھے ماسٹر دین محمد بہت یاد آئے وہ بہت بے دردی سے پیٹتے تھے لیکن تہران میں، تبریز میں، مشہد میں انہی کے یاد کرائے ہوئے فارسی کے لفظ بول کر میں نے راستے دریافت کیے، ایرانیوں کے ساتھ گفتگو کی اور میں ان کا شکر گزار ہوں۔

آٹھویں جماعت میں ہمارے حساب کے استاد ماسٹر نادر خان تھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دراصل نادر شاہ ہیں۔ موٹے کھدر کی شلوار قمیض، اور پر کوٹ بڑی بڑی نادر شاہی مونچھیں اور طرے دار پگڑی کہیں ملاقات ہو جاتی تو ہاتھ ملانے کی بجائے طالب علم کا کان پکڑ کر زور زور سے کھینچتے اور کہتے "اوئے کیا حال ہے تیرا؟" اور جواب آتا "ہائے ماسٹر جی بڑا اچھا ہائے حال ہے" میرا حساب تو اچھا تھا لیکن الجبرے میں سو فیصد پیدل تھا اس کے لئے جتنی مار میں نے کھائی ہے اس کے لئے میں الجبرے کے موجد کو کبھی معاف نہیں کر سکتا ماسٹر نادر خاں بھی میری اس کمزوری سے واقف تھے چنانچہ سردیوں کی خوشگوار دھوپ میں جب اوپن ائر کلاسیں شروع ہو جاتیں تو ماسٹر صاحب بلیک بورڈ پر سب سے پہلے الجبرے کا کوئی سوال لکھ دیتے اور کہتے "آنا تو ادھر مس تن سر اور نکالنا ہاں ذرا یہ سوال" میں لرزتی ٹانگوں سے لڑکھڑاتا ہوا تختہ سیاہ کی جانب یوں روانہ ہوتا جیسے پھانسی کے تختے کی جانب جا رہا ہوں چاک ہاتھ میں لیتا سر کو کھجاتا اور اس طرح گہری سوچ میں غرق ہو جاتا جیسے اس سے پیشتر سوچنے کے عمل سے میں الجبرے کا سوال حل کر لیا کرتا ہوں۔

"اوئے کدھر چلا گیا ہے؟" ماسٹر صاحب گرجتے اور میں چاک رکھ کر ان کے سامنے اپنی ہتھیلیاں کھول دیتا۔۔۔۔۔۔ اور چھڑی کی ضرب سے پیشتر ہی "ہائے ماسٹر جی" کا نعرہ لگا دیتا۔

ورنیکلر فائنل کا امتحان سر پر آیا تو ماسٹر نادر خاں کو بخار چڑھ گیا وہ دن رات ایک کر کے طالب علموں کو پڑھانے لگے۔ رات کی کلاسیں اس طرح شروع ہوئیں کہ ایک روز ماسٹر صاحب نے چھٹی کے وقت حکم دیا کہ آج سے تمام لڑکے شام کا کھانا

کھا کر سیدھے سکول آئیں اور یہاں پر تین گھنٹے مزید پڑھائی ہوگی۔ جملہ طالب علموں کی تو بس جان ہی نکل گئی کہ اب دن کے بعد رات کو بھی شامت آئے گی اور ہاں اس ایکسٹرا پڑھائی کے لئے کوئی علیحدہ فیس وغیرہ نہیں تھی صرف ماسٹر نادر خان کی لگن تھی ایک دو لڑکوں نے حسب توفیق بہانے بنانے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوگئے تب مجھے پسلیوں میں ٹھوکے دے دے کر کہا گیا کہ تم ہی کچھ کرو میں کھڑا ہو گیا "جناب ماسٹر صاحب جیسا کہ آپ جانتے ہیں آج کل سردیوں کا زمانہ ہے سردی بہت ہے ہم چھوٹے چھوٹے بچے کس طرح سکول پہنچیں گے؟"

"نہیں پہنچیں گے تو اگلے دن میں بید کھائیں گے چھوٹے چھوٹے بچے" ماسٹر صاحب گرج کر بولے۔

"میں جی پھر کمبل لے آؤں ساتھ......" میں نے گزارش کی۔

"تو کمبل چھوڑ رضائی لے آنا...... پر آجانا ورنہ" وہ بھنا گئے۔

اس شام کھانے کے بعد میں نے گھر کی سب سے طویل و عریض رضائی سائیکل کے کیریئر پر باندھی اور سکول پہنچ گیا جونہی میں رضائی سر پر اٹھائے کلاس روم میں داخل ہوا وہاں "رضائی زندہ باد" کے نعرے لگنے لگے چونکہ شام کی نشست کے لئے کمرے میں سے ڈیسک اور کرسیاں وغیرہ اٹھا کر صفیں بچھا دی گئی تھیں اس لئے میں نے آرام سے ایک کونے میں رضائی رکھی اور اسے اوڑھ کر بڑے مزے سے ٹیک لگا کر براجمان ہوگیا۔ ماسٹر نادر کمرے میں داخل ہوئے طالب علموں کی تعداد دیکھ کر بہت خوش ہوئے بلیک بورڈ صاف کرکے اس پر کوئی سوال لکھنے لگے تو ان کی نظر مجھ پر پڑی "اوئے تو حقہ پینے آیا ہے یہاں مستنصر...... یہ رضائی کس کی ہے؟"

میں نے ذرا میٹھے میٹھے کہا "ماسٹر صاحب میری ہے اور آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ تو کمبل چھوڑ رضائی لے آنا"

ماسٹر صاحب کے چہرے کی رنگت بدلی دانت کچکچائے لیکن وہ کچھ بولے نہیں اور نظریں نیچی کرکے پڑھانے لگے چونکہ سردی تو تھی اس لئے آہستہ آہستہ باقی لڑکوں کی ٹانگیں اور ہاتھ میری رضائی کی گرمی میں پہنچنے لگے تھوڑی دیر بعد نصف سے زیادہ کلاس میری رضائی سے لطف اندوز ہو رہی تھی اس موقع پر ماسٹر نادر خان نے بلیک بورڈ پر الجبرے کا ایک سوال لکھا "آہاں رضائی والے باؤ نکال یہ سوال" اب ظاہر ہے یہ صریحاً خودکشی کی دعوت تھی میں نے رضائی کو اپنے آپ سے علیحدہ کیا اس سوال کو دیکھا جو میری موت تھا ماسٹر نادر کے ہاتھ میں پکڑے بید کو دیکھا جو میرا منتظر تھا اور بلیک بورڈ کی جانب آہستہ آہستہ قدم قدم اٹھانے لگا یہی وہ لمحہ تھا جب پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت نوازش کو کمرے میں روشن بجلی کے واحد بلب کے بٹن کو آف کر دینا تھا...... چنانچہ عین اس وقت جب میں تختہ دار پر چڑھنے کو تھا روشنی گل ہوگئی اور دھما چوکڑی مچ گئی ماسٹر صاحب اپنا بید اٹھائے اندھیرے میں ہی حساب کتاب لگاتے مجھ پر وار کرنے لگے لیکن میں واپس اپنی رضائی میں پہنچ چکا تھا جس کی دبیز تہیں میرے لئے ڈھال کا کام دے رہی تھیں اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بیشتر لڑکے کھسکتے کھسکتے کلاس روم سے بھاگ گئے اور ان میں میں بھی شامل تھا اپنی رضائی سمیت...... دوسری صبح ماسٹر نادر نے ہمیں ہیڈ ماسٹر صاحب کے حوالے کر دیا اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی......

بہت عرصہ بعد ایک روز میری دکان پر ایک بوڑھا شخص آیا جس کی مونچھیں مردہ ہو چکی تھیں آواز میں تھرتھراہٹ تھی اور آنکھیں بجھ رہی تھیں میں نے ہاتھ آگے کیا تو اس نے مجھے گلے لگا لیا۔

"مستنصر میں بڑے فخر سے لوگوں کو کہتا ہوں کہ تو میرا شاگرد ہے"...... میری آنکھوں میں نمی کی ہلکی تہہ اتر آئی یہ ماسٹر نادر خان تھے......

ہاں ماسٹر اور ٹیچر میں بہت فرق ہوتا ہے......

چلو چلو پہاڑوں پر چلو

یہ وہ دن ہیں جب جلتے سورج کا کچھ حصہ الگ ہو کر پاکستان پر گرتا ہے اور اس کی گلیوں اور بازاروں میں پگھلنے لگتا ہے نہ صرف یہ کہ جلتا ہوا سورج گلیوں بازاروں میں پگھلتا ہے بلکہ یہ انسانوں کے جسموں کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھونتا ہے ان کا خون ابلنے لگتا ہے ہر شخص جو گھر سے نکلتا ہے اور سورج کی زد میں آتا ہے ...... خواب دیکھنے لگتا ہے۔ ٹھنڈک خنکی اور خوشگوار موسموں کے خواب وہ یوں تو موچی دروازے کے باہر سرکلر روڈ کی تپتی ہوئی سطح پر چل رہا ہوتا ہے لیکن وہ خوابوں میں ٹھنڈے نم چشموں میں چل رہا ہوتا ہے اور اس کے گرد سر بفلک برف پوش پہاڑ کھڑے ہوتے ہیں اور ان سے خنک ہوائیں آ رہی ہوتی ہیں جو اس کے چہرے اور بدن کو چھوتی ہیں بس کچھ یہی حال میرا تھا لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے بجلی بند تھی اور باہر سڑک پر دوپہر اپنی پوری شان و شوکت سے تپ رہی تھی بازار سنسان پڑا تھا رمضان کی وجہ سے ٹریفک بھی بہت کم تھی پسینہ مجھے بھگو رہا تھا اور لوہے کی جس کرسی پر میں بیٹھا تھا وہ بھی میرے پسینے سے ٹھنڈی ہونے کی کوشش کر رہی تھی میرے بھیگے ہوئے ماتھے پر مکھیاں بیٹھی تھیں اور میں اونگھ رہا تھا کبھی کبھار بازار میں سے کوئی تانگہ گزر جاتا اور گھوڑے کی گردن میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز ٹھہری ہوئی گرم دوپہر میں دیر تک معلق رہتی پیاس سے زبان سوکھ رہی تھی اور کبھی کبھار جو جھونکا آتا وہ گرم لو کا ہوتا...... میں بھی

خواب دیکھ رہا تھا ٹھنڈک خنکی اور خوشگوار موسموں کے۔

"السلام وعلیکم" میرے شرقپوری دوست مرزا صاحب جانے کہاں سے بھول پڑے "اوئے ہوئے بہت گرمی ہے آج تو...... میرا خیال ہے درجہ حرارت ایک سو پندرہ سے کم نہیں ہوگا۔"

مرزا صاحب کا ہاتھ بھی تپ رہا تھا وہ ماتھا پونچھتے ہوئے بیٹھ گئے "بس جی یہ تو پہاڑوں پر جانے کے موسم ہیں چشمے ہوں آبشاریں ہوں اور برفیں ہوں...... کیا خیال ہے؟"

"میں تو وہاں پہنچا ہوا ہوں مرزا صاحب" میں نے بھی ماتھے سے پسینہ پونچھا "چشمے آبشاریں اور برفیں واہ واہ مرزا صاحب...... پھر کب چلنا ہے؟"

"یہ گھومنے پھرنے کا شوق تو آپ نے پال رکھا ہے آپ جہاں کہیں گے چلے چلیں گے ہمیں تو ٹھنڈک چاہیے پہاڑوں کی اور بس۔"

اتنی دیر میں شاہ صاحب بھی آ گئے بالکل حواس باختہ کبھی مسکرانے لگتے اور کبھی سنجیدہ ہو کر ہم دونوں کو دیکھنے لگتے ہم نے جان لیا کہ گرمی کا اثر ہے چنانچہ ہاتھ پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھا لیا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمیں تو ٹھنڈک چاہیے پہاڑوں کی......" مرزا صاحب بولے "پھر کب چلنا ہے؟"

"کہاں چلنا چاہیے؟" شاہ صاحب کی بھتیجی باہر آ گئی "اوئے ظالمو کہاں جا رہے ہو مجھے چھوڑ کر؟...... اوئے پہاڑوں پر جا رہے ہو......؟ اوئے چشمے آبشاریں...... چلو چلو پہاڑوں پہ چلو...... لاہور سے نکلو یار و کسی ٹھنڈی جگہ چلو پر مجھے ساتھ لے کر چلو۔"

"ہاں جی اب ہم تین ہو گئے ہیں" مرزا صاحب میرے قریب آ گئے بتانے

پروگرام کہاں چلنا ہے۔ کالجوں میں چھٹیاں ہو گئی اس لئے ہم تو فارغ ہیں۔"

"ہاں بالکل فارغ" شاہ جی بڑی لجاجت سے بولے "کوئی کام نہیں بس یار نکلو یہاں سے ہم لکھنے پڑھنے والے آدمی ہیں اس خوفناک جہنمی گرمی میں ہم کیا سوچ سکتے کیا لکھ سکتے ہیں یار دو اس موسم میں کب شاعری کریں یہ کہ مئی کا آن پہنچا ہے مہینہ ...... یہ شاعری کروں؟ بس میں راضی ہوں تم مجھے بھی لے چلو۔"

"کیسی جگہ چلیں؟" میں نے پوچھا۔

"بس برفیں ہوں ٹھنڈی ٹھنڈی اور پانی ہو ندیوں کا جو گلیشئر میں سے آ رہی ہوں اور پہلو میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو...... کیا ہو؟" شاہ جی تو شاید وہاں ابھی سے پہنچ گئے تھے۔

"جھونپڑا کیا کرنا ہے شاہ" مرزا صاحب ہانپتے ہوئے بولے "کوئی خیمہ شیمہ ہو اپنا اور لگایا ہو کسی جھیل کے کنارے اور پھر بندہ اس میں اپنے پاؤں ڈال کر بیٹھا رہے......"

"اور ساتھ میں چل رہی ہو کیسٹ نورجہاں کے پنجابی گانوں کی...... سن وے بلوری اکھ والیا" شاہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"شاہ جی" مرزا صاحب اس کے کندھے پر ایک دھپ لگاتے ہوئے بولے "مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی"

"کیوں؟" شاہ جی ہراساں ہو گئے "میں نے کیا کیا ہے؟"

"کسی نیلی جھیل کے پانیوں کے قریب خیمہ لگا ہو اور سن وے بلوری اکھ والیا...... لاحول ولا"

"نہیں تو نہ سہی" شاہ جی فوراً بیک آؤٹ کر گئے "دوستوں کی مرضی ہے نہیں تو نہ سہی۔"

"ہاں جی آپ کیوں گھگھو بن کے بیٹھے ہو؟" مرزا صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "پھر کہاں چلنا ہے؟"

"سوات کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک خیال ہے" شاہ نے سر ہلایا "اچھی جگہ ہے اچھی جگہ ہے۔"

"تم گئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں پر دوست کہتے ہیں کہ اچھی جگہ ہے تو اچھی ہی ہو گی" شاہ نے مونچھوں کو بل دیا۔

"ادھر بہت لوگ جاتے ہیں" مرزا صاحب کہنے لگے "خاص طور پر فلموں والے اور ہم تو کوئی خاص جگہ جائیں گے جہاں اور کوئی نہ جاتا ہو...... مثلاً...... وادیٔ کاغان چلیں؟"

"بالکل چلیں" شاہ نے پھر سر ہلایا "اچھی جگہ ہے"

"آپ گئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

شاہ نے مجھے گھورا "میں نہ بھی گیا ہوں تو مجھے کم از کم یہ تو پتہ ہے کہ جون کے مہینے میں گوالمنڈی بازار سے وادیٔ کاغان بہتر اور اچھی جگہ ہے"

"ٹھیک ہے" میں نے کہا "میں بھی دو تین مرتبہ وہاں گیا ہوں...... کیا ہوا ہے وہاں کی تازہ اور ٹھنڈی ہوا اور لالہ زار میں کھلے پھول اور......"

"اوئے بھائی" شاہ نے مجھے جھنجھوڑا "مجھے بھی کچھ بتاؤ وہاں پانی ہے؟ کوئی جھیل وغیرہ؟"

"جھیل سیف الملوک......" مرزا صاحب ایک دم گم ہو گئے "ہائے ہائے کیا جھیل ہے"

"اچھا" شاہ صاحب ان کے قریب ہو گئے جیسے وہ مرزا صاحب نہ ہوں

جھیل سیف الملوک ہو" بیٹی کر ہائے ہائے کیا جھیل ہے...... واہ...... سن وے
بلوری اکھ والیا"

"شاہ جی مجھے ایسے مذاق پسند نہیں" مرزا صاحب اپنے خوابوں سے فوراً
واپس آگئے وہ قدرے ناراض تھے۔

"پر یار حرج ہی کیا ہے میں ایک کیسٹ ساتھ لے جاؤں گا نور جہاں کی...."

"پھر ہم ساتھ نہیں جائیں گے" مرزا صاحب نے فیصلہ دے دیا۔

"اچھا یار میں گزارہ کروں گا تم پروگرام بناؤ"

"پھر کاغان ہی جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی اور جگہ نہیں ہے؟ جہاں ہم پہلی مرتبہ جائیں کہیں اس دنیا سے الگ
کسی بڑے پہاڑی سلسلہ کے قریب......"

"پہلو میں کوہ کے ایک چھوٹا سا......" شاہ نے ہماری طرف دیکھا اور پھر
سینے پر ایک دوہتڑ مار کر بولے "جھونپڑا ہو...... ہائے ہائے جھونپڑا ہو یار مجھے
نکالو اس گرمی سے چلو پہاڑوں پر" ہم نے اسے تسلی دی کہ یہی بندوبست تو کر
رہے ہیں۔

"میں پچھلے برس وادی ہنزہ اور شمالی علاقوں کی طرف گیا تھا...... وہاں چلیں؟"

"وہاں برفیں ہیں؟" شاہ نے دریافت کیا۔

"وہاں دنیا کے طویل ترین گلیشئر ہیں" میں نے کہا۔

"اور گلیشئر عام طور پر برف کے بنے ہوتے ہیں" مرزا صاحب نے شاہ صاحب
کو بتایا۔

"اور وہاں راکاپوشی اور نانگا پربت جیسی برف پوش چوٹیاں ہیں"

"ہائے نانگا پربت" شاہ نے دہائی دی "یہ کدھر ہے یار مجھے نانگا پربت

کے پاس لے چلو"

"شاہ جی آپ آرام سے نہیں بیٹھوگے تو ہم پروگرام کیسے بنائیں گے" مرزا
صاحب نے ناراض ہو کر کہا۔

شاہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور ایک بیبے بچے کی طرح کونے میں بیٹھ گیا۔

"ہاں جی شمالی علاقوں میں کس مقام پر جایا جائے جہاں چشمے ہوں آبشاریں ہوں؟"

"وہ علاقے دنیا کے خوبصورت ترین حصہ ہیں وہاں ہم پہاڑوں میں پیدل
سفر کر سکتے ہیں اور ایسے ایسے مقامات تک پہنچ سکتے ہیں جہاں شاید آج تک
کوئی نہ گیا ہو مثلاً ایک مقام ہے جسے پریوں کا باغ کہا جاتا ہے پندرہ ہزار
فٹ کی بلندی پر ایک گھنا جنگل ہے اور پھول ہیں اور سرد ہوا ہے اور ندیاں ہیں"

"ہائے ہائے ندیاں ہیں" شاہ بے اختیار بول پڑا "اور ان میں ٹھنڈا پانی
ہے چلو یارو چلو ابھی چلو"

"ہم نانگا پربت کے قریب روپل وادی میں جا سکتے ہیں جو بے حد خوبصورت
ہے"

"اور وہاں سے نانگا پربت نظر آتی ہے؟" شاہ نے پوچھا اور میں نے اثبات
میں سر ہلایا "تو پھر چلو...... بندہ نانگا پربت کے سامنے بیٹھا ہو اور کیسٹ لگی ہو
نور جہاں کی تینوں سامنے بٹھا کے شرماناں...... ہائے ہائے"

ہم تینوں سورج ڈھلنے تک چشموں آبشاروں اور ندیوں کی باتیں کرتے رہے
اور پروگرام طے کرتے رہے لیکن پتہ نہیں کیا ہوا کہ جوں جوں سورج ڈھلتا گیا
ہم بھی کچھ ٹھنڈے ہوتے گئے لاہور جو ہمیں بہت گرم اور بہت فضول شہر
لگتا تھا اب قدرے بہتر لگنے لگا گوالمنڈی بازار میں چہل پہل شروع ہو گئی اور
ریڑھیوں والوں کی آوازیں ہر سو گونجنے لگیں۔

"یار یہ جو ہے گلگت اور ہنزہ وغیرہ ہیں یہ بہت دور نہیں؟"
شاہ نے کہا۔

"سنا ہے کہ فلائٹ بڑی مشکل سے ملتی ہے اور ویسے بھی خطرناک راستہ ہے" مرزا بولا۔

"خطرناک راستہ ہے؟" شاہ چونکا "لو ہم نے وہاں ٹھنڈ کے لئے جانا ہے یا ٹھنڈے ہونے جانا ہے؟"

"میرے ایک ڈرامے کی ریکارڈنگ بھی ہے اس ہفتے" میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا "میرے لئے تو بہت مشکل ہو جائے گا یہاں سے نکلنا۔"

"ویسے تو شرقپور بھی اتنا گرم نہیں دریا قریب ہے ضرور پیسے خرچ کے دربدر کی ٹھوکریں کھانی ہیں" مرزا صاحب نے سر ہلایا۔

"بالکل" شاہ نے سر ہلایا "یار اگلے مہینے چلیں گے مری وغیرہ بیویوں کو بھی لے جائیں گے بندہ آرام سے کسی ہوٹل میں ٹھہرے شام کو کڑاہی تکہ کھائے اور کشمیر پوائنٹ پر جا کر سنے کیسٹ "سن وے بلوری اکھ والیا" اچھا جی خدا حافظ مجھے ایک فنکشن پر مضمون پڑھنا ہے" شاہ اٹھا اور چلا گیا۔

لو جی پھر میری ویگن کا بھی وقت ہو گیا ہے" مرزا صاحب بھی تھوڑی دیر بعد اٹھے اور ہاتھ ملا کر چلے گئے۔

برفوں، خنک ندیوں، نیلی جھیلوں اور سرد آبشاروں کا آج کا خواب ختم ہوا ..... کل سورج پھر جلائے گا تو پھر شروع۔

لاہوری محاورے .. اوہ آئے!

ہندوستان کے ایک مسلمان ادیب کسی سلسلے میں لاہور تشریف لائے بیشتر ادیبوں کے ساتھ ملاقاتیں کیں کسی نے اپنے ادب سے انہیں متاثر کیا کسی نے طرح طرح کے کھانوں سے اور کسی نے اپنے گھر کی زیبائش سے موصوف آئے تین روز کے لئے تھے مگر تین ہفتوں کے بعد گئے اور بڑی مشکل سے گئے مجھے ان کا نام بھولتا ہے کیونکہ معروف ادیب نہیں تھے چونکہ انہوں نے کہا تھا کہ ہم ادیب ہوا کرتے ہیں اس لئے ہم نے مان لیا اور ان کے اس بیان پر باہمی دوستی اور بھائی چارے کے رشتوں کو فروغ دینے کی خاطر شک نہیں کیا..... بہر حال آنجناب اگلے برس پھر آ دھمکے ..... اس دوسری آمد پر مجھ سے بھی ملاقات ہو گئی اور باہمی دلچسپی کے امور پر سیر حاصل گفتگو ہوئی میں نے پوچھا اگر لاہور میں کسی قسم کی کوئی تکلیف ہو تو مجھے یاد کیجئے کہنے لگے ابھی یاد کیے لیتا ہوں مجھے بے حد تکلیف ہے میں نے پوچھا کس قسم کی؟ کہنے لگے زبان کی تکلیف ہے میں نے تشویش کا اظہار کیا اور کسی ماہر ڈاکٹر سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا وہ تبسم فرما کر بولے نہیں صاحب میری زبان میں تکلیف نہیں ہے دراصل لاہوری حضرات جو اردو بولتے ہیں۔ اس کو سمجھنے میں مجھے دقت ہوتی ہے میں نے عرض کیا کہ حضور ادھر کی اردو قدرے مختلف ہے بلکہ خاصی مختلف ہے لاہور یا پاکستان کے دیگر شہروں میں بولی جانے والی اردو کا ناک نقشہ آپ کی لکھنوی اردو سے جدا ہے کہنے لگے نہیں نہیں اردو تو تقریباً وہی

ہے لیکن اہل لاہور کچھ تراکیب کچھ الفاظ ایسے استعمال کرجاتے ہیں کہ میرے پلے کچھ نہیں پڑتا کراچی میں مجھے زیادہ وقت نہیں ہوئی بلکہ ان کی اردو سن کر مومن اور میر کی یاد تازہ ہوگئی ہے کیا محاورہ ہے صاحب اور ہر محلے ہر گلی کا الگ ہے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ اس لاہوری انداز کی اردو میں کوئی خاص لفظ جو آپ کو تکلیف دیتا ہے؟

کہنے لگے ایک لاہوری ادیب سے گفتگو ہو رہی تھی کہ اختلاف کا پہلو ظاہر ہوا تو کہنے لگے "آپ تو میٹر ہو گئے ہو"..... اب آپ ہی فرمایئے کہ یہ میٹر ہونا کیا ہوتا ہے......

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ "میٹر ہونا" کسے کہتے ہیں...... بہر حال بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ کیوں نہ لاہوری اردو میں مستعمل چند خصوصی الفاظ اور محاوروں کی تشریح کردی جائے تاکہ عوام الناس جو دوسرے ملکوں یا دوسرے شہروں سے آتے ہیں پریشان نہ ہوں اور اہل لاہور کی "زبان دانی" کو بہتر طریقے پر سمجھ سکیں...... مشتے از خروارے والا معاملہ ہے تو ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) "میٹر ہونا" کسی زمانے میں اس حالت کو "پیچ ہونا" کہا جاتا تھا لیکن ان دنوں چونکہ ہر طرف میٹروں کا دور دورہ ہے اس لئے اس لفظ کو قبول کرلیا گیا..... رکشا میٹر گیس میٹر بجلی اور بے شمار قسم کے میٹر ہماری زندگیوں میں چلتے رہتے ہیں ہم ان پر جھکتے ہیں اور ریڈنگ دیکھتے ہیں اور پھر لحاف لے سوتے ہیں (اگر مناسب قسم کا لحاف دستیاب ہو تو) میٹر ہر وقت چلتے رہتے ہیں یا یوں کہئے گھومتے رہتے ہیں رکشا کھڑا کردیجئے گھر کی تمام روشنیاں بند کر دیجئے آگ بجھا دیجئے پانی بند کر دیجئے لیکن ان کے میٹر چلتے رہیں گے اور انہیں دیکھ دیکھ کر عوام الناس خود بھی تھوڑے سے میٹر ہو جاتے ہیں جو زیادہ میٹر ہو جاتے ہیں وہ مینٹل ہاسپٹل کا رُخ کرتے ہیں۔ یا عزیز و اقارب

زبردستی پکڑ کر ان کا رخ ادھر کر دیتے ہیں لاہور میں یہ محاورہ عام ہے اندرون شہر ایک صاحب اپنے دوست کے والد کی وفات پر تعزیت کرنے گئے ان کی فوتیدگی کا سبب پوچھا تو دوست نے بتایا کہ ویسے تو بیمار بھی تھے لیکن آخری عمر میں والد صاحب تھوڑے سے میٹر ہو گئے تھے مجھے امید ہے کہ اس محاورے کا مطلب سمجھ میں آگیا ہوگا اگر نہیں آیا تو معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ آپ بھی میٹر ہیں۔

(۲) "جگر ہونا": اہل لاہور چونکہ کھانے پینے کے بے حد شوقین ہیں بلکہ شیدائی ہیں اس لئے یہ محاورہ عام ہوا اس کی وجہ تسمیہ کچھ یوں ہے کہ اہل لاہور بکروں مرغوں اور بھینسوں وغیرہ کا گوشت کھا جاتے ہیں ان کی ٹانگیں کھوپڑیاں مغز گردے کپورے وغیرہ سب کھا جاتے ہیں اور اگر نہیں کھاتے تو ان کا جگر نہیں کھاتے چنانچہ جب وہ کسی دوست کو عزیز از جان ثابت کرنا چاہتے ہوں تو کہتے ہیں کہ "او نے وہ تو ہمارا جگر ہے"...... یعنی اتنا عزیز ہے کہ ہم تو اسے کھا بھی نہیں سکتے البتہ کچھ نا عاقبت اندیش حضرات اس محاورے کا بے دریغ استعمال بھی کرتے ہیں اور ان میں سے ایک راشد رانا صاحب ہیں آپ ان کے ساتھ گوالمنڈی یا انارکلی کی طرف نکل جایئے ہر قدم پر رکیں گے دانت نکال کر کسی نہ کسی ریڑھی والے سے پان فروش سے دکاندار سے راہ گیر سے بغل گیر ہوں گے۔ خیریت دریافت کریں گے اور پھر آگے چلیں گے۔

آپ پوچھئے یہ کون تھا؟

"اپنا جگر ہے" جواب آئے گا۔

"اور یہ صاحب کون ہیں؟"

"یہ بھی جگر ہیں"

"اور یہ؟"

"جگر"

"اور یہ ہوتے کون ہیں؟"

"پتہ نہیں"

"ان کا نام کیا ہے؟"

"پتہ نہیں"

"تو پھر اتنے پُرمسرت انداز میں بغل گیر کیوں ہو رہے تھے۔"

"جگر جو ہوا"

(۳) "ہیرا ہونا"..... یہ خاصا پیچدار محاورہ ہے اتنا آسان نہیں جتنا دکھائی دیتا ہے، ہیرا جیسا کہ آپ جانتے ہیں بہت قیمتی چیز ہوتا ہے اور اہل لاہور بھی اسے تقریباً انہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں جب تک حوالے کے ساتھ بات نہ کی جائے صورت حال واضح نہیں ہو سکتی مثلاً..... ایک بڑی اماں رشتے کے لئے آئی ہوئی ایک خاتون کو اپنے برخوردار کے بارے میں کچھ اس طرح بتائیں گی.... بھولے جیسا لڑکا آپ کو کہیں نہیں ملے گا ٹھیک ہے ابھی کام پر نہیں لگا پر پھر بھی دہاڑی بنا لیتا ہے محلے میں کوئی لڑائی جھگڑا ہو تو صلح یہی کراتا ہے "گُھنے" سیک دیتا ہے سب کے..... نشہ پانی بالکل نہیں کرتا..... مجھے اس نے خود بتایا ہے کہ نہیں کرتا محلے والوں کا کیا ہے وہ تو کہتے ہی رہتے ہیں، جوا کھیلنے کی عادت تو شادی کے بعد خود بخود ٹھیک ہو جائے گی یوں سمجھیں کہ میرا بیٹا ہیرا ہے ہیرا، اسی طرح متعدد بار فیل ہونے والے طالب علموں کو بھی ہیرا کہا جاتا ہے۔

(۴) "اوہ آئے": اسے آپ محاورہ نہیں کہہ سکتے بلکہ جذبات کا فوری اور خوبصورت اظہار کہہ سکتے ہیں اگر آپ کسی محفل میں بیٹھے ہوں اور کوئی اور صاحب وہاں تشریف لائیں تو اکثر نعرہ لگتا ہے کہ "اوہ آئے" یہ کوئی نہیں بتاتا کہ کون آئے.....

مختلف شخصیات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور مختلف انداز میں کہا جاتا ہے.....

اگر قریبی دوست آتا ہے تو بلند آواز میں "اوہ آئے" کے نعرے لگتے ہیں،

اگر آنے والا شخص قدرے ناپسندیدہ ہے تو سرگوشی کے انداز میں "اوہ آئے"

والد صاحب آئیں تو ڈرتے ہوئے "اوہ آئے"

اور اگر پولیس آ جائے تو بھاگتے ہوئے "اوہ آئے"

(۵) "بھاجی"..... یہ لفظ لاہوریوں کے اعلیٰ اخلاق کا مظہر ہے موقع بے موقع استعمال ہوتا ہے اور گفتگو کا سنگھار ہے مثلاً ایک صاحب اپنے پورے دن کی تفصیل کچھ یوں بیان کریں گے بھاجی صبح دہی کلچے کا ناشتہ کر کے گھر سے نکلا ہٹی پر پہنچا بھاجی وہاں بازار میں گٹر بھاجی کھلا ہوا میں نے خاکروب کو بلا کر کہا بھاجی اس کی صفائی کرو..... بھاجی نے صفائی کی تو دم میں دم آیا شام کو بھاجی آپ کی بھابی نے کہا کہ پکچر دیکھنی ہے میں نے اس سے کہا کہ بھاجی..... وغیرہ وغیرہ

(۶) کنگھا کر دینا اور چُوچا ہو جانا..... یہ دونوں محاورے ہمیں کنگھی اور چوزے کی یاد دلاتے ہیں نہایت مفید محاورے ہیں اور خاص طور پر بین الاقوامی سیاست کی گتھیاں انہیں استعمال کرنے سے سلجھائی جا سکتی ہیں مثال کے طور پر مندرجہ ذیل گفتگو ملاحظہ فرمایئے۔

"اوئے فیقے اوئے روس کا صدر سنا ہے فوت ہو گیا ہے اس کا تو کنگھا ہو گیا"

"کنگھا تو پترا امریکہ کا بھی ہو گیا ہے ان کا صدر بھی بیمار ہے..... روس تو چُوچا ہو گیا ہے امریکہ کے سامنے....."

وہ کیسے..... چوچا تو امریکہ ہوا ہے اس کے سامنے بولتا ہی نہیں"

"پتہ ہے کیا..... یہ دونوں ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کے سامنے چوچے ہو گئے ہیں اندر سے دونوں جگر ہیں مل ملا کے کنگھا ہمارا کر دیتے ہیں"

مجھے امید ہے کہ میری اس گرانقدر علمی اور تحقیقی کاوش سے بہتوں کا بھلا ہو گا اور باہر سے آنے والوں کو اب لاہوریوں کی اردو سنتے ہوئے تکلیف نہیں ہو گی محاورے تو اور بھی بہت سے ہیں لیکن میری گھر والی بھاجی اس وقت میٹر ہو رہی ہے کہ جاؤ جا کر بازار سے سبزی گوشت لے کر آؤ اور ہم اس کے سامنے چوچے ہو رہے ہیں نہ ہوں تو وہ ہمارا کنگھا کر دے بھاجی...... اسے پتہ ہی نہیں کہ ہم جیسا "ہیرا" خاوند اسے کہیں نہیں ملے گا..... خدا حافظ بھاجی۔

مُلک مُلک کے نائی... سوری باربر

..... پتہ نہیں ان دنوں وہ پہیلی رائج ہے یا نہیں مگر ہمارے بچپن میں اکثر پوچھی جاتی تھی کہ بھلا وہ کونسا شخص ہے جس کے آگے بادشاہ بھی سر جھکاتا ہے.... اسے بوجھنے میں خاصی دقت ہوا کرتی تھی..... کمال ہے کوئی ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے جس کے آگے بادشاہ بھی سر جھکا دیتا ہے تب بتایا جاتا کہ میاں وہ شخص ہے "نائی"..... ہمارے ذہن میں ایک عجیب و غریب تصویر ابھرتی کہ بادشاہ سلامت اپنے تاج سمیت نائی کے آگے بیٹھے ہیں اور نائی کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ حجامت کیسے بنائے۔

خوراک کے بعد نائی انسان کی بنیادی ضرورت ہے..... اگر انسان سکھ نہیں ہے تو..... اور چونکہ میرا سکھوں سے صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ بھی جاٹ ہوتے ہیں اس لئے ملک ملک کی خاک چھاننے کے دوران ملک ملک کے نائی حضرات سے بھی مؤدبانہ ملاقاتیں ہوتی رہیں اگرچہ ان دنوں آپ نائیوں کے آگے سر نہیں جھکاتے بلکہ آئینے کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور وہ استرا قینچی سے لیس آپ کے پیچھے تعینات ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کی موجودگی میں تو آپ کا سر جھکا رہتا ہے..... کہا جاتا ہے کہ نائی بے حد باتونی ہوتے ہیں اس لئے کہ آپ آئینے میں اپنا "حشر" دیکھنے کی بجائے ان کی باتوں میں اُلجھے رہیں لیکن یہ مفروضہ غلط ہے خاص طور پر گونگے نائیوں کے بارے میں..... تو آیئے آپ کو ملک ملک کے

نائیوں سے ملائیں۔

انگریز نائی حجامت بنانے میں طاق ہوتے ہیں اور یہ خوبی ان کی بقیہ قوم میں بھی موجود ہے جو خاص طور پر ایشیا اور افریقہ کی بڑی لمبی چوڑی حجامت بنا چکی ہے انگریز نائی چونکہ مشینی اوزار سے لیس ہوتے ہیں اس لئے آپ کو پل بھر میں "بھیڈو" بنا کر کپڑا جھاڑ دیتے ہیں..... ان کی گفتگو کچھ اس قسم کی ہوتی ہے۔

"سر آپ انڈین ہیں؟

"جی نہیں پاکستانی ہوں"

"ایک ہی بات ہے"

"آپ آئرش ہیں؟"

"جی نہیں میں انگریز ہوں"

"ایک ہی بات ہے"

"یو گاٹ اے پوائنٹ سر..... آپ کو لیڈی ڈیانا پسند ہیں؟

"یہ سوال تو آپ کو پرنس چارلس سے پوچھنا چاہیے"

میرا مطلب ہے آپ کو لیڈی ڈیانا کا ہیر سٹائل پسند ہے؟

"نہیں"

"جالی گڈ..... مجھے بھی پسند نہیں..... آپ کو یہاں کا موسم پسند ہے؟"

"جی نہیں......"

"جالی گڈ مجھے بھی پسند نہیں..... لیجئے آپ کی حجامت ہو گئی..... پسند ہے؟"

"جی بالکل نہیں"

"جالی گڈ..... دو پاؤنڈ عنایت کر دیجئے"

فرانسیسی نائی عام طور پر نائن ہوتی ہے اس سے حجامت کروانے کی بجائے اسے

صرف دیکھنے کو جی چاہتا ہے اور اس سے ہر قسم کی حجامت بنوانے کو بھی جی چاہتا ہے گفتگو ملاحظہ کیجئے (اگر وہ انگریزی جانتی ہو تو)

"آپ کو پیرس پسند آیا؟

"جی بہت"

"کون کون سے نائٹ کلبوں میں گئے؟

"مالن روج میں جھانکا تھا"

"ہائے..... مجھے بھی لے چلتے"

"دیکھئے آپ نے بال کاٹنے کی بجائے میری ٹنڈ کر دی ہے"

"بالڈ ہیڈڈ مرد مجھے بے حد پسند ہیں"

"لیکن......"

"ہائے آپ اتنے سویٹ لگ رہے ہیں"

فرانس میں بالوں کے ساتھ ساتھ آپ کی جیب بھی ہلکی ہو جاتی ہے۔

اب آئیے اطالوی نائی کی طرف جو اتنا سمارٹ اور خوش پوشاک ہوتا ہے کہ اس پر ہالی وڈ کے کسی فلم سٹار کا گمان ہوتا ہے..... وہ بے حد سوچ سمجھ کر بال تراشتا ہے اور اس طرح تراشتا ہے کہ آپ کے بال جوں کے توں رہتے ہیں البتہ اس کی قینچی ہوا میں کٹ کٹ کرتی سنائی دیتی رہتی ہے یہ قدرے باتونی ہوتا ہے۔

"سینیور آپ فلم سٹار ہیں؟

"جی نہیں"

"آہا آپ اتنے خوش شکل ہیں کہ مجھے دھوکا ہو گیا..... آپ یقیناً روزانو براتزی سے زیادہ ہینڈسم ہیں..... آپ کی کوئی شپنگ کمپنی ہے؟

"جی نہیں..... میں ادیب ہوں"

"آہا تب تو آپ دانتے کے ہم پلہ ہوں گے۔۔۔۔۔ اور بدترین کون ہے؟"

"براہ کرم آپ بال کاٹنے پر توجہ دیجئے۔"

"سنیور آپ جیسی شخصیات کبھی کبھار ہی میرے پاس تشریف لاتی ہیں۔۔۔۔ میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں آپ کی موجودگی خوشبو ہے آپ کی شخصیت میں سحر ہے۔۔۔۔۔ اگر کبھی صوفیہ لورین آپ کو دیکھ لیتی تو۔۔۔۔۔۔"

اطالوی نائی بال کاٹنے کی اجرت کے علاوہ اپنی تعریفوں کی قیمت بھی وصول کرتا ہے۔ جرمن نائی عام طور پر بے حد موٹے ہوتے ہیں اور گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے صرف آخر میں اُجرت بتانے کے لئے منہ کھولتے ہیں۔

ترک بھائی سیاست کے ماہر ہوتے ہیں کرسی پر بیٹھتے ہی پوچھیں گے "پاکستانی برادر؟"

"جی ہاں"

"ماشاء اللہ۔۔۔۔۔ یہ امام خمینی کیا کر رہے ہیں؟"

"پتہ نہیں"

"گورباچوف کا تازہ بیان پڑھا ہے؟"

"جی نہیں"

"تمہیں پتہ ہے روسی صرف ترکوں سے ڈرتے ہیں؟"

"پتہ ہے"

"صدر ریگن کی صحت کیسی ہے؟"

"پتہ نہیں"

"یہ ہندوستان والے تمہیں تنگ تو نہیں کرتے؟"

"کبھی کبھی کرتے ہیں"

"ان کو بتا دو کہ ترک تمہارے ساتھ ہیں"

"بتا دیا ہے"

"تمہیں پتہ ہے کہ یونانی بہت برے ہوتے ہیں"

"سارے یونانی؟"

"ہاں سارے یونانی۔۔۔۔۔"

"سارے یونانی تو برے نہیں ہو سکتے"

"میرے استرے کی دھار ملاحظہ کیجئے"

"ہاں سارے یونانی برے ہوتے ہیں"

ایرانی نائیوں کی تازہ ترین صورت حال کے بارے میں میں نہیں جانتا کیونکہ آخری مرتبہ جب ادھر کو جانا ہوا تھا تو شاہ صاحب عوام کو دبائے بیٹھے تھے ان دنوں کچھ اس قسم کی گفتگو کرتے تھے۔

"چشم ماروشن، دل ماشاد۔۔۔۔۔ فرمایئے بال کاٹ دوں شیو بنا دوں یا آپ کے راستے میں پلکیں بچھا دوں"

"فی الحال بال کاٹ دیجئے"

"جان من ایران پسند آیا"

"ہاں۔۔۔۔۔۔ اچھا ہے"

"اچھا ہے؟۔۔۔۔۔ اس جیسا اور کونسا ملک ہے گلشن ہی گلشن، گلاب ہی گلاب۔۔۔۔۔"

"اپنے پاکستان میں بھی بہت گلشن ہیں اور گلاب بھی ہیں"

"ناں۔۔۔۔۔۔ وہاں گلشن نہیں ہو سکتے اور گلاب تو یہاں سے گیا سرزمین ایران سے۔۔۔۔۔ ہماری خوراک پسند آئی؟"

"ہاں آں...... لیکن ہر جگہ صرف چلو کباب ہی ملتے ہیں"

"اگر چلو کباب مل جائیں تو اور کیا چاہیے...... تمہارے ملک میں چلو کباب ہوتا ہے؟"

"ہمارے ملک میں تو سینکڑوں قسم کے کھانے ہوتے ہیں مثلاً......"

"چلو کباب تو نہیں ہوتا ناں؟"

"نہیں"

"تو بس...... تمہارے ہاں حافظ اور سعدی ہیں، عمر خیام ہے؟...... تمہارے ہاں کیا پوری دنیا میں نہیں ہے......"

"تمہارے ہاں تو شاہ رضا شاہ پہلوی بھی تو ہے...... اور کہیں ہے؟"

"تم ساواک ایجنٹ تو نہیں ہو؟"

اب اپنے ملک کی بات ہو جائے کہ اسی میڈیکل ہوسٹل کے سامنے مہندی رنگ بالوں والے ایک کرم فرما ہیں جو بال کاٹتے ہیں تو کاٹتے ہی چلے جاتے ہیں اور اتنے مگن ہو جاتے ہیں کہ دن کا ہوش نہیں رہتا اور رات کر دیتے ہیں......

"چودھری صاحب ذرا دیکھیں ٹھیک ہو گیا؟"

"جی ہاں اب اجازت دیجئے مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں"

"نہیں چودھری صاحب لوگ کیا کہیں گے؟"

"کونسے لوگ؟"

"وہی جو آپ کو ٹیلی ویژن پر دیکھتے ہیں...... کیا کہیں گے کہ اس کی کٹنگ ٹھیک نہیں ہوئی"

"بھائی میں ٹیلی ویژن پر عید بقر عید کو ہی آتا ہوں لوگ کچھ نہیں کہیں گے آپ مجھے فارغ کر دیں مہربانی ہو گی"

"نہیں جی بدنامی تو میری ہو گی آپ بیٹھے رہیں...... چودھری صاحب؟"

"جناب"

"یہ روحی بانو آج کل کہاں ہے؟"

"پتہ نہیں"

"اور ساحرہ کاظمی؟"

"پتہ نہیں"

"اور وہ شہناز شیخ "ان کہی" والی؟"

"پتہ نہیں"

"آپ کو پتہ کیا ہے چودھری صاحب؟"

ساحرہ کاظمی کے حوالے سے یاد آیا کہ ایک روز برادر راحت کاظمی کے ہاں نشست تھی ایک دراز قامت انتہائی باوقار اور خوش شکل صاحب تشریف لائے انگریزی مجھ سے بہتر بولتے تھے لباس بھی انتہائی خوبصورت تھا یقیناً فلم کے ساتھ تعلق ہو گا مختلف موضوعات جو زیر بحث تھے ان میں دلچسپی ظاہر کرتے رہے پھر نہ جانے انہیں کیا ہوا یکدم اٹھے میری طرف آئے اور میرے بالوں میں پھونک مار کر بولے "اوہو"

میں نے پوچھا "کیا اوہو؟"

کہنے لگے "اوہو" اور ایک اور پھونک مار دی۔

میں نے پھر پوچھا کہ جناب کیا پرابلم ہے؟

بولے "آپ کے بالوں کا بیلنس ٹھیک نہیں...... پھونک مارنے سے کھڑے ہو جاتے ہیں...... کس نے کاٹے ہیں؟...... آپ کبھی میرے ہاں تشریف لائیے لیکن پہلے فون پر ملاقات کا وقت حاصل کر لیجیے گا...... ندیم اور

بھائی راحت بھی مجھ سے کٹواتے ہیں"

میں خاصا مرعوب ہوا اور وہیں سر جھکا دیا۔

خواتین و حضرات یہ جو آپ آج ملک ملک کے نائیوں کے حالات و واقعات پڑھ رہے ہیں یہ بے سبب نہیں ہیں مجھے باقاعدہ تحریک ہوئی ہے کہ اس موضوع پر استرا...... معاف کیجئے گا قلم اٹھاؤں ..... اور اس تحریک کے بانی ہیں، جناب اسلام سلمانی صاحب جنہوں نے ازراہ عنایت اپنا ماہنامہ "سنگھار" جو پانچ لاکھ افراد پر مشتمل پاکستانی سلمانی "ہیر ڈریسر" برادری کا سرکاری ترجمان ہے مجھے خصوصی طور پر روانہ کیا ہے اس ؟ دلچسپ اور سبق آموز میگزین میں مضامین ہائے رنگارنگ گیسو افروز ہیں مثلاً........

"بیوٹی پارلر کے کاروبار کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کا عمل شروع ہو گیا..... غیر عورت کو ہاتھ لگانا تو کیا شریعت اسے دیکھنے سے بھی منع کرتی ہے..... خاتون گاہکوں کا موقف"

"کارمل انتظامیہ کے مخالفین کے ناخن اکھاڑ لئے جاتے ہیں"

"انسانی کھوپڑیاں لے کر رقص"

"کرسمس فادر کی داڑھی جل گئی"

"نائی اور حجام بکھنے پر احتجاج"

"عیدالفطر پر مہندی لگوانے کی غرض سے غیر محرموں کے آگے ہاتھ پھیلانے پر ڈاکٹر اسرار احمد کی خواتین پر نقطہ چینی"

"امریکی باربروں کی چاندی"

"لمبے بالوں کے عالمی ریکارڈ"

"گنجے پن کا علاج ممکن ہے؟"

پہلے شیو بنوائی پھر فائرنگ شروع کر دی"

"بلدیہ کونٹے کے میئر کا حماموں پر چھاپہ...... کئی باربروں کے خلاف کارروائی کا حکم"

"انتخابی نشانات میں اگر استرے کا بھی اضافہ کر لیا جاتا تو کیا بگڑ جاتا؟"

ان کے علاوہ "سنگھار کا ادبی تحقیقی سلسلہ" میں "بال، زلف، گیسو، کاکل" کے عنوان سے شعروں کا انتخاب بھی ہوا کرتا ہے آپ بھی ملاحظہ کیجئے

کیوں خزاں میرے تعاقب میں چلی آئی ہے
میں نے بالوں میں کوئی پھول سجایا کب تھا

ان انگلیوں کا لمس تھا اور میری زلف تھی
گیسو بکھر رہے تھے تو قسمت سنور گئی

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

آرائش گیسو کا تمہیں ہوش ہی کب تھا
جب تم نے مجھے دیکھا تو زلفوں کو سنوارا

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

ماہنامہ "سنگھار" کا یہ شمارہ قائداعظم نمبر بھی ہے اور اس میں قائداعظم کی شیو

کرنے والے دو حضرات کے انٹرویو ہیں جن میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ ان کے پاس اعلیٰ
ساخت کے سات استرے تھے اور ہفتہ کے ہر روز کے لئے ایک مخصوص تھا قائد اعظم
سیفٹی ریزر استعمال نہیں کرتے تھے بال کاٹنے کے لئے مشینیں پسند نہیں کرتے تھے
ان کے بال از حد ملائم اور باریک تھے اور ہمیشہ پیچھے کو لوٹے رہتے تھے انہوں
نے مانگ کبھی نہیں نکالی ...... "سنگھار" میں یہ مطالبہ بھی کیا گیا ہے کہ قائد اعظم
کے شیونگ سامان کو قومی عجائب گھر میں محفوظ کیا جائے اور میں اس کی پرزور
تائید کرتا ہوں۔

اور ہاں آخر میں اپنی ایک حماقت کی معافی مانگنا چاہتا ہوں میں اپنی جہالت
کا اقرار کرتا ہوں کہ میں اب تک بال کاٹنے والوں کو "نائی نائی" کہتا رہا اور لکھتا
رہا...... دراصل یہ باربر ہیں اور نائی اور حجام کہے جانے پر احتجاج کرتے ہیں
میں تمام باربروں اور باربریوں سے معذرت چاہتا ہوں کیونکہ استرا شہ رگ کے
نزدیک ہوتا ہے اور مجھے اپنی جان بے حد پیاری ہے۔

آسان ناول نویسی عرف ڈبونہ اور شمشیر بھائی جان

جھنگ سے ہماری ایک "بھتیجی" کوثر نازنین نے اپنے خط میں ایک معصوم سی
فرمائش لکھ بھیجی ہے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں لکھتی ہیں۔

ڈیئر انکل!

آپ کا نام چونکہ ذرا مشکل ہے اس لئے صرف "انکل" لکھ رہی ہوں اُمید
ہے آپ بُرا نہیں مانیں گے مجھے آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے امید
ہے کہ آپ جھنگ ایسے دور دراز علاقے میں رہنے والے ہم لوگوں کے لئے یہ کام
کر دیں گے۔ میں نے اپنی تعلیم مکمل کرلی ہے اور ان دنوں بالکل فارغ ہوں سوچتی ہوں
کہ کوئی ایسا کام کر جاؤں جس سے مجھے حیات جاودانی نصیب ہو جائے بہت سوچنے کے
بعد میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں ایک ادیب بن جاؤں اور ایک ناول لکھوں جو
بہت اچھا ہو۔ اور اس پر مجھے انعام مل جائے لیکن چونکہ میرا ناول لکھنے کا تجربہ
مفقود ہے اس لئے کچھ سمجھ نہیں آتی کہ کس طرح لکھوں آپ تو ماشاء اللہ ہمارے
ملک کے مایہ ناز ادیب ہیں اور موٹی موٹی کتابیں لکھتے رہتے ہیں۔ اس لئے آپ
سے درخواست ہے کہ میری رہنمائی کریں۔ اور بتائیں کہ ناول کس طرح لکھوں مجھے
یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا شروع کیسے ہو۔ ایک دفعہ شروع ہو جائے تو پھر لکھ لوں
گی امید ہے آپ مایوس نہیں فرمائیں گے اور پوری پوری رہنمائی کریں گے شکریہ۔

آپ کی قاری کوثر نازنین۔

پہلی بات تو یہ کہ اس "بھتیجی" نے مجھے "انکل" لکھ کر اپنا کیس خراب کر لیا ہے۔ ایک زمانے میں ہر طرف سے "بھائی جان" پکارے جاتے تھے۔ اب ان دنوں انکل تارڑ کے نعرے سننے میں آتے ہیں اگرچہ "بھائی جان" سے نکل کر "انکل" کی منازل میں بھی جو کوئے دار سے نکلے تو سوئے دار والی بات ہی ہے لیکن ذہن میں جتنے بھی مشہور انکل آتے ہیں اپنے آپ کو ان کی قطار میں کھڑا پا کر بے حد گھبراہٹ ہوتی ہے مثلاً ٹیلی ویژن کے انکل سرگرم ہیں۔ امریکہ والے انکل سام ہیں ادھر انکل چھکن بھی ہیں، جنہیں چچا چھکن بھی کہا جاتا ہے۔ دوستوفسکی کے ناولٹ "میرے چچا کا خواب" والے چچا کاؤنٹ ہیں جن کے جسم کے بیشتر اعضا نقلی ہیں اور وہ قریب المرگ ہیں غرض کہ بیشتر مشہور چچا جو ہیں ان کی شہرت کچھ اچھی نہیں ہے کہ ان میں ایک اور چچا تارڑ کا اضافہ ہو جائے بہرحال میں اس اولین بھتیجی کا شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھے میری ڈھلتی ہوئی عمر کا احساس دلا دیا ہے بھتیجی کوثر چونکہ ان دنوں بالکل فارغ ہی ہیں اس لئے ان کی خواہش ہے کہ اور کوئی ڈھنگ کا کام اگر نہیں ہو سکتا تو ایک عدد ناول لکھ کر ہی حیات جاودانی حاصل کر لیں میں بھی ان کے خط پر خاصے غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جہاں مارکیٹ میں بوٹ پالش بنانا، موم بنانا، مرغیاں پالنا" اور موبل آئل بنانا" وغیرہ کے موضوع پر ارزاں کتابچے دستیاب ہیں وہاں "آسان ناول نویسی" پر کوئی ٹھوس دستاویز موجود نہیں چنانچہ بھتیجی کوثر نازنین کی رہنمائی کے لئے میں اپنے مختصر تجربے کی روشنی میں چند معروضات پیش کرتا ہوں۔

سب سے پہلے تو ناول کا نام رکھ لیں۔ اگر مناسب نام دستیاب ہو جائے تو سمجھئے کہ بس آدھا کام ہو گیا۔ فیشن کے مطابق ناول کا نام اور ہیروئن کا نام ایک ہی ہوتا ہے یہ نام بے حد اچھوتا مختلف اور چونکا دینے والا رومانک ہونا چاہیئے

لیکن احتیاط برتئے کہ نام کسی لڑکی کا ہی ہو۔ کیونکہ ہمارے تجربے میں کئی نام ایسے بھی آئے ہیں جو کہ بعد میں معلوم ہوا کہ کسی خاص رنگ کی اونٹنی یا بلی کے بچے کو کہتے ہیں نام ایسا رکھیئے جس کا کوئی مطلب نہ ہو۔ مثلاً نامینا۔ ڈبو نہ ضائقہ ثنائیہ صبر یحمہ وغیرہ۔ بھتیجی کوثر نازنین کا یہ کہنا بالکل ہی درست ہے کہ ناول کا آغاز کیسے کیا جائے۔ انکل ارنسٹ ہیمنگوے کو بھی یہی پرابلم تھی کہ کوئی کہانی کس طرح شروع کی جائے اور اس کا پہلا فقرہ کیا ہو۔ بقول ہیمنگوے "پہلا فقرہ ایک سچا فقرہ ہونا چاہیئے" لیکن یہ کلیہ تو شاید مرد ناول نگاروں پر لاگو ہوتا ہے خواتین ناول نگاروں کے لئے ایسی کوئی پابندی نہیں البتہ ان کو لکھنے سے پیشتر ایک "موڈ" بنانا چاہیئے۔

"موڈ" کو بنانے کے مختلف طریقے ہیں پہلے اپنے اوپر فرونی سی طاری کر لیں پھر زور زور سے آہیں بھریئے پھر یہ سوچئے کہ آپ فوت ہونے کو ہیں اور اس جہان رنگ و بو کو آخری مرتبہ دیکھ رہی ہیں اگر آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں تو سبحان اللہ بس جب روتے روتے ہچکی بندھ جائے تو قلم ہاتھ میں لیجئے اور بسم اللہ کر دیجئے خواتین کے ناولوں کا آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے یا ہونا چاہیئے "ڈبو نہ ٹینس کا ریکٹ ہاتھوں پہ گھماتی ہوئی غلام گردش سے نکل کر برآمدے میں آئی اور لان میں کھلتے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اداس ہو گئی...... کیاریوں میں بوگن ویلیا زینیا، گل دوپہر، پٹونیا، گل شبو، گل اشرفی چنبیلی اور کامنی کے پھول تھے، ڈبو نہ نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں کالے کالے بادل امڈے چلے آ رہے تھے اور ایک اداس مرغابی اڑتی جا رہی تھی ڈبو نہ ایک مرتبہ پھر نہ جانے کیوں اداس ہو گئی حالانکہ وہ آج ہی کالج میں ٹینس کا میچ تین گولوں سے جیت کر آئی تھی......"

اب آپ جان گئی ہوں گی کہ ڈبو نہ آپ کی ہیروئن کا نام ہے۔ جو بے حد زود رنج حساس بیزار اور اداس رہتی ہے اس آغاز کے بعد آپ اب بے تکان درمیانی صفحات

لکھ سکتی ہیں جن میں ڈبو نہ کی سہیلیوں کی تفصیل اور درجن بھر شادیاں بیان کی جا سکتی ہیں جن میں آپ زیورات اور کپڑوں کے بارے میں اپنی وسیع معلومات کا بھرپور مظاہرہ کر سکتی ہیں اس سٹیج پر آپ کا ہیرو ناول میں داخل ہوتا ہے۔ یہ ہیرو وہی ہو جو وقت اپنے ہاتھ میں ٹینس کا ریکٹ گھماتا رہتا ہے نہایت لاپراہ اور کھلنڈرا خوش شکل اور امیر ہے ڈبونہ ایک روز کالج سے لوٹتی ہے تو پورے گھر میں زور و شور سے صفائیاں ہو رہی ہیں اور گھر کے تمام افراد بے حد خوش ہیں۔ ڈبونہ بیزار ہو کر پوچھتی ہے کہ آج کیا خاص بات ہے اسے بتایا جاتا ہے کہ شمشیر بھائی آرہے ہیں یہ شمشیر بھائی جان دور پار کے کزن ہیں اور یہ بتانے کی ضرورت ہرگز نہیں ہے کہ وہ اس سے پیشتر اس گھر میں کیوں نہیں آئے بہر حال ڈبونہ یہ سن کر پائیں باغ میں چلی جاتی ہے جہاں پوکلپٹس کے درخت پر کوئل برہا کے گیت گا رہی ہوتی ہے (اگرچہ کوئی بھی پرندہ پوکلپٹس کے درخت پر اس لئے نہیں بیٹھتا کہ اس کی بو اسے ناگوار گزرتی ہے لیکن ہم کوئل کو دھریک کے درخت پر تو نہیں دکھا سکتے اس لئے پوکلپٹس ہی ٹھیک ہے) یہاں ڈبونہ ایک مرتبہ پھر جانے کیوں اداس ہونے لگتی ہے کہ اس کی چھوٹی بہن آکر اطلاع کرتی ہے کہ شمشیر بھائی آگئے۔ ڈبونہ اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے اور سب کے کہنے کے باوجود نیچے ڈائننگ روم میں نہیں آتی۔ دوسری صبح جب وہ پائیں باغ میں ٹہلتی ہوئی "زندگی کیا ہے غم کا دریا ہے" گنگنا رہی ہوتی ہے تو اس کو کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے وہ پلٹتی ہے سامنے اس کے خوابوں کا شہزادہ کھڑا ہے اگرچہ اس شہزادے نے جوگر شوز اور ٹی شرٹ پہن رکھی ہے ڈبونہ اس کی آنکھوں میں کھو جاتی ہے اس دوران کوئل کوکنے لگتی ہے ہر طرف پٹاخ پٹاخ پھول کھلتے ہیں یکدم ڈبونہ سنبھلتی ہے اور شہزادے کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کرتی ہے اور اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے شام کو اس کی والدہ اسے بتاتی ہے کہ وہ تو اس کا

کزن شمشیر بھائی جان تھا اس لئے فوراً اس سے معافی مانگو اتنی دیر میں شمشیر بھی آجاتا ہے اور کہتا ہے کہ چھوڑیں خالہ جان ..... جب دل ہی ٹوٹ گیا ہم جی کے کیا کریں گے۔ اور وہاں سے چلا جاتا ہے.....

معاف کیجئے گا میں وفور جذبات سے مغلوب ہو کر کچھ زیادہ ہی لکھ گیا ہوں۔ بہر حال یہ ایک مکمل پلاٹ ہے اس پر ایک شاندار ناول تعمیر ہو سکتا ہے البتہ اس کا انجام کچھ یوں ہو سکتا ہے کہ ڈبونہ زندگی اور دنیا سے مایوس ہو کر ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ دریا کے کنارے سیر کے لئے جاتی ہے اور اس میں چھلانگ لگا دیتی ہے۔ قریب ہی ایک مچھیرا ہے جو ڈبونہ کو ڈبکیاں لگاتے دیکھ کر ایک زوردار چیخ مارتا ہے اور ڈبونہ کو ڈوبنے سے بچا لیتا ہے یہ مچھیرا دراصل شمشیر بھائی جان ہے جو ڈبونہ کے عشق میں ناکام ہونے کے بعد مچھیرے ہو گئے ہیں اس کے بعد دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گنگناتے ہوئے ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف چلتے ہیں ڈبونہ کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں اور ناول کا اختتام ہو جاتا ہے۔

ہیرے حاصل کرنے کا آسان طریقہ

"مشرق" میں چھپنے والے کالم "مردوں کی دنیا" (جسے بعض لوگ "مُردوں کی دنیا" پڑھتے ہیں) کی شریک کالم نگار محترمہ راشدہ نثار کا کہنا ہے کہ میں یعنی مستنصر حسین تارڑ صرف اس لئے پودوں، درختوں، جانوروں اور مویشیوں وغیرہ کے بارے میں کالم لکھتا ہوں کیونکہ میں عورتوں سے بے حد خوفزدہ ہوں۔ یہ بیان قدرے دھمکی آمیز ہے کہ میاں تمہاری جرأت نہیں کہ تم ہم خواتین کے بارے میں قلم اٹھا سکو.....

تو جناب میں بہت ہی بہادر قسم کا مرد ہوں۔ میں ہرگز عورتوں سے خائف نہیں ہوں۔ اور اسی لئے میں نے ارادہ کیا ہے کہ آج کا کالم صرف اور صرف خواتین کے حوالے سے ہوگا۔ اگر خواتین اپنے کالم کا نام ہی "مردوں کی دنیا" رکھ سکتی ہیں تو مجھے کم از کم یہ حق حاصل ہے کہ میں بھی ایک کالم صرف اور صرف صنفِ نازک (اگر انہیں اس ترکیب پر اعتراض نہ ہو تو) کے بارے میں لکھ سکوں۔ اس میں دقت یہ ہے کہ میرے تمام کالم میری بیگم بھی پڑھتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ عورتوں کے بارے میں کوئی ایسی بات لکھ جاؤں جس کا اثر میری گھریلو زندگی پر پڑے۔ (اگرچہ میں ایک بہادر مرد ہوں) کیونکہ میرے ذہن میں جو بھی فقرہ آتا ہے اس کے ساتھ ہی بیگم کی چڑھی ہوئی تیوری بھی آتی ہے۔ چنانچہ اس کا آسان ترین حل میں نے یہ سوچا کہ خواتین کے رسالوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور ان میں سے کوئی ایسا مواد تلاش کیا جائے جس کی بنیاد پر ایک عدد "نسوانی کالم" لکھا جا سکے۔ پاکستانی رسائل میں تو

زیادہ تر ایسے گھریلو مسائل زیر بحث لائے گئے تھے جو خطرناک حد تک تقریباً وہی تھے جن کا تذکرہ میری بیگم کے لبوں پر بھی جاری رہتا ہے۔ مثلاً میں تو اپنی ساس کو پسند کرتی ہوں۔ لیکن وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔ میرا خاوند دیر سے گھر آتا ہے۔ میری نندیں مجھ سے حسد کرتی ہیں۔ میری والدہ کے سگے چچا کے داماد کے بھائی کی بیوی جب بھی ہمارے گھر آتی ہے تو میرے خاوند اس کے ساتھ خوشگوار طریقے سے پیش نہیں آتے جبکہ میں ان کے بھائیوں کو اکثر چائے بھی پیش کرتی ہوں کریلے اور آئس کریم پکانے کا کیا طریقہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ البتہ خواتین کے ایک غیر ملکی میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے "سنہری مشورے" کے عنوان کے تحت ایک مضمون نظر آیا جو یورپ کی شادی شدہ اور غیر شادی شدہ خواتین کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس میں جو سنہری مشورے درج ہیں، وہ ہمارے ہاں کی خواتین کے لئے بھی انتہائی کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ آزمائش ہمیشہ کی طرح شرط ہے۔ مضمون کا آغاز کچھ اس طرح سے ہوتا ہے "آپ جانتی ہیں کہ مہنگائی زوروں پر ہے۔ ایک عام لڑکی کا گزارہ نہیں ہوتا۔ اور ہر لڑکی کی ایک معصوم قسم کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ نہ سہی لیکن ہیروں کے ایک آدھ سیٹ کی ضرور مالک ہو۔ چنانچہ ہم نے آپ کے لئے مندرجہ ذیل مشورے تیار کئے ہیں، جن پر عمل کرنے سے آپ دو چار برس کے اندر اندر ہیرے وغیرہ خرید سکتی ہیں۔ مشورے ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ اگر آپ شادی شدہ نہیں ہیں تو فوراً شادی کر لیجئے ہیرے حاصل کرنے کا یہ آسان طریقہ ہے۔

۲۔ دفتر پیدل جائیے اور ٹیکسی یا بس کا کرایہ بچائیے۔

۳۔ نہانے کے لئے بالٹی استعمال نہ کریں۔ اس طرح پانی زیادہ خرچ ہوگا۔ اس کی بجائے منہ ہاتھ دھو کر ہی دفتر جائیں۔

۴۔ اپنے پرانے کپڑے جوتے اور ہینڈبیگ وغیرہ اپنے دوستوں کے آگے فروخت کرنے کی کوشش کریں۔

۵۔ کسی مقامی اخبار میں کتابوں یا فلموں پر تبصرہ لکھنا شروع کردیں۔ اور اس آمدنی سے مزید کپڑے خریدیں بلکہ اسے جمع کرلیں۔

۶۔ اپنے لئے پالتو جانور مت خریدیں۔ شادی کے بعد مفت میں مل جائے گا۔

۷۔ ہفتے میں ایک دن بھوکی رہیں۔ (یعنی صرف خوراک سے پرہیز کریں)

۸۔ میک اپ کے لئے مہنگے لوشن نہ خریدیں۔ بلکہ "بے بی آئل" خرید کر منہ پر لگالیں۔

۹۔ اگر ۲۵ واٹ کے بلب سے کام چل جاتا ہے تو سو واٹ کا بلب نہ استعمال کریں۔ زیادہ روشنی آنکھوں کے لئے مضر ہے۔ کم روشنی رومانوی ہے۔

۱۰۔ جب بھی گھر پر دعوت کریں تو "ون ڈش پارٹی" کریں۔ اس طرح سوائے برتنوں کے آپ کا کوئی خرچہ نہ ہوگا۔ اور بقیہ خوراک کو فرج میں محفوظ کرکے پورا ہفتہ استعمال میں لائیں۔

۱۱۔ جب کبھی آپ کو کوئی تحفہ دیا جائے تو اتنی تعریف کریں کہ دینے والا شرمندہ ہوکر آئندہ ہفتے پھر تحفہ لے آئے۔ بعد میں یہ تحفہ بیچ کر پیسے جمع کرلیں۔

۱۲۔ گوشت چھوڑ کر صرف سبزیاں کھائیں۔

۱۳۔ اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنے بال دھلانے کے لئے بیوٹی سیلون میں ہرگز نہ جائیں۔ بلکہ اپنے خاوند کو کہیں کہ وہ آپ کے بال دھونے سکھائے۔ اور پھر ان میں کنگھی کردے۔

مندرجہ بالا مشوروں پر عمل کرکے آپ دو تین برس میں اتنے پیسے جمع کرلیں گی جن سے ہیروں کا ایک سیٹ بخوبی خریدا جاسکتا ہے۔"

ان مشوروں کو نقل کرنے کے بعد یکدم مجھے خیال آیا کہ یہ سب کچھ تو مغربی

معاشرے میں رہنے والی خواتین کے لئے ہے۔ ان کا طرز زندگی اور اخلاقیات وغیرہ ہم لوگوں سے بہت مختلف ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک مشرقی خاتون کے دل میں یہ امنگ مچلتی ہے کہ ہائے میرے پاس ہیروں کا ایک سیٹ ہونا چاہیئے تو روزمرہ کے اخراجات کو وہ کس طرح کم کرکے اس نیک کام کے لئے پیسے بچاسکتی ہے۔ اس کے لئے مشورے ذرا مختلف قسم کے ہوں گے۔ پہلا مشورہ تو بالکل وہی ہے۔ جو یورپ میں بھی لاگو ہوتا ہے۔ اور ہمارے ہاں بھی کہ اگر آپ غیر شادی شدہ ہیں تو فوراً شادی کرلیجئے کیونکہ ہیرے حاصل کرنے کا یہ آسان طریقہ ہے۔ بقیہ چند مشورے جو میرے ذہن میں آتے ہیں۔ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اپنے لئے ہر مہینے دس نئے لباسوں کی بجائے صرف نو لباس خریدیئے۔

۲۔ خاوند کے لئے سال میں جو ایک آدھ جوڑا خریدتی ہیں اس کی بھی کیا ضرورت ہے وہ لنگوٹ پہن کر بھی گذارہ کرسکتا ہے۔

۳۔ خاوند کی تمام کتابیں ردی میں فروخت کردیجئے۔ (خاوند کو نہیں کیونکہ اس غریب کی کیا قیمت پڑے گی۔)

۴۔ عورتوں کے لئے ناول لکھنا شروع کردیں تو امکان ہے کہ اسے ٹیلی ویژن والے ڈرامے کی صورت میں دکھانا شروع کردیں۔

۵۔ ہر مہینے اخبار کا بل وصول ہونے پر اخبار والے کو کہیں کہ فلاں فلاں تاریخوں کو تو تم اخبار پھینک کر گئے ہی نہیں (اس دوران بچے آس پاس نہ ہوں ورنہ وہ بھانڈا پھوڑ دیں گے)

۶۔ ساس اگر امیر ہے تو فوری طور پر اس کے ساتھ تعلقات خوشگوار کرلیں۔ اگر بیمار پڑجائے تو اسے کہیں کہ امی جان آپ کو وہم ہے آپ تو بالکل تندرست ہیں...... یہ تب تک کہتی رہیں جب تک آپ کی دلی مراد پوری نہ ہو

جائے ہاں اگر وہ اصرار کرے کہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو تو پھر کسی اچھے ڈاکٹر سے ہرگز رجوع نہ کریں۔

۷۔ خاوند کو اکثر بھوکا رکھیں یہاں تک کہ اسے بھوکا رہنے کی عادت ہو جائے (یہاں پر ملا نصرالدین کے گدھے کا انجام بھی یاد رکھیے گا جسے بھوکا رہنے کی عادت ہونے لگی تو وہ فوت ہو گیا)

مجھے یقین ہے کہ مندرجہ بالا ہدایات پر عمل کرنے سے آپ خاصی رقم جمع کر لیں گی اور حسب خواہش ہیروں کا ایک سیٹ خرید لیں گی۔

اُمید کرتا ہوں کہ راشدہ نثار صاحبہ کو اب یقین آگیا ہو گا کہ میں عورتوں سے ہرگز خوفزدہ نہیں ہوں۔ (انہوں نے میرے سفرنامے نہیں پڑھے) لیکن ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک خوفناک خیال کوندے کی طرح لپکا ہے یعنی اگر میری بیگم بھی مندرجہ بالا ہدایات پر عمل درآمد شروع کر دے تو؟ .... یہ نہیں کہ میں اپنی بیگم سے خوفزدہ ہوں ہرگز نہیں۔ کیونکہ میں ایک بہادر مرد ہوں ...... پھر بھی آپ دعا کیجیے کہ وہ میرا کالم نہ پڑھے۔ شکریہ!

مُردہ کاروبار

میں کل صبح گھر سے شہر کی جانب آ رہا تھا لبرٹی مارکیٹ کے گول چکر پر گھومتا ہوا جا رہا تھا کہ سڑک کے کنارے ایک منحنی سیاہ پڑتا شخص دکھائی دیا اور اس کا وہ ہاتھ بھی دکھائی دیا جو اس نے لفٹ حاصل کرنے کی آس میں بڑھا رکھا تھا وہ ایک کھدر کی صدری اور پھٹی ہوئی دھوتی میں ملبوس تھا میں نے گاڑی کھڑی کی اور اسے بٹھا لیا۔

"مہربانی باؤجی بہت دیر سے کھڑا تھا آج گرمی بہت ہے۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

"یہ نہیں فردوس مارکیٹ کے پاس دھکہ کالونی وہاں رہتا ہوں۔"

"لیکن بابا جاؤ گے کہاں؟"

"پتر مہربانی تمہاری جو بٹھا لیا ہم لوگوں کو بڑا آرام ہو گیا ہے یہ لفٹوں کا.... کار میں جھوٹا بھی مل جاتا ہے اور کرائے کے پیسے بھی بچ جاتے ہیں پر صاحب مجھے بہت کم لفٹ ملتی ہے پوچھو کیوں..... بس لوگ میری دھوتی اور صدری کو دیکھتے ہیں۔"

بابے کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں اور ان پر پسینہ چمکتا تھا اور ظاہر ہے کہ نخت بالکل نہیں تھے چنانچہ میں نے قدرے بلند آواز میں پھر پوچھا "بابا جی جانا کہاں ہے؟"

"ہیں..... اچھا جانا کہاں ہے...... قبرستان"

اب "ہیں؟" کہنے کی میری باری تھی بہرحال میں نے مسکرا کر کہا "قبرستان میں کیا کرتے ہو بابیو؟"

"باؤجی میں مردے دفن کرتا ہوں۔"

"مُردے!" میرے ہاتھ سے سٹیرنگ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ لو بھئی تارڑ صاحب یہ صبح صبح سویرے کیا چیز اپنے پاس بٹھالی ہے آپ نے پہلو میں، اور کرو خدمتِ خلق "قبریں کھودتے ہو؟" میں نے بالآخر ہمت کر کے دریافت کیا۔

"ہاں یہ کام بھی کرتا ہوں لیکن میرا اصل کام مُردے دفن کرنا ہے سرکاری ملازم ہوں صاحب جی۔"

"ہیں سرکاری ملازم مُردے دفن کرتے ہیں؟" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"باؤجی یہ جو کارپوریشن والوں کو نہیں ملتے مُردے سڑکوں پر ادھر ادھر ان کو دفن کرتا ہوں پھر ہسپتالوں میں کئی لوگ مر جاتے ہیں جن کا کچھ اتہ پتہ نہیں ہوتا کہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں تو ان کو بھی میں ہی دفن کرتا ہوں پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی مر جاتا ہے تو اس کا کوئی والی وارث نہیں ہوتا اور محلے والے اسے لے آتے ہیں یا پھر کوئی ایک آدھ عزیز رشتہ دار ہوتا ہے وہ لے آتا ہے تو جناب میں ان سے بھی ٹھیک کر لیتا ہوں۔"

"اچھا" میرا منہ کھلا ہوا تھا۔ "تم مردے دفنانے کے ٹھیکیدار بھی ہو؟"

"ٹھیکیدار تو بڑی شے ہوتا ہے باؤجی میں تو مشکل سے گذارہ کرتا ہوں کئی مرتبہ سارے سارے دن میں کوئی مردہ نہیں آتا کبھی کبھی میلہ لگ جاتا ہے مردے پہ مردہ چلا آتا ہے۔ بس قسمت کی بات ہے۔"

بس یہ بھی قسمت کی بات ہے میں نے دل میں سوچا صبح صبح مُردوں کے

ٹھیکیدار سے ملاقات ہو گئی بہرحال اب چونکہ بٹھا لیا تھا اس لئے اس بابے کو میں یہ کہہ کر اتار تو نہیں سکتا تھا کہ بزرگو اس گاڑی میں مردوں کے ٹھیکیداروں کا داخلہ منع ہے تھوڑی دیر کے بعد میں نے بابے سے پوچھا کہ یہ مُردہ کاروبار کیسا ہے؟

بابا کہنے لگا "باؤجی ٹھیک ہے روزگار ملتا ہے پر آگے سے یہ کام سنبھالنے والا کوئی نہیں ہماری اولاد اس طرف آتی ہی نہیں میں بڑا پریشان ہوں بڑا لڑکا ہے اس نے قبرستان کے باہر خوانچہ لگا لیا ہے چھوٹا کہتا ہے مجھے باہر بھیجو...... میں نے بڑا سمجھایا ہے کہ یہ بنا بنایا کام ہے اسے سنبھال لو آمدنی بھی اچھی ہے اور کام مشکل بھی نہیں ہے...... مردہ نہلا دھلا کر لے آتے ہیں صرف مٹی کھود کر اسے دفن ہی کرنا ہے ناں؟...... اور چنگے بھلے پیسے......" اتنی دیر میں ہم مزنگ چونگی کے قریب آ چکے تھے میں نے بابے کو جنازگاہ کے قریب اتارا اور اپنا راستہ پکڑا گاڑی میں سے مشک کافور کی خوشبو جانے کہاں سے آ رہی تھی۔

یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ آج میری کار میں ایک مردے دفنانے والا بیٹھا تھا اور کئی برس پیشتر میں خود ایک مردے دفنانے والے کی کار میں لفٹ لے کر بیٹھا تھا لیکن ایک فرق تھا یہ والا دیسی بابا تھا اور وہ والا ولائتی گورا صاحب۔

ہوا یوں کہ کرسمس کے آس پاس میں کالج بند ہوئے اور پورا قصبہ ویران ہو گیا چنانچہ میں نے بھی رُک سیک کاندھے پر ڈالا اور ڈوور کی جانب چل دیا جہاں سے فرانس اور بلجیم کے لئے سٹیمر چلتے تھے میرا ارادہ تھا یہاں سے سٹیمر پر سوار ہو کر رودبار انگلستان عبور کی جائے اور پھر لفٹیں حاصل کر کے سوئٹزرلینڈ کے قصبے گرنڈل والڈ جایا جائے اور وہاں پر کرسمس گزاری جائے سفر کچھ اس طور طے ہوا کہ میں رات بارہ بجے کے قریب ڈوور پہنچا۔ وہاں سٹیمر تیار کھڑا تھا۔

ساڑھے تین بجے کے قریب میں بلجیم کی بندرگاہ آسٹنڈ کے باہر کھڑا تھا اب رات
کے اس پہر کہیں رہائش کا بندوبست بھی نہیں ہو سکتا تھا اس لئے میں نے فیصلہ
کیا کہ برسلز جانے والی شاہراہ پر کھڑے ہو کر لفٹ کے لئے قسمت آزمائی جائے
ظاہر ہے اس وقت ٹریفک بہت ہی کم تھی کبھی کبھار کوئی کار یا ٹرک گزرتا مجھ
پر فل لائٹ ڈال کر دیکھتا کہ اندھیرے میں یہ کیا چیز کھڑی ہے اور پھر "ہیلو" کا
ایک ہارن بجا کر بغیر رکے چلا جاتا تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ایک طویل جگمگاتی ہوئی
سیاہ کار میرے قریب آ کر رکی، میری تو آنکھیں کھل گئیں یہ ایک شاہانہ سواری
تھی کار کا ڈرائیور بھی نہایت خوش لباس تھا اس نے سیاہ ڈنر جیکٹ کے ہمراہ ایک
نہائت ہی نفیس بو ٹائی باندھ رکھی تھی۔

"کہاں جاؤ گے؟" اس نے پوچھا۔

"برسلز کی طرف" میں نے جھک کر جواب دیا۔

"بیٹھو" اس نے دروازہ کھولا۔ میں نے اپنا سامان دونوں گھٹنوں پر جما لیا اور
ایک انتہائی آرام دہ نشست میں دھنس گیا یہ یقیناً کسی شہزادے کی کار تھی لیکن
ڈرائیور شکل سے شہزادہ نہیں لگتا تھا۔ وہ درمیانی عمر کا ایک شخص تھا جس کے
چہرے پر ہڈیاں بہت دکھائی دیتی تھیں اور اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں بالکل
دکھائی نہیں دیتی تھیں اس کا رنگ روپ ایسا تھا کہ ہلکے میک اپ کا گمان
ہوتا تھا۔ جب ہم آسٹنڈ سے کچھ دور ہوئے تو میں نے پوچھا کیوں جناب یہ گاڑی
آپ کی ہے؟

وہ میری طرف دیکھے بغیر مسکرایا "کیوں نہیں اس میں کوئی شک کی بات
نظر آتی ہے ...... ہاں سو فیصد میری ہے ...... کیسی ہے؟"

"بہت زبردست میں آج تک اتنی عالی شان اور آرام دہ گاڑی میں

نہیں بیٹھا میں لفٹ کے لئے بے حد شکر گزار ہوں۔

میں عام طور پر لفٹ نہیں دیا کرتا" وہ ایک جمائی کو روکتا ہوا بولا "لیکن
آج میں ساری رات کام کرتا رہا بالکل نہیں سو سکا اور اب مجھے برسلز جانا پڑ گیا
میں نے سوچا کہ اگر اکیلا سفر کروں گا تو شاید نیند آ جائے اس لئے تمہیں بٹھا لیا تم
باتیں کرتے جاؤ۔"

میں نے پہلے اپنا تعارف کرایا پھر اس کا نام پوچھا اور پھر حسب دستور یہ
پوچھا کہ آپ کرتے کیا ہیں؟

اس نے نہائت اطمینان سے کہا میں انڈر ٹیکر ہوں۔

میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے انڈر ٹیکر ظاہر ہے انگریزی میں مردے
دفن کرنے والے کو کہتے ہیں رات کا وقت ...... ملک بلجیم کا اور کوئی شاہراہ
اور اس پر ایک گاڑی میں میں ایک مردوں کے بیوپاری کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

میں تھوڑی دیر خاموش رہا تو وہ کہنے لگا "ہر شخص انڈر ٹیکر سے ڈرتا ہے
لیکن بالآخر اس کے پاس آتا ہے میرا ایک ہمسایہ تھا انتہائی ذلیل اور بدتمیز ہماری
آپس میں گفتگو تک نہ تھی لیکن جب وہ مرا تو میرے پاس آیا ...... تمہارے ہاں
انڈر ٹیکر ہوتے ہیں؟

میں نے اسے بتایا کہ ہم مردے دفنانے کے معاملے میں ابھی اتنے ماڈرن
نہیں ہوئے۔ اس پر اس نے مجھے اپنے کاروبار کے بارے میں خاصی تفصیل
بتائی کہ کسی طرح وہ مردے کو وصول کرتے ہیں اس کی صفائی کرتے ہیں شیو کرتے
ہیں پھر اس کے کپڑوں میں سے بہترین سوٹ چن کر اسے پہناتے ہیں اس کے
چہرے کو ترو تازہ بنانے کے لئے ہلکا سا میک اپ بھی کرتے ہیں (مجھے یقین تھا
کہ اس کے اپنے چہرے پر بھی وہی میک اپ تھا) تابوت پر پھولوں کی آرائش

اور تدفین کے وقت مناسب موسیقی کا انتظام وغیرہ وغیرہ......اگرچہ میں ان مردہ مسائل میں دلچسپی نہیں رکھتا لیکن چونکہ اس کی کار میں سوار تھا اس لئے اس کی گفتگو اس طرح سنتا رہا جیسے افلاطون کے شاگرد منہ کھولے اسے سنتے ہوں گے۔

"آپ کا کاروبار کس شہر میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بنیادی طور پر تو میں آسٹنڈ میں ہی کام کرتا ہوں لیکن کبھی کبھار باہر کا کام بھی کر لیتا ہوں آج بھی اسی سلسلے میں برسلز جا رہا ہوں۔

"کوئی مردہ دفنانے کے لئے؟" میں نے بظاہر بڑے اطمینان سے پوچھا۔

"جی بالکل" وہ کہنے لگا۔

"آپ کو کسی نے وہاں سے فون کیا ہوگا کہ آیئے اور ہمارا ایک مردہ دفن کر دیجئے......"

"جی نہیں مردہ تو آسٹنڈ کا ہے لیکن اسے دفن برسلز میں کرنا ہے کیونکہ اس کے بیٹے کی یہی خواہش ہے۔"

"میں کچھ دیر اونگھتا رہا۔ پھر ایک عجیب وغریب خیال میرے ذہن میں آیا میں نے اس خیال کو جھٹکنے کی کوشش کی پیچھا چھڑانا چاہا لیکن وہ بار بار دستک دیتا رہا۔ تب میں نے ہمت کر کے پوچھا اچھا تو آپ ایک مردے کو برسلز میں دفن کرنے جا رہے ہیں؟

"ہاں"

"اور مردہ کہاں ہے؟

"اس کار میں"

جو کچھ میں نے محسوس کیا وہ کئی صفحوں میں بیان کیا جا سکتا ہے مختصراً اتنا کہوں گا کہ پہلے مجھے ٹھنڈے پسینے آئے پھر گرم پسینے آئے پھر جسم بے اختیار

ہو کر کانپنے لگا اور آواز نے ساتھ چھوڑ دیا اور جب میں قدرے نارمل ہوا تو ایک گھگیائی ہوئی آواز میں درخواست کی کہ جناب مہربانی کر کے مجھے ابھی اسی وقت یہاں اتار دیجئے۔

"مردے سے ڈرتے ہو؟" وہ ایک مہربان ہنسی ہنستے ہوئے کہنے لگا" کار کے پچھلے حصے میں تابوت ہے اور اس میں وہ لیٹا ہوا ہے تمہیں کیا کہتا ہے' ہوں؟"

میں اپنی نشست سے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور ہر لمحہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی سرد ہاتھ میری گردن دبوچنے کو ہے۔

"نہ نہ میں مُردوں وغیرہ سے ہرگز نہیں ڈرتا میں نے یہیں اترنا ہے آپ مہربانی کریں......"

"اس وقت رات ہے کہاں دھکے کھاتے پھرو گے"

"سر میں بے حد شکر گزار رہوں گا اگر آپ مجھے فی الفور یہیں جہاں پر بھی ہم ہیں اتار دیں"

"آرام سے بیٹھے رہو" اس نے قدرے سختی سے کہا اور میں کچھ خوفزدہ سا ہو گیا کیونکہ میں اکیلا تھا اور وہ دو تھے۔

"کیا یہ ایک مزے دار تجربہ نہیں ہے ایک انڈرٹیکر کی کار میں سفر کرنا اور اس کار میں جس کے پچھلے حصے میں ایک تابوت ہو؟"

"یقیناً" میں زبردستی مسکرایا۔

"دیکھو کل کلاں جب تمہارے پاس کار ہو گی تو ہو سکتا ہے تم مجھے راہ چلتے دیکھ لو اور پھر اپنی کار میں بٹھا لو"

"یقیناً" میں نے پھر مسکرا کر کہا......نے میں بٹھاتا ہوں کسی مردوں کے بیوپاری کو اپنی کار میں پھر شائد میں اونگھ گیا۔ کار میں ایک خاموشی تھی جیسے موت کی خاموشی

کہا جاتا ہے۔ وہ صاحب بھی خاصی دیر چپ رہے اور پھر کچھ ہوا۔۔۔ یک بیک چیختی ہوئی کاروں کے ہارن پولیس کے سائرن۔۔۔۔۔ ہماری کار شاہراہ سے نکل کر فٹ پاتھ عبور کر کے کھیتوں میں آن رکی تھی ایک دو کاروں کے ساتھ شاید ٹکرائی بھی تھی۔ لیکن بچاؤ ہو گیا تھا میں نے دیکھا کہ انڈر ٹیکر صاحب ایک پولیس افسر کے ساتھ محو گفتگو ہیں اور خاصے گھبرائے ہوئے ہیں اور ایک تابوت شاہراہ کے عین درمیان میں پڑا تھا اور گزرتی کاریں ہارن دے رہی تھیں اور اس پر روشنیاں ڈال رہی تھیں۔

میں نے اپنا رک سیک اٹھایا اور چوروں کی طرح ان سے چھپتا ہوا شاہراہ سے نیچے اتر کر کھیتوں میں چلنے لگا۔

یہ اگرچہ بہت برس پہلے کا قصہ ہے لیکن کل صبح میں نے ایک مردے دفنانے والے کو لفٹ دے کر ان صاحب کے احسان کا بدلہ چکا دیا۔

چند بُوڑھے لڑکے

ایک اولڈ بوائے اندر آیا۔

یہ اولڈ بوائے موٹا تھا اور گنجا تھا اور دھوتی پہنے ہوئے تھا۔ اس نے اپنا نام بتایا۔ کلاس سیکشن کا حوالہ دیا اور سب سے ہاتھ ملا کر بیٹھ گیا۔

پھر ایک اور اولڈ بوائے نے اندر جھانکا اور پھر دانت نکال کر کہنے لگا "سب کمینے آئے ہوئے ہیں۔ اوئے کی حال اے؟" یہ اولڈ بوائے پان کھا رہا تھا اور کاروں کا بیوپاری تھا۔

ایک اور اولڈ بوائے اندر داخل ہوا۔ لیکن اس سے پہلے اس کا ڈرائیور اندر داخل ہوا اور دروازہ کھولا تا کہ صاحب کو تکلیف نہ ہو۔ اس اولڈ بوائے نے سوٹ پہن رکھا تھا اور سگار پی رہا تھا۔ یہ صاحب ایک سرکاری ملازم تھے۔

ایک کالا سیاہ اولڈ بوائے اندر آیا۔ ہمیں دیکھ کر اس کے دانت چمکے سب سے مصافحہ کیا اور بیٹھ گیا۔ کسی کالج میں استاد تھا۔

ایک پریشاں حال اولڈ بوائے ڈرتا ڈرتا آیا اور کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ کسی پرائیویٹ ادارے میں کلرک تھا۔

چند روز پیشتر ایک سائیکل سوار حضرت میرے ہاں تشریف لائے اور کہنے لگے "میں بابا اشفاق ہوں"

میں نے کہا "میں اشفاق احمد کے بابوں کو تو جانتا ہوں لیکن کسی بابا اشفاق

کو نہیں جانتا؟"

وہ ہنس کر بولا "جناب تارڑ صاحب آپ مسلم ماڈل میں نہیں تھے؟ دسویں لے میں؟ میں بی سیکشن میں تھا۔"

تب میں نے بابے اشفاق کو پہچان لیا۔ جو اُن دنوں ایک نرم و نازک کاکا اشفاق ہوا کرتا تھا۔ بابے اشفاق کے مطابق اس نے مسلم ماڈل ہائی سکول اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھ دی تھی اور اب اگلے بدھ کو ظفراللہ شاہ کے ہاں تمام اولڈ بوائز جمع ہو رہے تھے۔ اور مجھے بھی اس محفل میں شامل ہونا تھا چنانچہ اس وقت چھبیس برس کے بعد تمام کلاس فیلو ایک مرتبہ پھر اکٹھے ہو رہے تھے ہم میں سے بیشتر ایک دوسرے کو بالکل نہیں جانتے تھے اور پہچاننے کی کوشش میں تھے۔ کبھی کوئی اولڈ بوائے اٹھتا اور کسی عمر رسیدہ اولڈ بوائے کو جپھا مار کر کہتا "اوئے تو ہم چھک باز لگ رہے۔ کتنا بدل گیا ہے؟"

ہماری اس محفل میں معاشرے کے تمام نمائندے موجود تھے۔ وکیل، امیر، کاروباری، غریب کلرک، سول سروس کے حکام، اکاؤنٹنٹ، کاغذ بیچنے والے، چھاپہ خانہ کے مالک، پی آئی اے کے مینجر، پی ایچ ڈی پروفیسر، مشہور سرجن اور ڈاکٹر، ادیب سیاستدان وغیرہ وغیرہ ...... اور یہ سب لوگ آج سے چھبیس برس پہلے ایک ہی سکول میں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ اور نوجوان تھے اور برابری کی سطح پر تھے۔ لیکن اب سٹیٹس اور دولت نے کچھ کو مجبور بنا رکھا تھا اور کچھ کو مغرور۔ آہستہ آہستہ اولڈ بوائے ایک دوسرے کو پہچاننے لگے اور پھر باتیں شروع ہو گئیں ان شرارتوں کو یاد کیا گیا جن کی پاداش میں پٹائی ہوتی تھی۔ کلاس ٹیچروں کے قصے شروع ہوئے۔ ماسٹروں کے ان ناموں کا ذکر آیا جو ان کی شخصیت کے مطابق ہم نے رکھ چھوڑے تھے۔ اور پھر دھیرے دھیرے سب اولڈ بوائے نوجوان

ہو گئے۔ اس عہد میں پہنچ گئے جب وہ مسلم ماڈل میں پڑھا کرتے تھے۔ اور اس لاہور میں سانس لینے لگے جو چھبیس برس پیشتر ان کے آس پاس زندہ تھا۔ اب ہر طرف ایک ہنگامہ بپا تھا یوں لگتا تھا جیسے کلاس ٹیچر تھوڑی دیر کے لئے باہر چلا گیا ہے اور طالب علم شور مچا رہے ہیں۔ سول سروس والا اولڈ بوائے کلرک کے ساتھ بیٹھا قہقہے لگا رہا تھا۔ کاروں کا بیوپاری پروفیسر کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔ فرنیچر بیچنے والا، سوئی گیس کے ایک افسر کو اس کے بچپن کے دن یاد کرا رہا تھا.....

سب اُن دنوں کو یاد کر رہے تھے جب ہر درخت سرسبز لگتا ہے اور ہر بطخ پر راج ہنس کا گمان ہوتا ہے۔ بلکہ ہم سب تو اس زمانے سے کٹ کر بہت پیچھے جا چکے تھے۔ بچے بن چکے تھے اور وہی حرکتیں کر رہے تھے۔ اسی طرح ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ مار کر باتیں کر رہے تھے۔

"..... یار ہماری کلاس کتنی زبردست تھی۔ تمہیں پتہ ہے پرویز کتنا بڑا ڈاکٹر ہے؟ خالد محمود امریکہ کے بڑے سرجنوں میں شمار ہوتا ہے....."

"..... اور ماسٹر عزیز صاحب کا بیٹا ڈاکٹر محبوب الحق بھی تو ہمارے مسلم ماڈل کا تھا..... ماشاءاللہ کیا ترقی کی ہے.....؟"

"..... اور کمال پی آئی اے کا مینجر ہے....."

..... اور تم کیا کرتے ہو؟ اچھا انارکلی میں گارمنٹس کی دکان ہے اور اپنی فیکٹری ہے؟ واہ! میرا ربڑ کا کاروبار ہے۔ موٹر سائیکل بیچتا ہوں اور گنپت روڈ پر ہوں۔ اور میرا پریس ہے پاکستان کا جدید ترین پریس۔

اوئے تم کیا کرتے ہو اکرم! میں بس یار ابھی تک واپڈا میں کلرک ہوں...

... لیکن یار تم تو اس زمانے میں بھی کار پر آیا کرتے تھے...... ہاں قسمت بدلتی رہتی ہے۔

یار ہمارے کلاس ٹیچر کتنے محنتی تھے کتنی محبت سے پڑھایا کرتے تھے۔ ماسٹر رحمت خاں، ماسٹر عزیز رفیق صاحب، شناء اللہ، افتخار صاحب نادر خاں ..... کیا کیا لوگ تھے اور کیا بڑے لوگ تھے ــــ بس جناب پڑھائیاں تو ہم نے کیں۔ آج کل معیار تو کچھ نہیں لڑکے محنت ہی نہیں کرتے۔

میں بھی ظاہر ہے اس محفل میں شامل تھا اور باتیں کر رہا تھا اور باتیں سن رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھ سمیت ہم میں سے بیشتر بالکل درمیانے قسم کے طالب علم تھے اور ماضی کو جان بوجھ کر اپنے آپ کو خوش کرنے کے لئے خوبصورت بنا رہے تھے۔ ایک عجیب حیرت ناک بات جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ہم میں سے جو بالکل پھسڈی تھے وہ آج کامیاب ترین اور امیر ترین کاروباری تھے۔ وہ اپنی اپنی ٹیوٹاؤں اور ہونڈاؤں پر آتے تھے جبکہ دیگر حضرات پیدل تھے۔ البتہ کچھ لوگ ایسے تھے جن کے بارے میں ہمیں پتہ تھا کہ وہ شائن کریں گے۔ اور انہوں نے شائن کیا۔ ہاں ایک دو ایسے تھے جو بہت پیچھے رہ گئے۔ قسمت نے ان کا ساتھ نہ دیا...... چھبیس برس بیشتر کے نوجوان لڑکے اب پاکستانی معاشرے کے مختلف شعبوں میں نمایاں کارکردگی دکھا رہے تھے۔ جو حضرات اب نمایاں عہدوں پر تھے یا امیر ہو چکے تھے۔ ان کے ٹیلی فون نمبر اور پتے نوٹ کیے جا رہے تھے...... یار آخر کو ہم کلاس فیلو ہیں، بچپن کے دوست ہیں۔ ایک دوسرے سے ملنا چاہیئے اور مجھے معلوم تھا کہ یہ بچپن کے دوست جب اس کمرے میں داخل ہوئے تھے تو ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں تھے۔ انہوں نے صرف بڑے عہدوں اور امارت کو پہچانا تھا۔

کچھ اولڈ بوائے اپنا تعلیمی تعارف نہیں کروا رہے تھے کیونکہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو چکے تھے۔ کمال ہے یہ وہی اچھو ہے جسے میں سائیکل پر بٹھا کر

سکول لے جایا کرتا تھا۔ اور اب یہ کروڑپتی ہے اور میں مانگٹ نوالہ میں سکول ٹیچر ہوں ...... کچھ اولڈ بوائے بڑے افسروں اور کاروباری حضرات کے سامنے بے حد مؤدب ہو رہے تھے۔ کیا پتہ یہ شخص میرے کام آ جائے اور مجھے میری غربت سے نجات دلائے۔

اتنی دیر میں چائے تیار ہو گئی۔ سب لوگ چائے پی رہے تھے۔ اور اونچی اونچی باتیں کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ رکھنے کے وعدے ہو رہے تھے۔ بچوں کی تعداد پوچھی جا رہی ہے اور کہیں بے حد آہستہ سے سرگوشی کے انداز میں اس لڑکی کے بارے میں سوال تھا جس کے خط اس کی جیب میں ہوا کرتے تھے۔

چائے کے بعد گفتگو کا سلسلہ پھر چل نکلا۔

سب سے پہلے سوٹ اور ٹائی میں ملبوس سگار پینے والے اولڈ بوائے کا ڈرائیور اندر آیا اور بتایا کہ صاحب میٹنگ ہے آپ کی، دیر ہو رہی ہے...... وہ اولڈ بوائے آئندہ ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

پھر ایک کاروباری کو اپنی دکان یاد آ گئی۔

سیاستدان کو بھی ایک میٹنگ پر جانا تھا۔

ڈاکٹر نے کلینک پر جانا تھا۔

وکیل کا منشی آ گیا کہ ایک صاحب جھنگ سے آئے ہیں فوراً آ جائیں۔

اس طرح آہستہ آہستہ نصراللہ شاہ کا دفتر خالی ہو گیا میں بھی باہر آ گیا۔ ریگل کے بس سٹاپ پر صرف ایک شخص کھڑا تھا۔ میں قریب گیا وہ بھی ایک اولڈ بوائے تھا میں نے اسے فوراً پہچان لیا...... اس کے والد کا بہت بڑا کاروبار تھا اور وہ بے حد ذہین اور لائق طالب علم تھا۔ سب کو یقین تھا کہ وہ سول سروس میں جائے گا۔ یا کوئی کارخانہ وغیرہ لگائے گا۔ اور خوش شکل بھی انتہا کا تھا۔ ان دنوں ٹینس کھیلتا تھا ہوسٹنگ کے لئے جاتا تھا...... میرا دوست تو نہیں تھا۔ لیکن میں اسے پسند کیا کرتا تھا......

میں نے پوچھا، یار تمہیں آج دیکھا نہیں اولڈ بوائز کی محفل میں۔

وہ کہنے لگا میں گیا تھا اور ایک کونے میں بیٹھا رہا اور کسی نے مجھے پہچانا نہیں۔

میں نے کہا۔ نہیں یار تم آئے ہی نہیں۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں نہ پہچانتا۔

وہ کہنے لگا بات سنو تم بھی صرف ان لوگوں کو پہچان رہے تھے جو کاروں پر آئے تھے۔ یا جن کا برانڈرتھ روڈ پر کاروبار ہے...... تمہیں پتہ ہے کہ میرے والد صاحب کا کاروبار تباہ ہو گیا تھا۔ اور میں..... چھابڑی لگاتا ہوں۔ چھاؤنی میں..... میرے پاس اپنا تعارف کرانے کے لئے کچھ نہیں تھا..... یار میری بس آگئی ہے انشاءاللہ پھر ملیں گے۔ اور وہ اولڈ بوائے بھی چلا گیا۔

ہیڈ اینڈ لیگز ان امریکہ

ایک تو ان دنوں پرانے سکول فیلو بہت مل رہے ہیں اور یقین جانئے ان سے مل کر کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوتی کیونکہ ان کی شکلیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد ظاہر ہے آپ کی شکل بھی ان جیسی ہی ہوگی انسان آئینوں کو تو چھپا سکتا ہے لیکن ان چہروں کو کہاں چھپائے جو ہر دو چار ہفتے بعد آپ کے سامنے نمودار ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں "اسلام علیکم...... یار میں فلاں ہوں تمہاری کلاس میں تھا پہچانا نہیں؟" جب میں نے انہیں دیکھا ہوگا تب تو وہ ظاہر ہے ایک سکول بوائے ہوں گے۔ تروتازہ زندگی سے بھرپور آنکھوں میں شرارتیں چمکتی ہوئیں...... اور اب وہ جو میرے سامنے آتے ہیں تو ادھیڑ ہونے کو ہیں بال سفید ہو رہے ہیں اگر بال موجود ہیں تو بجھے بجھے اور تھکے تھکے سے دکھائی دیتے ہیں اور غالباً کسی معمولی مرض میں بھی مبتلا ہیں چنانچہ میں انہیں پہچانوں کیسے...... میں دماغ پر زور دیتا ہوں، مزید زور دیتا ہوں لیکن ان کا چہرہ بالکل یاد نہیں آتا تب میں یکدم خوش ہو کر کہتا ہوں "ہاں پہچان لیا تم میرے کلاس فیلو ہو...... بس نام یاد نہیں آرہا" اور وہ بھولا بادشاہ نام بتاتا ہے اور ہم سکول کے دنوں کے بارے میں آہیں بھرتے ہوئے ایک جذباتی قسم کی گفتگو کرنے لگتے ہیں۔

لیکن جاوید کو میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا...... وہ بالکل ویسا ہی

تھا جیسا کہ تیس برس پہلے ہوتا تھا۔ صرف داڑھی مونچھ کا اضافہ ہوا تھا اور ان کے پیچھے وہی چہرہ تھا بچپن کا اور آغاز نوجوانی کا۔ آواز وہی تھی قدرے بچوں ایسی اور سہمی سہمی...... وہ میرا دوست تو نہیں تھا البتہ آدھی چھٹی کے وقت ہم سکول سے باہر بیٹھے ہوئے "بابا آلو چھولے والے" کے ہاں اکٹھے لنچ تناول کیا کرتے تھے۔ ایک آنے کے چھولے اور ایک آنے کا نان...... جاوید خاصا لائق بچہ تھا۔ سکول کے بعد اچھے کالج میں گیا وہاں سے ایم اے کیا سول سروس کا امتحان دیا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر بے شمار امتحانوں میں بیٹھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ لائق تو تھا لیکن انٹرویو میں ہمیشہ کوئی سیدھی ہانک دیتا اور فیل ہو جاتا اکثر انٹرویو لینے والے صاحب کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اسے سوال کرنے شروع کر دیتا اور ویسے بھی ضرورت سے زیادہ سچ بولتا اور اس کی چھٹی ہو جاتی ...... ادھر ادھر دھکے کھانے کے بعد وہ غائب ہو گیا...... کسی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں ہے میں بھی اسے بھول گیا اور پھر وہ پندرہ بیس برس بعد اگلے روز میرے ہاں آن دھمکا...... معلوم ہوا کہ موصوف امریکہ میں ہیں اور ان دنوں شادی کروانے کے لئے وطن واپس آئے ہوئے ہیں۔

میں نے پوچھا "وہاں کرتے کیا ہو؟"

کہنے لگا "سری پائے بیچتا ہوں"

"مذاق کر رہے ہو؟"

"سری پائے مذاق نہیں ہوتے سری پائے ہوتے ہیں"

"لیکن امریکہ میں؟"

"ہاں امریکہ میں...... کیا وہاں بکروں اور گائیوں کے سر اور ٹانگیں نہیں ہوتیں؟"

"ضرور ہوتی ہیں لیکن تم ایم اے فرسٹ ڈویژن ایک ہونہار اور لائق پاکستانی تم یہ کام کس طرح کرتے ہو......"

"یہ کام اس طرح کرتا ہوں کہ اس کام میں رقم ملتی ہے" وہ سنجیدگی سے کہنے لگا "دراصل ہوا یہ کہ پاکستان سے میں لبنان گیا وہاں کچھ عرصہ مزدوری کی پھر وہاں خانہ جنگی شروع ہو گئی وہاں سے کسی نہ کسی طرح میکسیکو چلا گیا تمہیں معلوم ہے کہ میکسیکو اور امریکہ کی سرحد مشترک ہے ہر سال بے شمار میکسیکن سرحد پار کر کے امریکہ چلے جاتے ہیں اور وہاں کھیتوں میں "مزدوری" کے طور پر کام کرتے ہیں یہ غیر قانونی مزدور ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بھی ایک سارا میکسیکن ہیٹ خریدا ایک کھیس کی بکل ماری اور ان میں شامل ہو کر امریکہ چلا گیا...... شکل سے تو ہم بھی میکسیکن لگتے ہیں ناں...... کچھ عرصہ بے کاری کاٹی پھر ایک سٹور میں ٹائلٹ صاف کرنے پر مامور ہو گیا......"

"تم اور ٹائلٹ...... خاکروبوں والا کام؟"

"سنو تو سہی...... بھائی میرے جب دو تین دن سے آدمی کا پیٹ خالی ہو تو وہ ٹائلٹ بھی بخوشی صاف کرنے لگتا ہے......"

"اور سری پائے؟"

"تم ذرا خاموش تو رہو میں بتاتا ہوں...... میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ میں اچھی قسم کی خوراک کھا سکوں اور مرغ کھا کھا کر میرا معدہ بانگیں دینے لگا تھا ایک روز قصاب کے ہاں ایک کونے میں بکروں اور گائیوں کے سروں اور ٹانگوں کا ایک ڈھیر دیکھا...... میں نے پوچھا یہ کیا بلا ہیں؟ کہنے لگا یہ تو ہم پھینک دیتے ہیں تم لے جانا چاہتے ہو تو مفت میں لے جاؤ...... میں نے انہیں ایک بوری میں ڈالا اور فلیٹ میں آ کر فرج میں رکھ

دیا..... چھٹی کے روز میں نے انہیں ایک بڑے سارے دیگچے میں ڈالا اور جتنے مصالحے میرے پاس تھے انہیں دیگچے میں پھینکتا گیا۔ پھر کچھ مکھن وغیرہ ڈال کر چولہے کی آگ کو فل کر دیا یہ ملغوبہ چھ سات گھنٹے پکانے کے بعد جب میں نے چکھا تو بے حد مزیدار تھا سارا تو کھا نہیں سکتا تھا اس لئے اگلی چھٹی پر جاننے والے پاکستانی حضرات کو دعوت دے ڈالی۔ لبنانی روٹی کے ساتھ ان سری پائیوں کو لوگ چٹخارے لیتے ہوئے کھاتے گئے اور تعریفیں کرتے گئے اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ میں اتوار کے اتوار قصاب سے مفت کے سری پائے لے آتا انہیں کسی نہ کسی طریقے سے پکاتا اور یاروں کی دعوت کرتا۔ یار لوگ کچھ عرصہ تو میری اس دعوت پر آتے رہے پھر ان میں سے ایک کہنے لگا "یار جاوید یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ ہر اتوار کو ہم تمہارے ہاں آتے ہیں اور اتنی مزیدار دیسی خوراک جو پورے امریکہ میں نہیں ملتی مفت میں کھا کر چلے جاتے ہیں...... ہم چاہتے ہیں کہ تم اسی طرح ہر اتوار کو یہ پاکستانی ڈش پکایا کرو لیکن جو کوئی بھی آئے وہ پانچ ڈالر کی ادائیگی کرے اور پھر کھانا کھائے...... میں نے بہت احتجاج کیا کہ میں یہ نہیں کر سکتا تم میرے دوست ہوا گر امریکہ میں ہیں تو کیا ہوا پاکستانی تو ہیں ناں اور پاکستانی تو اپنے دوستوں کے لئے..... لیکن وہ کہنے لگا کہ جاوید بھائی ہم لوگ اگر بازار جا کر بھی کھانا کھائیں تو اتنی رقم خرچ ہو جاتی ہے اور وہاں کھانے کو کیا ملتا ہے..... اگر تم چارج نہیں کرو گے تو ہم آئندہ نہیں آئیں گے..... تو جناب اس طرح یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے پہل صرف پاکستانی آئے پھر کچھ امریکی بھی آنے لگے۔ آہستہ آہستہ میری پاکستانی ڈش "ہیڈ اینڈ لیگز" کی شہرت پورے شہر میں پھیل گئی..... میں اتوار کی بجائے بدھ کے روز بھی چھٹی کر کے سری پائے پکانے لگا پھر آمدنی معقول ہونے لگی تو کام چھوڑ دیا اور روز یہ ڈش تیار کرنے لگا۔

مجھے مصالحوں کے بارے میں اب بھی کچھ زیادہ علم نہ تھا بس اللہ توکل پکاتا رہتا اور ہمیشہ ٹھیک ہی پک جاتا۔ میرا کمرہ چھوٹا سا تھا اس لئے میں نے تین کمروں پر مشتمل ایک فلیٹ کرائے پر لیا اور اس میں یہ کام شروع کر دیا اب اللہ کے فضل سے میں نے "ہیڈ اینڈ لیگز" نامی ہوٹل کھول رکھا ہے باورچی کے فرائض میرے ذمے ہیں اور دو خواتین گاہکوں کی خدمت میں سری پائے پیش کرتی ہیں....."

لاہوری سری پائیوں کی امریکہ میں کامیابی کی یہ داستان حیرت انگیز تھی۔

اور شادی کروانے کے لئے پاکستان آئے ہو؟

"شادی کروانے اور تندور خریدنے"

"تندور؟"

"ہاں یار سری پائے کے ساتھ جب تک گرم گرم تندوری روٹی نہ ہو بات نہیں بنتی"

"ادھر امریکہ میں تندور نہیں ملتے؟"

"ملتے تو ہیں لیکن ان کی ساخت مختلف ہوتی ہے...... اور پھر اصل فرق تو مٹی کا ہوتا ہے۔ اپنے وطن کی مٹی سے بنے ہوئے تنور میں پکی ہوئی روٹی میں اسی مٹی کی خوشبو ہوتی ہے اور ہم سب اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو کو ترستے ہیں....."

"تنور کو لے جاؤ گے کس طرح!

"جس طرح بیوی کو لے کر جاؤں گا...... جہاز میں"

"کرایہ بہت لگے گا"

"ہاں میں نے پتہ کیا ہے تقریباً بیوی جتنا ہی کرایہ لگے گا لیکن مجھے فائدہ بہت ہو گا...... اب تو سوچ رہا ہوں کہ دوسرے شہروں میں بھی "ہیڈ اینڈ لیگز" کی برانچیں کھول لوں"

"مجھے یاد آیا کہ اُردو کے منفرد مزاح نگار جناب پطرس بخاری صاحب یو این او میں پاکستانی مشن کے انچارج تھے تو ایک روز انہوں نے قصائی سے گردے کپورے خرید کر اپنے فلیٹ میں پکائے اور نیو یارک کے سفارتی حلقوں کو دعوت دے ڈالی ان سفیروں اور وزیروں نے گردے کپورے کھائے اور انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔ اگلے روز اسی قصاب کی دکان پر انہی وزیروں سفیروں کا ہجوم تھا جو گردے کپورے خرید رہا تھا۔ اتنی دیر میں پطرس بخاری ادھر سے گزرے تو قصاب نے چلا کر کہا

اور یہ حقیقت ہے دیارِ غیر میں جہاں وطن یاد آتا ہے، دوست رشتہ دار یاد آتے ہیں وہاں زبان اسی خوراک کے ذائقے کے لئے ترستی ہے۔ ان دنوں تو پاکستانی خوراک انگلستان میں عام ملتی ہے اور انگریز ہوٹلوں کی نسبت پاکستانی اور ہندوستانی ہوٹل زیادہ ہیں لیکن مجھے وہ زمانہ یاد آرہا ہے جب میں ساؤتھ اینڈ میں رہائش پذیر تھا اور ہر ہفتے لندن کا پھیرا صرف اس لئے لگاتا تھا کہ پاکستانی خوراک کا ذائقہ محسوس کر سکوں۔۔۔۔۔ چونکہ پورے ہفتے کا "بھوکا" ہوتا تھا اس لئے ہوٹل کے اندر پہنچ کر مینو کا مطالعہ کرنے کے بعد کچھ اس قسم کا آرڈر دیتا۔۔۔۔۔۔ دو چکن پراٹھے پلاؤ کی ایک ڈش، مٹر قیمہ، کریلے، پالک۔۔ گوشت اور کھیر۔۔۔۔ پہلی مرتبہ جب آرڈر دیا تو بہت دیر بیٹھا رہا اور ویٹر میری میز کے اردگرد گھوم کر چلا جاتا۔ بالآخر میں نے روک کر پوچھا کہ بھائی کھانا نہیں لا رہے۔۔۔۔۔۔ تو اس نے جواب دیا کہ صاحب جب آپ کے دوست آجائیں گے تب لے آؤں گا ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔۔۔۔۔ میں نے بتایا کہ دوست وغیرہ نہیں آرہے کام پر گئے ہوئے ہیں اس لئے مجبوراً میں یہ ساری خوراک خود ہی کھاؤں گا۔۔۔۔۔۔ لیکن پاکستانی کھانا کھانے میں دو بڑی قباحتیں تھیں، ایک تو انسان کچھ کچھ مخمور ہو جاتا تھا اور جھومتا پھرتا تھا اور دوسری یہ کہ

بڑھکیں لگانے کو جی چاہتا تھا۔

بہرحال میں نے جاوید صاحب کو اس کامیاب تجارتی زندگی پر مبارک باد دی اور پوچھا کہ بھائی میرے تمہاری شادی کیسے ہوگی سسرال والوں کو یہ بتاؤ گے کہ امریکہ میں سری پائے بیچتے ہو؟ ان کے ذہن میں تو گوالمنڈی کا حاجی آجائے گا۔۔۔۔۔

جاوید کہنے لگا کہ منگنی طے پا چکی ہے میں نے انہیں بتایا ہے کہ میں وہاں "ہیڈ اینڈ لیگز" نامی ریستوران چین کا مالک ہوں، فی الحال ان میں سے کسی نے اس نام کا اُردو ترجمہ کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔

پچھلے ہفتے جاوید صاحب اپنی نئی نویلی بیوی اور ایک عدد تنور کے ساتھ جو مزنگ سے خریدا گیا تھا امریکہ سدھار گئے۔

لاہور کی تاریخی خوراکیں

ایک صاحب یہاں تشریف لائے آتے ہی لپٹ گئے اور دیر تک پڑے رہے اب وہ مجھ سے علیحدہ ہوتے ان کا چہرہ سامنے آتا تو میں انہیں پہچانتا چنانچہ بڑی مشکل سے انہیں علیحدہ کیا اس پر وہ قدرے لڑکھڑا گئے سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا شکل سے ظاہر ہوتا تھا کہ قبلہ والد صاحب کے کوئی ہم جماعت ہیں جو دوست کے بیٹے کو دیکھ کر جذباتی ہو گئے ہیں...... والد صاحب کی صحت تو ماشاءاللہ ٹھیک ہے لیکن ان کے یہ ہم جماعت خاصے گئے گذرے تھے بلکہ اہتمام نہیں ہوا تھا ویسے گزر چکے تھے جب ان کا سانس درست ہوا تو کہنے لگے "یار مستنصر اور کیا حال چال ہے"...... میرے بزرگ ہو کر مجھے یار کہہ رہے تھے ان کی اس بے پناہ محبت سے بے پناہ متاثر ہوا عرض کیا "بس جناب آپ کی دعا ہے" وہ سر ہلا کر ہنسنے لگے "اوئے میرا اتنا ادب کیوں کرتا ہے"؟ میں نے کہا "جناب میرا فرض ہے" کہنے لگے "سنا اس لڑکی کا کیا حال ہے جسے بچپن میں خط لکھا کرتا تھا"؟

اس سوال پر میرا سانس رکنے کو آیا کہ کمال بزرگ ہیں خواہ مخواہ غیر ضروری اور آؤٹ آف ڈیٹ حوالے دے کر مجھ برخوردار کو شرمندہ کر رہے ہیں بہرحال میں شرمندہ ہوا اور بصد ادب عرض کیا کہ بزرگو یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کونسی لڑکی اور کیسی لڑکی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

اس پر انہوں نے کھلکھلا کر ہنسنے کی کوشش کی لیکن کھلکھلاہٹ کے بیچ ری

ان کا نظام تنفس درہم برہم ہو گیا اور کھانسنے لگے جب قدرے بحال ہوئے تو صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا اور بولے "اوئے مجھ سے یار باریاں مارتا ہے تیرا ایک خط تو میں بھی لے کر گیا تھا اس کے پاس"

اب یہ صورت حال قطعی طور پر نامعقول سی ہو گئی تھی کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اگر خدانخواستہ میں نے کبھی ایام نادانی میں اس قسم کی کوئی غیر شریفانہ حرکت کی ہو اور کسی خاتون کے نام چٹھی لکھ کر اپنے والد صاحب کے کسی دوست کو ہی دی ہو کہ چاچا جی ذرا یہ لو لیٹر تو فلاں لڑکی کو دے آیئے...... چنانچہ میں نے مزید شرمندہ ہو کر کہا "چاچا جی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

"اوئے......" ان کا زرد پڑتا چہرہ باقاعدہ سرخ ہو گیا" مجھے چاچا کہتا ہے ......اوئے شرم کر...... تو کونسا اتنا دودھ پیتا بچہ ہے جو مجھے چاچا کہہ رہا ہے ......اپنے کلاس فیلو کو چاچا کہتا ہے"

"میرا کلاس فیلو؟" میں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

اوئے میں عبدالباسط ہوں...... موچی دروازے سے آیا کرتا تھا اور تم مجھے باسط کی بجائے باسی کہا کرتے تھے یاد نہیں؟

مجھ پر حیرانگی کا وہ عالم طاری ہوا جس کا اظہار انگریز لوگ "گڈ ہیونز" یا "اوہ مائی گاڈ" بڑبڑا کر کرتے ہیں میں نے اسے غور سے دیکھا ہاں وہ اتنا بوڑھا بھی نہیں تھا صرف بری صحت نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا بلکہ حلیہ ثابت کر دیا تھا زرد چہرہ آنکھیں رخساروں کی ہڈیوں پر رکھی ہوئیں آواز میں نقاہت ایک ضمنی سی توند اور اکھڑا ہوا سانس...... وہ باسی ہی تھا...... بہرحال کچھ بنیادی قسم کے سوال جواب ہوئے اور ان کے بعد میں نے پوچھا "یار باسی تمہاری صحت......" باسی نے وہ جگہ جہاں چھاتی ہوا کرتی ہے پھلا کر کہا "کیسی ہے؟...... اچھی ہے ناں؟"

"اچھی ؟......" میں نے ہکلا کر پوچھا۔

"سب رشک کرتے ہیں کہ یہ صحت میں نے بنائی کیسے ؟...... تمہاری آنکھوں میں بھی رشک اور حسد کے جذبے ہیں" باسی نے یہ بیان انتہائی سنجیدگی سے دیا تھا میں نے اس کا دل دکھانا مناسب نہ سمجھا۔

"اوئے پوچھو تو سہی کہ یہ صحت میں نے بنائی کس طرح ہے؟"

"کیسے بنائی ہے؟"

اس نے پھر سینہ پھیلایا "اوئے ہم نے خوراکیں کھائی ہیں"

"کونسی خوراکیں؟"

"کونسی خوراکیں...... شہر لاہور کی خوراکیں صبح سویرے نہاری اور بونگ، پھر پیڑیاں والی لسی دوپہر کو حلیم کباب اور کڑاہی تکہ...... شام کو مرغ بریانی تلی ہوئی مچھلی اور درمیان میں مٹھائیاں لڈو پیٹھیاں وائے اوئے پکوڑے اور دہی بھلے وغیرہ وغیرہ...... تم تو صاحبی میں مار کھاتے ہو بچہ لاہور شہر کی خوراکیں کھایا کرو...... ذرا مجھ کو دیکھو" میں نے ان کو دیکھا وہ بالکل ویسے ہی تھے جیسے "بھوکوں کی مدد کرو" کے پوسٹر پر ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھایا جاتا ہے۔

"اور اب اپنے آپ کو دیکھو" انہوں نے کہا۔

میں نے اسی صبح آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تھا اس لئے عرض کیا کہ جی بالکل میری صحت آپ جیسی تو ہرگز نہیں ہے۔

"بس یہ خوراکوں کا کمال ہے" وہ نقاہت سے مسکرائے۔

"یار باسی ایک بات پوچھوں......" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا "تم کبھی بیمار نہیں ہوئے؟"

"پہلے کندھے سے ہاتھ اٹھاؤ......" میں نے ہاتھ اٹھا لیا۔

"بیماری تو انسان کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے کبھی لو بیر ہو جاتی ہے کبھی بدہضمی ہو جاتی ہے اور تو سب کچھ ٹھیک ہے بس معدہ کام نہیں کرتا...... بڑے ڈاکٹروں حکیموں کو دکھایا لیکن وجہ معلوم نہیں ہو سکی...... تم کیوں پوچھتے ہو؟"

"بس ایسے ہی...... چائے پیو گے؟"

"چار بجے ہیں ناں؟......" اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی "اس وقت موہنی روڈ والے کبابیے نے کباب لگائے ہوں گے دیر ہو گئی تو ختم ہو جائیں گے...... پھر کسی وقت آؤں گا تفصیلی گفتگو کے لئے...... اب چلتا ہوں"

باسی اٹھنے لگا تو لڑکھڑا گیا میں سہارا دے کر باہر تک چھوڑ آیا اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ باہر کے ملکوں میں وہاں کے خصوصی پکوانوں کے بارے میں باتصویر کتابیں چھپتی ہیں جن میں اجزائے ترکیبی اور پکانے کے طریقے درج ہوتے ہیں اور یوں کل عالم میں ان کی دھوم ہوتی ہے اور ادھر ہمارے لاہور میں دنیا کے بہترین پکوان یا "خوراکیں" تیار ہوتی ہیں اور باہر کی دنیا کو اس کا علم ہی نہیں اگر ان کے بارے میں بھی "لاہور کی خوراکیں" نام کا کوئی کتابچہ چھپ جائے تو پھر کیا انگریز کیا روسی جاپانی سبھی اپنے گھروں میں سری پائے اور مرغ چھولے پکانے شروع کر دیں۔ اگرچہ اس کام کے لئے فلی کوالی فائیڈ تو نہیں ہوں یہ شعبہ باسی صاحب کا ہے لیکن چونکہ انہیں کھانے سے فرصت نہیں ہوتی اس لئے میں حسب مقدور ان خوراکوں کے بارے میں قلم اٹھاتا ہوں اور انتہائی مختصر تراکیب آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ژریدی حلیم...... اس حلیم کو ژریدی کیوں کہا جاتا ہے اس کے بارے میں ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا ممکن ہے کہ لفظ "ژ" کے آگے قاعدوں میں صرف ژالہ باری لکھا جاتا ہے اس لئے بچوں کی آسانی کے لئے ایک اور لفظ ایجاد کر لیا گیا ہو بہرحال

حلیم بنانا بہت آسان ہے...... سب سے آسان طریقہ تو یہی ہے کہ آپ میکلوڈ روڈ پر جا کر اسے خرید لیں لیکن غیر ملکی صاحبان کے لئے یہ ممکن نہ ہو گا اس کے لئے دس کلو دال درکار ہے دال کو اچھی طرح پیس لیجئے پھر اس میں پرانے لحاف کی روئی اچھی طرح ملا دیجئے جب روئی دال ایک جیسے ہو جائیں تو اس میں مٹھیاں بھر بھر کر مرچیں اور گرم مصالحہ ڈال دیجئے...... لیجئے حلیم تیار ہے معاف کیجئے گا اس کو چولہے پر چڑھا کر ابال لیں پھر حلیم تیار ہے۔

سری پائے...... اس کے لئے آپ کو پاؤں درکار ہے لیکن پاؤں انسان کے نہیں کسی چوپائے کے ہونے چاہئیں اگر زندہ چوپائے کے مل جائیں تو بہتر ہے ورنہ مردہ سے بھی کام چل جائے گا اور لاہور میں عام طور پر اسی طرح کام چلایا جاتا ہے باقی ترکیب حسب معمول ہے یعنی جو جی میں آئے کریں لیکن مرچیں اتنی زیادہ ڈالیں کہ اگلی صبح آپ کو خود بخود پتہ چل جائے کہ پچھلی رات کیا کھایا تھا.... بواسیر کے مریضوں کے لئے اکسیر ہے۔

گرم آنڈے...... عام طور پر لوگ انڈوں اور آنڈوں کو ایک ہی چیز سمجھ لیتے ہیں حالانکہ ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انڈے صرف انڈے ہوتے ہیں لیکن انڈہ جب بہت ہی بلند درجات پر پہنچ جاتا ہے تو آنڈہ ہو جاتا ہے ایک اور چیز "ہنڈہ" ہوتی ہے جو اونچے درجے کی بیگمات کھاتی ہیں البتہ ہونڈا بالکل الگ چیز ہے یہ موٹر سائیکل کا نام ہے بہرحال گرم آنڈے اس طرح تیار کیے جاتے ہیں کہ آنڈے لے کر انہیں ابال لیں اور پھر کسی نہ کسی طرح انہیں گرم رکھیں...... لیجئے آنڈے تیار ہیں لیکن انہیں خود نہ کھائیے گا کیونکہ یہ عام طور پر کچھوے کے ہوتے ہیں..... اور کچھوکُما جو ہوتا ہے وہ کچھوے سے الگ چیز ہوتا ہے دونوں کو ایک ہی جانور نہ سمجھیں بس انڈے اور آنڈے والا فرق ہے۔

لاہوری مٹھیائی..... یقین کیجئے کہ مٹھائی اور مٹھیائی میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے مٹھائی وہ ہے جو صرف سنائی دے مٹھیائی وہ ہے جسے سن کر آپ کی رال ٹپکنے لگے اور آپ کا حلق تر ہو جائے اسے بنانے کے سینکڑوں طریقے رائج ہیں دنیا میں دوسرے ممالک بھی سویٹس وغیرہ تیار کرتے ہیں لیکن ان میں وہ خصوصی مزا پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ لوگ سویٹس میں صرف چینی اور شہد وغیرہ استعمال کرتے ہیں جبکہ لاہور میں مٹھیائی بنانے والے کے جسم کا پسینہ ہاتھوں کی غلاظت اور تازہ بہ تازہ مکھیوں کی وافر تعداد شیرے میں گھول دینے سے ایک الگ ٹیسٹ پیدا ہوتا ہے۔

تلی ہوئی مچھلی...... اس خوراک کے لئے لازمی جز مچھلی ہے یقین کیجئے مچھلی کے بغیر آپ تلی ہوئی مچھلی تیار نہیں کر سکتے یقین نہ آئے تو تجربہ کر دیکھئے بہرحال کہیں سے ایک مچھلی حاصل کیجئے بہتر تو یہی ہو گا کہیں سے تلی ہوئی مچھلی ہی حاصل کر لیجئے اس طرح آسانی ہو گی لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو مچھلی منڈی چلے جائیے وہاں آپ کو تازہ مچھلی مل جائے گی مچھلی کے تازہ ہونے کی پہچان صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ فوت ہو چکی ہوتی ہے چنانچہ ایک عدد فوت شدہ مچھلی خریدیئے اور گھر لے آیئے گھر پہنچ کر بیوی کو کہئے کہ اسے تل دے..... لیجئے تلی ہوئی مچھلی تیار ہے..... اگر کھاتے ہوئے مچھلی کا مزا نہ آئے تو پھر یقیناً آپ مچھلی منڈی کی بجائے کسی اور منڈی میں چلے گئے تھے۔

خواتین و حضرات لاہور کی خوراکوں کا تذکرہ ابھی ادھورا ہے اور تفصیل طلب ہے ایک ہی نشست میں لاہور کی تاریخی خوراکوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا میرا مطلب ہے ان کے بارے میں لکھا نہیں جا سکتا ورنہ یوں تو ہمارے دوست باسی کی طرح زندہ دلان لاہور روزانہ ان سب خوراکوں کے ساتھ ایک ہی نشست میں انصاف کرتے نظر آتے ہیں اور پھر ساری زندگی ان کو کچھ نظر نہیں آتا..... انشاءاللہ کسی آئندہ کالم میں بقیہ خوراکوں کا تذکرہ کروں گا تاکہ آپ سب میرے دوست باسی کی طرح اپنی صحتیں بنا سکیں۔

"چھیڑ" کرلے سے چلی جائے اسد

اپنے چچا غالب کے شعری محاسن اور گہرائیوں اور گیرائیوں کے بارے میں یہ بندۂ ناچیز تو کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں کیونکہ ہر بڑے شاعر کو صرف ماہرین ہی سمجھ سکتے ہیں کوئی اور سمجھنے کی کوشش کرے تو اس کا سر پھوڑ دیتے ہیں کہ نالائق تمہیں کیا پتہ ہو کہ غالب کا کیا مقام ہے۔ اقبال کا فلسفۂ خودی کیا ہے اور میر تقی میر میں اتنا درد کیوں ہے بڑے شاعروں کو سمجھنے کے لئے ذہن بھی بڑا ہونا چاہیے مطالعہ بھی وسیع ہونا چاہیے اور تم کیا ہو محض شعروں پر جھومنے والے...... اور ماہرین جو"...... شناس" اور"...... دان" وغیرہ اپنے ناموں کے ساتھ لگاتے ہیں تو سچ ہی کہتے ہیں کیونکہ اگر ہر کس و ناکس غالب اور اقبال کو سمجھنے لگے تو یہ غریب تو بھوکوں مر جائیں...... دراصل تمہید ذرا طویل ہو گئی کہنا میں یہ چاہتا تھا کہ چچا غالب نے کیا خوب کہا ہے کہ

ع چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

تو کیا خوب کہا ہے اور سارے زمانوں کے لئے کہا ہے بلکہ آمدم بر سر مطلب اپنے میاں محمد سلیم کرلا کے لئے کہا ہے۔ اب تک الیکشن کا مرحلہ بخیر و خوبی گزر چکا ہوگا۔ نتائج سامنے آچکے ہوں گے اور کرلا صاحب یا تو حسرت ہی سہی ہوں گے یا اسمبلی میں وصل کے مزے لوٹ رہے ہوں گے۔ اور یہ کمال اُن کی چھیڑ "کرلا"

کا ہوگا یعنی چھیڑ کرلا سے چلی جائے...... یہ الگ بات ہے کہ غالب نے اس "چھیڑ" کو کن معنی میں استعمال کیا ہے لیکن اپنے لاہور میں اس کے معانی کچھ اور ہیں کیونکہ اہل لاہور بھی دوسرے شہریوں کے باسیوں کی نسبت کچھ اور ہیں...... لیکن یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ تاریخ میں کرلا صاحب کا مقام بہت منفرد ہے۔ یہ چھیڑ چھاڑ تو زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے اور اس میں بڑے بڑے ناموروں کے نام آتے ہیں...... مثلاً ہمارے محلے میں ایک صاحب کے دانت بچپن میں منہ بند کرنے کے باوجود باہر جھانکتے تھے اور صرف دو چار دو جھانکتے تھے چنانچہ دیگر بچے لوگ انہیں "ہاتھی دانت" کے نام سے پکارتے تھے۔ اور یہ نام اتنا پاپولر ہوا کہ صبح صبح ان کے گھر میں سے اس قسم کی آوازیں آیا کرتی تھیں......

"ابے او ہاتھی دانت ابھی تک سویا ہوا ہے؟"

"ہاتھی دانت نے ناشتہ کر لیا؟"

اور محلے میں اس قسم کے فقرے سننے میں آتے تھے۔

"سنا ہے ہاتھی دانت فیل ہو گیا ہے"

"وہ کونسا ہاتھی ہے جس کے چار دانت ہوتے ہیں...... ایسا ہاتھی جس پر ہاتھی دانت سواری کر رہا ہو"

اور تو اور جب کبھی کوئی یار دوست اسے گھر سے بلانے جاتا تو گھنٹی بجانے پر اس کے دادا جان باہر جھانکتے اور ان سے پوچھا جاتا کہ جی ہاتھی دانت سے ملنا ہے گھر پر ہے؟

یہ صاحب جوان ہوئے اور ان کے دانت بالکل ٹھیک ہو گئے مگر انہیں ہاتھی دانت ہی کہا جاتا رہا بلکہ ان کی شادی پر جب کارڈ چھپے تو ان کے والد صاحب

لوگوں کو کارڈ دیتے وقت یہ واضح کر دیتے کہ جناب میرے بیٹوں میں سے ہاتھی دانت کی شادی ہے..... اب ماشاء اللہ ان کے بچے ہیں اور ہاتھی دانت کے بچے کہلاتے ہیں۔

ایک روز میرے ہاں ایک بزرگ تشریف لائے اچکن اور ترچھی ٹوپی میں ملبوس شین کاف انتہائی قابل رشک..... چیف انجینئر کے عہدے پر ریٹائر ہو کر اب بچوں کو کھلاتے تھے اور ادب عالیہ کا ذوق رکھتے تھے۔ ان کی گفتگو انتہائی پر مغز اور بصیرت افروز تھی وہ جب چلے گئے تو بھولا ریڑھی والا میرے پاس آیا اور کہنے لگا "باؤ جی یہ باہائیں آپ کا یار ہے؟"

"کونسا باہائیں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہی جو آپ کے پاس بیٹھا تھا؟"

میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس تو ایک بزرگ نصیر الدین حیدر آبادی نام کے بیٹھے تھے باہائیں نہیں تھا بھولا کہنے لگا نہیں جی باہائیں تھا۔

پانچ چھ روز بعد وہی بزرگ پھر آ گئے ابھی بیٹھے ہی تھے کہ بھولے نے نعرہ لگایا "باہائیں"..... بزرگ نے اپنی چھڑی اٹھائی اور پر مغز گالیاں دیتے ہوئے بھولے کی طرف لپکے۔ بھولا بھی تیار تھا فوراً ریڑھی سے اتر کر چوک کی طرف بھاگ گیا..... اس دوران پچی پان فروش نے بھی "باہائیں" کا نعرہ لگا دیا۔ اب ان بزرگ نے پچی کی ماؤں بہنوں کے قصیدے الاپنے شروع کر دیئے..... بہر حال میں نے بڑی مشکل سے انہیں ٹھنڈا کیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر واپس لے آیا ...... اگلے روز میں نے بھولے سے "ہیں" کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگا باؤ جی اس بابے نے ایک طوطا پالا ہوا ہے اور یہ ہر وقت اس کے ساتھ باتیں کرتا رہتا ہے طوطا کچھ اچھی نسل کا نہیں ہے اس نے کچھ بھی نہیں سیکھا اور یہ بابا جی اسے

کہتے ہیں" اوئے بول بچے..... ہیں..... پڑھو بسم اللہ ہیں..... ہیں ہیں..... کہو کیا حال ہے ہیں ہیں"..... اب ہوا یہ ہے کہ انہیں "ہیں" کہنے کی اتنی عادت ہو چکی ہے کہ عام لوگوں سے یا گھر والوں سے باتیں کرتے ہوئے بھی بیچ بیچ میں "ہیں" کہتے جاتے ہیں۔ میرے پاس پھل فروٹ لینے آتے ہیں تو کہتے ہیں چار "ہیں" مالٹے' ایک درجن کیلے "ہیں" کتنے "ہیں" پیسے؟..... اور پچی کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں یار پچی ایک "ہیں" پان تو کھلاؤ..... بس باؤ جی ان کا نام پڑ گیا ایک روز ان کا پوتا پھل خریدنے آیا تو کہنے لگا پیسے کم لگانا میں باہائیں کا پوتا ہوں"

اب میں نے بھی غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ میرے ساتھ بھی اپنی گفتگو کے دوران "ہیں" کرتے تھے میرا مطلب کہتے تھے لیکن میں نے اسے کوئی اردو کا قدیم محاورہ سمجھا اور میرا دماغ طوطے والے "ہیں" کی طرف نہ گیا۔

میرے ایک دوست ہیں صابر خاندانی نواب ہیں عمدہ لباس میں ملبوس ہوں تو پوچھیں گے "کیوں بھائی 'تار ڈیکوریشن' کیسی ہے" یہ ڈکریشن دراصل ڈیکوریشن ہے۔ ایک زمانے میں انہوں نے چہرہ پر رعب بنانے کی خاطر مونچھیں پال لیں ایک روز مال روڈ پر چند دوستوں کے ساتھ چہل قدمی فرما رہے تھے میں قریب سے گزرا تو جانے کیوں رہ نہ سکا اور نعرہ لگا دیا" ابے او مچھڑ"..... اس پر نواب صاحب قدرے چونکے جز بز ہوئے اور چہل قدمی جاری رکھی اس طرح ایک فیشن ایبل ہوٹل میں ڈنر کھا رہے تھے تو میں نے قریب سے گزرتے ہوئے "مچھڑ" کا نعرہ لگا دیا۔ لیکن مجال ہے کہ ان کی مونچھ بھی پھڑکی ہو جیسے سے کھانا کھاتے رہے..... یہ نام فدا رائج ہو گیا..... ایک روز میں اپنے والد صاحب کے ساتھ بس سٹاپ پر کھڑا تھا تو پیچھے سے آواز آئی "ابے او مچھڑ" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو نواب صاحب

فل ڈیکوریشن میں چلے جا رہے تھے میری طرف دیکھا تک نہیں ...... حالانکہ آواز انہی کی تھی ...... اب ایک اور گیم شروع ہو گئی یعنی ہم دونوں میں سے جو بھی پہلے دوسرے کو دیکھ لیتا وہ نہایت اطمینان سے " مچھڑ " کا نعرہ لگا دیتا ...... جب کبھی میں مال پر نکلتا تو قدرے چوکنا ہو کر نکلتا کہ کہیں نواب صاحب بے خبری میں مجھے " مچھڑ " کہہ کر گزر نہ جائیں ادھر نواب صاحب بھی ہوشیار ہو کر چلتے ...... یہ صورت حال کچھ کچھ ہاتھ سے نکلنے لگی یعنی میں کسی عزیز بزرگ رشتہ دار کے ہمراہ جا رہا ہوں اور میں نے نواب صاحب کو دیکھ لیا ہے اور اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ مجھ سے بازی لے جائیں چنانچہ میں منہ پر ہتھیلی رکھ کر " اے او مچھڑ " کا نعرہ لگا دیتا ہوں نواب صاحب چونک کر نارمل ہوتے ہیں اور ایسے چلتے جاتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ۔ البتہ جن بزرگ کے ساتھ میں نہایت مؤدبانہ اور عالمانہ گفتگو کرتا ہوا چل رہا تھا وہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں " بیٹا کیا ہوا ؟ "

" کچھ بھی نہیں جناب "

" یہ تم نے منہ پر ہاتھ رکھ کر کیا کہا تھا ؟ "

" کچھ بھی نہیں جناب "

اور وہ بزرگ مجھے گھورتے ہیں کہ برخوردار کا دماغ شاید زیادہ لکھنے پڑھنے کی وجہ سے چل گیا ہے ۔ ایک مرتبہ راولپنڈی کے کچھ نوجوان ادیب مجھے ملنے کے لئے آئے اور میں انہیں ایک مقامی ریستوران میں چائے پلانے کے لئے لے گیا چائے آ گئی اور میں نہایت سنجیدگی سے ادب میں جمالیات و کمالیات وغیرہ کے موضوع پر انہیں لیکچر دینے لگا ...... دیکھیں بھئی ادب زندگی کے تمام تر سنگین حقائق کو نہ صرف پیش کرنے کا نام ہے بلکہ ان حقائق کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی اور اقتصادی ناہمواریوں کی طرف ایک نظریاتی اور مستحکم نکتہ نظر

...... کو قاری کی عقل سلیم کے بطون میں داخل کر کے معاشرے کو یہ اشارہ دینا پڑتا ہے کہ " اے او مچھڑ "

قصور میرا نہ تھا نواب صاحب اس وقت ریستوران میں داخل ہوئے تھے اور مجھے دیکھتے ہی نتائج سے لا پرواہ ہو کر نعرہ لگانے لگے تھے اس لئے پہل میں نے کر دی ...... یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان نوجوان ادیبوں کے ذہن میں جو میرا امیج تھا خاصا ڈیمج ہوا اور اس کے بعد وہ مجھے کبھی ملنے نہیں آئے ...... نواب صاحب کی صورت حال بھی مجھ سے مختلف نہ تھی وہ بھی مجھے دیکھتے ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر مچھڑ کا نعرہ لگا دیتے اور میں اپنے ہمراہ چلنے والے دوستوں یا رشتہ داروں کے سامنے شرمندہ ہوتا رہتا اس کا کلائمیکس تب ہوا جب ایک روز میں اپنے بچے کے ہمراہ انارکلی میں شاپنگ کر رہا تھا نواب صاحب نے دکان میں داخل ہوتے ہی پہل کر دی " مچھڑ " ...... دکاندار پریشان کہ اتنے خوش لباس نوجوان ہیں اور ذہنی طور کمزور ہو گئے ہیں بہر حال نواب صاحب میرے پاس آ گئے اور میرے بیٹے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے " یہ مچھڑ کا بیٹا ہے ؟ "

" میں نے کہا " ہاں ہے ...... لیکن یاد رکھو جب شادی کرو گے اور تمہارا بیٹا ہو گا تو میں بھی اسے مچھڑ کا بیٹا کہوں گا " ہنس کر فرمایا " اسی لئے تو میں شادی نہیں کر رہا ۔ نہ شادی ہو گی نہ بیٹا ہو گا اور نہ تم اسے مچھڑ کا بیٹا کہہ سکو گے "

مزیدار بات یہ ہے کہ اس عرصہ میں ان کی مونچھیں صاف ہو چکی تھیں اور میری تو تھیں ہی نہیں لیکن اس کے باوجود آج تک ہم دونوں " اے او مچھڑ " ہیں اور ایک دوسرے کی تاک میں رہتے ہیں بات چھیڑ کرلا اسے چلی جائے اسد ...... سے شروع ہوئی اور بائیں ہاتھی دانت اور مچھڑ تک پہنچ گئی اگرچہ ابھی ماسٹر کریلا ، اچھو پہلا ، ڈاکٹر چڑی اور بشیر کھوتا کا تذکرہ باقی ہے لیکن

چونکہ طویل ہے اس لئے کبھی آئندہ سہی...... لیکن یہ بتاتا چلوں کہ شاید لاہور
میں میں واحد شخص ہوں جس کی کوئی چھیڑ نہیں اس لئے کہ میں چڑتا ہی نہیں
...... آپ بے شک جب کبھی مجھے بازار میں جاتا دیکھیں تو پیچھے سے "اوئے او
گنجے" کا نعرہ لگا دیں بالکل برا نہیں مانوں گا صرف آپ کا سر توڑ دوں گا۔



خدا گنجے سے خود پوچھے

یہ انگلستان میں میری پہلی حجامت کا قصہ ہے۔ میں بال کٹوانے کے لئے جب
"ہیئر کٹنگ سیلون" کی آرام دہ کرسی پر دراز ہوا تو اپنے سر پر کھڑے قینچی اور استرے
سے لیس انگریزی نائی کو دیکھ کر یکدم بھونچکا سا رہ گیا۔ بال تو ظاہر ہے میں جھنڈ
اتروانے کے بعد کٹواتا ہی آیا تھا لیکن ایک گورے چٹے' نیلی آنکھوں والے ماؤنٹ
بیٹن کی نسل کے انگریز کو بطور نائی دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا یہ الگ بات کہ
انہی کے ہم وطنوں نے ہندوستان پر قابض ہو کر نائیوں والا کام ہی کیا تھا یعنی
پورے ملک کی حجامت بنا کر ہم سب کو گنجا کر دیا تھا۔ بہرحال اس انگریز نے
میرے چھاج نما گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور کہنے لگا کیا انگلستان
میں نئے نئے آئے ہو؟ میرے اقرار پر بولا تبھی تمہارے بال اتنے گھنے اور چمکیلے
ہیں بس دو چار برس کی بات ہے انگلستان کا دھواں اور نم آلود سرد ہوا تمہارے
بالوں کو ختم کر دے گی۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ بالکل ناممکن ہے کیونکہ ہم
کسان لوگ ہیں سوچتے سمجھتے کم ہیں' لٹھ چلاتے ہیں یا مشقت کرتے ہیں۔ ہم کبھی
گنجے نہیں ہو سکتے...... اس پر وہ عیار حجام مسکرایا اور ایک بجلی کا راڈ گرم
کر کے میرے بالوں میں پھیرنے لگا۔ میں نے پوچھا بال کاٹو گے یا پگھلاؤ گے؟
کہنے لگا۔ تمہارے بال اتنے گھنے ہیں کہ انہیں کاٹنے کے لئے جو اوزار درکار ہیں
وہ بھیڑیں مونڈنے والوں کے پاس تو ہو سکتے ہیں میرے پاس نہیں چنانچہ پہلے

انہیں پگھلا کر کم کروں گا اور پھر کاٹوں گا...... سچی بات ہے مجھے اس پہلی ولائتی حجامت کا لطف نہ آیا۔ پہروں سر جھکائے ایک ایک بال کی تراش خراش اور دیسی حجاموں کی گفتگو اور پھر سر کی مالش کا چکرا دینے والا مرحلہ۔ ان سب کے بغیر کیا لطف آتا اس نے تو دو چار مرتبہ بجلی کی مشین چلا کر تولیہ جھاڑ دیا...... آئینے میں شکل دیکھی تو معلوم ہوا کہ اگرچہ اس کے پاس بھیڑیں مونڈھنے والے اوزار نہ تھے۔ لیکن اس نے حجامت انہی کی طرز پر بنائی تھی۔ میں ایک چھلا ہوا اور گنجا سا "بھیڈو" لگ رہا تھا۔

انگلستان کے حجاموں کے بارے میں میری معلومات اتنی وسیع ہیں کہ میں ان پر ایک کتاب لکھ سکتا ہوں۔ (چونکہ وہاں پر پڑھائی میں دل نہ لگا۔ اس لئے اس قسم کی نادر معلومات جمع کرتا رہا) لیکن یہ پھر کبھی سہی...... بہرحال انگلستان میں قیام کے پانچویں برس اور مارچ کی ۲۰ تاریخ کو جب میں نے اپنے بالوں میں شیمپو کیا تو واش بیسن میں پانی کھڑا ہو گیا کیونکہ میرے سر سے اترنے والے بالوں سے پانی کا پائپ بند ہو گیا تھا...... میں گنجا ہو رہا تھا۔ ان پیارے بالوں کے گچھوں کو یوں اترتے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیا میں بھی گنجا ہو جاؤں گا اور میری "ٹنڈ" دھوپ میں چمکے گی اور بارش کا پہلا قطرہ میری آنکھوں میں آ کر گرے گا؟...... یقین کیجیے میں قدرے آبدیدہ ہو گیا اور فوراً گنجے پن کی روک تھام کے لئے معلومات حاصل کرنے لگا (میں اس پر بھی ایک کتاب لکھ سکتا ہوں) تب کسی نے مشورہ دیا کہ لندن میں ایک "ایکر ہیئر کلینک" ہے۔ جہاں سے گنجے اپنے سر کے بال پاتے ہیں اور وہاں سے علاج کے بعد کوئی آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا...... اس کلینک کے انتہائی فیشن ایبل اور خوشبودار ماحول میں ایک ماہر امراض گیسو نے میرے بالوں اور کھوپڑی کا معائنہ کیا۔ مختلف قسم کے تیزابی مادے انڈیل

کر پوچھا کہ ٹھنڈے لگتے ہیں یا گرم۔ میں نے کہا نہ ٹھنڈے نہ گرم بس لگتے بہت ہیں اور میری کھوپڑی جل رہی ہے۔ وہ ماہر بے حد خوش ہوا کہنے لگا۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہاری کھوپڑی بے جان نہیں ہے۔ تم صرف دس ٹریٹ منٹ لے لو ٹھیک ہو جاؤ گے اور ہاں یہ ہے کہ وہ خاص برش اور کنگھی جو آج سے تم استعمال کرو گے اور یہ صابن اور یہ شیمپو...... اور یہ ہیئر کنڈیشنر اب ہمارے ہیئر کیئر ڈیپارٹمنٹ میں جا کر پہلا ٹریٹ منٹ لے لو......

ہیئر کیئر ڈیپارٹمنٹ کیا تھا جنت کا کوئی گوشہ تھا۔ مقابلہ حسن کا کوئی سٹیج تھا...... انتہائی دیدہ زیب اور نوخیز خواتین مختلف قسم کے گنجوں اور نیم گنجوں کے سروں پر "چمپی" کر رہی تھیں۔ اور ان میں کچھ ایسے غیر ملکی بھی تھے جو بالکل گنجے نہیں تھے۔ بہرحال مجبوراً میں نے بھی ایک نازنین کے آگے سر جھکا دیا۔ اس نے میرے نسخے کے مطابق میرے سر میں کچھ مشینیں وغیرہ چلائیں۔ دو چار ہاتھ چلائے اور فارغ کر دیا اور اس دوران یہ معلومات بھی بہم پہنچائیں کہ ان دنوں فلاں کلب میں افریقی رقص ہو رہا ہے اور فلاں جگہ وائن بہت عمدہ ملتی ہے اور یہ کہ میری شام اتنی مصروف نہیں ہوتی...... کلینک سے باہر آتے ہوئے جب میری خدمت میں ماہر امراض گیسو کے معائنے۔ آلات بال اگاؤ اور ایک ٹریٹ منٹ کا بل پیش کیا گیا تو میں نے بجائے وہاں واپس آنے کے اور مزید علاج کرانے کے، اپنے آپ کو گنجا ہو جانے کے لئے تیار کر لیا...... اتنی رقم سے میں ایک ماہ کے لئے یورپ کی سیر کر سکتا تھا اور اس کے علاوہ میں نے سوچا کہ آخر کار لوگ وگیں بھی تو لے لیتے ہیں ہم بھی لے لیں گے وطن واپسی ہوئی تو یہاں کے گرم اور پسینہ لانے والے موسموں نے میرے ٹھٹھرتے ہوئے مردہ بالوں کو ایک نئی زندگی بخشی اور میں گنجا ہونے سے بال بال بچ گیا۔ البتہ میں حیرت میں تب مبتلا ہوا جب میں نے یہ دیکھا کہ موزوں موسم کے باوجود اس ملک

میں بھی گنجے وافر مقدار میں موجود ہیں ان میں سے کچھ تو اصلی گنجے تھے اور بیشتر کو حالات نے گنجا کر دیا تھا یہ بھی معلوم ہوا کہ گنجا پن دولت اور دانشوری کی نشانی ہے۔ الحمدللہ میں ان دونوں سے محروم ہوں اس لئے میرے گنجے ہونے کا امکان بالکل نہیں ہے۔ میں مزید حیرت میں تب مبتلا ہوا جب یہ پتہ چلا کہ پاکستان میں جہاں ہر قسم کی امراض کے ماہر اور ایکسپرٹ پائے جاتے ہیں، "وہاں بال کی کھال کلینک" قسم کا کوئی ادارہ نہیں، جو گنجے پن کی روک تھام کے لئے موثر اقدام کر سکے اس ادارے کی سربراہی کے لئے متعدد ادیب دوستوں کے نام تجویز کیے جا سکتے ہیں جو میں نہیں کر رہا کیونکہ میں نے عرض کیا تاکہ وہ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ میرے دوست بھی ہیں اور شنید ہے کہ داتا گنج بخش کے مزار پر بہت جایا کرتے تھے چنانچہ مکمل طور پر بخشے گئے ...... کہا جاتا ہے کہ موت اور گنجے پن کا علاج ممکن نہیں۔ ہمارے گنجے یاروں نے انڈوں کے لیپ، پان کے پتوں کی گرمی، خمیرہ گاؤزبان، ولائتی ہیئر کنڈیشنر سب کچھ استعمال کیا جس سے "ٹنڈ" میں مزید چمک تو پیدا ہو گئی، بال پیدا نہ ہوئے۔ اب تو یہی ہے کہ روز حشر جب خدا گنجے سے خود پوچھے گا کہ بتا تیری رضا کیا ہے تو وہ کہے گا "بال"...... لیکن انہی دنوں ادھر انگلستان سے ہی ایک ایسی خبر آئی ہے کہ گنجوں کو روز حشر کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا اور اس خبر کو آپ تک پہنچانے کے لئے ہی میں نے اپنی لمبی چوڑی تمہید باندھی ہے۔ خبر ملاحظہ کیجئے۔

لندن ۱۱ مارچ (ن ر) ایک گائے جو "جنگلی گلاب" کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ ایک کسان کا سر چاٹ کر اس کے گنجے پن کا علاج کر رہی ہے۔ خلیج ٹائمز کے مطابق ۵۶ سالہ گنجے آدمی جان کو مز نے جو جنوب مغربی انگلستان میں سالسبری کے قریب کاشت کاری کرتا ہے بتایا ہے کہ گنجے پن کے اس نئے علاج کا انکشاف

اسے اس وقت ہوا جب اس کی گائے نے ایک روز اس کی گنجی کھوپڑی پر لگی ہوئی چارے کی دھول کو چاٹا چند ہفتے گائے نے اس کے سر کو چاٹنے کا یہ عمل جاری رکھا جس کے بعد اس نے دیکھا کہ اس کے سر کے بال اگنے شروع ہو گئے ہیں جو کئی سال سے گنجا تھا۔

چنانچہ تمام گنجے حضرات کو رب کا شکر ادا کرنا چاہیئے جس نے ان کے لئے گائے بنائی لیکن اس میں ایک قباحت یہ ہے کہ ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ کیا گنجا پن تمام گائیوں کے چاٹنے سے دور ہو جاتا ہے یا یہ خصوصیت صرف انگلستان میں پائی جانے والی "جنگلی گلاب" نامی گائے میں ہی پائی جاتی ہے۔ بال اگاؤ صنعت صرف اسی گوری گائے میں موجود ہے تو پھر اسے فی الفور درآمد کر کے ملکی گنجوں کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرنا چاہیئے۔ ہماری امپورٹ پالیسی میں اگر "جنگلی گلاب" گائے کو درآمد کرنے کے لئے کوئی شق موجود نہ ہو تو پھر روز حشر کا انتظار کیجئے۔ جب خدا گنجے سے خود ہی پوچھے گا کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟

مَیں لوٹا نہیں ہوں

ان دنوں ٹی ہاؤسوں اور ادبی محفلوں میں ایک ہی موضوع زیرِ بحث ہے اور وہ ہے الیکشن اکثر ادیب پچھتا بلکہ تلملا رہے ہیں کہ انہوں نے الیکشن لڑنے کے لئے کاغذات نامزدگی کیوں نہ داخل کروا دیئے اس پچھتاوے اور تلملاہٹ کا سبب الیکشن میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں اور اداکاروں کی غیر متوقع پذیرائی ہے البتہ ہمارے بزرگ ادیب حضرت خلیفہ خلفشاری (نام فرضی ہی سمجھا جائے) نہ پچھتا رہے ہیں نہ تلملا رہے ہیں بلکہ سکھ چین کی بنسی بجا رہے ہیں میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگے میں نے جان بوجھ کر کاغذات نامزدگی داخل نہیں کروائے......

میں نے اس کا بھی سبب پوچھا تو قریب ہو کر بولے میں انتخابی نشان کا رسک نہیں لینا چاہتا......

"انتخابی نشان؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں" وہ کہنے لگے "پہلے تو ارادہ تھا لیکن پھر ایک روز اخبار میں قومی و صوبائی اسمبلیوں کے امیدواروں کے نشانات کی تصویریں دیکھیں تو ارادہ بدل دیا.... دیکھو بھئی میں اس عمر میں آ کر لوٹا نہیں ہو سکتا"۔

"لوٹا خلیفہ خلفشاری؟"

"بالکل درست فرمایا آپ نے..... اگر مجھے لوٹے کا نشان الاٹ ہو جاتا تو میں کیا ہوتا! خلیفہ خلفشاری لوٹا..... اسی طرح میں "گلاس" نہیں ہونا چاہتا تھا

خلیفہ چاقو نہیں کہلانا چاہتا تھا۔ خلیفہ گھڑا، خلیفہ انگوٹھی، خلیفہ مٹکا، خلیفہ غلیل، خلیفہ رندہ، یا خلیفہ لیٹر بکس وغیرہ کے نام سے نہیں پکارا جانا چاہتا تھا....."

میں نے کہا "خلیفہ جی..... مختلف امیدواروں کو مختلف نشانات الاٹ ہوتے ہیں آپ اپنی پسند کا کوئی نشان بھی تو مانگ سکتے تھے"۔

کہنے لگے "ہاں..... اگر میں عوام الناس میں سے ہوتا تو کچھ بھی مانگ لیتا لیکن تم جانتے ہو ادیب برادری کو میرا جو بھی نشان ہوتا اس کے کچھ نہ کچھ الٹ پلٹ معانی نکال لئے جاتے اس لئے میں نے باہر بیٹھنے میں ہی عافیت جانی البتہ میں نے مختلف ادیبوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے کہ اگر وہ الیکشن میں حصہ لیتے تو کون کون سے انتخابی نشان ان کی شخصیتوں کی صحیح عکاسی کرتے....."

اب میرے دل میں کھد بد شروع ہوئی کہ جانے خلیفہ نے میرے لئے کونسا انتخابی نشان چنا ہے چنانچہ میں نے پوچھا "یار خلیفہ..... وہ...... بھلا کون کون سے ادیب ہیں اور ان کے انتخابی نشان کونسے ہیں؟"

خلیفہ خلفشاری نے اپنے بیگ سے فہرست نکالی اور پڑھنے لگا۔

اشفاق احمد عرف تلقین شاہ کے لئے "ریڈیو"

کشور ناہید کے لئے "سلائی کی مشین" عورت ذات کے لئے یہی مناسب ہے۔

انتظار حسین صاحب "رہٹ" ہوں گے۔ انہیں ٹیوب ویل سے الرجی ہے

انور سجاد کے لئے "برش" بہتر رہے گا مصور بھی تو ہیں۔

ذوالفقار احمد تابش "پہاڑ" وہ جوگی ہیں جو پہاڑ سے اتر آئے ہیں۔

اصغر ندیم سید کے لئے "لاؤڈ سپیکر" اسے بولنے کا بہت شوق ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر تو ظاہر ہے سائیکل ہی ہوں گے۔

رحیم گل خان کے لئے "گلہ"

سلمان بٹ "سکوٹر"......

احمد ندیم قاسمی وہ "پل" ہیں جو نئی اور پرانی نسل کے درمیان کھڑے ہیں۔

اسرار زیدی "پنسل"...... لکھتے جو رہتے ہیں۔

نجیب احمد "تانگہ"...... لیکن گھوڑے کے بغیر

انور سدید "لیٹر بکس"...... دوستوں اور اخباروں کو خط لکھنے میں مزید آسانی ہو گی۔

اظہر جاوید "تتلی"...... چونکہ انتخابی نشانوں میں "بھنورا" نہیں ہے اس لئے۔

امجد اسلام امجد "کنگھی"......

انیس ناگی "آری"... جو کاٹتی چلی جاتی ہے۔

جاوید شاہین "چارپائی" جہاں جاتے ہیں لیٹ جاتے ہیں۔

وزیر آغا "ٹریکٹر"......

ڈاکٹر آغا سہیل "کار" جو وہ چلا نہیں سکتے۔

مسعود اشعر "عینک"

سراج منیر "تیر" جو نشانے پر جا لگا ہے۔

زاہد ڈار "کتاب"

بانو قدسیہ "چرخہ" جس پر ڈرامے کاتتی ہیں۔

خلیفہ خلفشاری نے فہرست اپنی جیب میں ڈالی اور اٹھ کر جانے لگا......

"یار خلیفہ...... اس میں میرا نام نہیں ہے؟"

"اچھا اچھا" خلیفہ قدرے شرمندہ ہو کر بولا "یار ادیب تو شاید تم بھی ہو...... میں دراصل تمہیں اب تک اداکار سمجھتا رہا...... بہرحال چند ایک نشانات باقی ہیں ان میں سے کوئی ایک سا پسند کرو...... مثلاً "ماچس" کیسا ہے؟"

"ماچس کا مجھ سے کیا تعلق؟"

"وہی جو "ماچس ہو گی آپ کے پاس" کے ساتھ ہے"

"بہت پرانی بات ہے اس کے علاوہ؟"

بھئی اس کے علاوہ تم "قینچی" ہو سکتے ہو......

"غلیل" بھی باقی ہے "کلہاڑہ" کیسا رہے گا......

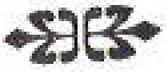
"آری" اور "ہینڈ پمپ" پسند ہیں؟ تم "گھڑا" بھی ہو سکتے ہو"

"نہیں ان میں سے کوئی بھی پسند نہیں"

"تو پھر ایک ہی باقی بچا ہے"

"وہ کونسا"

خلیفہ خلفشاری بڑی سنجیدگی سے بولا "لوٹا"



میں بھی قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں

امیتابھ سنیل دت وجنتی مالا محمد قوی عنایت حسین بھٹی منصور بلوچ اور سرفراز نواز نے مل جل کر میری ازدواجی زندگی تباہ کردی ہے میرا گھریلو سکون برباد ہو چکا ہے اور میری اہلیہ محترمہ دن رات میرے کان کھاتی رہتی ہیں آج صبح ناشتے کی میز پر خوشگوار گفتگو کا آغاز کچھ اس طرح ہوا۔

"تو پھر تم نے کیا سوچا؟"

"کس کے بارے میں؟"

"الیکشن کے بارے میں اور کس کے بارے میں"

"میں نے کیا سوچنا ہے الیکشن ہو رہا ہے اچھی بات ہے.... میں الیکشن کے حق میں ہوں۔"

"کیا تم ہمیشہ اتنے ہی احمق رہو گے؟"

"زیادہ ہونے کی گنجائش نہیں۔"

"میں پوچھتی ہوں تم نے الیکشن میں کھڑے ہونے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

میں نے اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور چائے کا آخری گھونٹ بھر کر اہلیہ محترمہ کی جانب دیکھا جو اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھیں "دیکھو بیگم یہ میرا شعبہ نہیں ہے۔"

"ان کا شعبہ ہے جو کھڑے ہو رہے ہیں؟"

"ان کے بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"پھر کیا سوچا ہے؟"

"لیکن بیگم مجھ میں ہے کیا جو میں الیکشن میں کھڑا ہو جاؤں؟"

"تم میں کیا نہیں ہے، وہ سب کچھ ہے جو امیتابھ سنیل دت سرفراز نواز اور وجینتی مالا میں ہے۔"

میں قدرے نروس ہو گیا کہ مجھ میں وہ کیا ہے جو وجینتی مالا میں بھی ہے..... البتہ زندگی میں پہلی مرتبہ میری بیگم نے مجھے کسی قابل سمجھا تھا اس لئے میں غور سے سنتا رہا۔

"دیکھو تم بھی مشہور ہو لوگ تمہیں جانتے ہیں ٹیلی ویژن پر آتے ہو کتابیں لکھتے ہو کالم لکھتے ہو آخر یہ سب فضول کام کس دن تمہارے کام آئیں گے...... فائدہ اٹھاؤ۔"

"فرض کرو میں الیکشن میں کھڑا ہو جاتا ہوں تو پھر میں اپنے ووٹروں کو جا کر کیا کہوں گا...... یہ کہ میرا چہرہ دیکھو میری کتابیں اور کالم پڑھو..... یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

"نہیں نہیں تم بھی کہنا کہ میں قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ تو میں کر رہا ہوں۔"

"اوہو یہ خدمت تو یک طرفہ ہے...... دوسری طرف سے تمہاری خدمت بھی ہونی چاہیے۔"

"وہ کس طرح"

"الیکشن میں کھڑے ہو کر..... ان لوگوں کا دماغ تو نہیں خراب کہ اپنے کیریئر چھوڑ کر سیاست میں آ رہے ہیں کچھ نہ کچھ تو فائدہ ہوگا...... اچھی طرح سوچ لو یہ سنہری موقع دوبارہ نہیں آئے گا۔"

"کیوں دوبارہ الیکشن نہیں ہوں گے؟"

ہوں گے لیکن یہ جو رواج ہو گیا ہے ناں اداکاروں وغیرہ کو ووٹ دینے کا یہ دوبارہ نہیں ہو گا،،

"اور میں تو ادیب سا ہوں"

"خبردار جو ووٹرں کو یہ بتایا کہ تم پڑھتے لکھتے ہو...... برا اثر پڑے گا ہمیں پڑھے لکھے لوگوں کی نہیں مشہور لوگوں کی ضرورت ہے جن کی تصویریں ہم اخباروں میں دیکھتے ہیں ؛ بس تم اللہ کا نام لے کر اعلان کر دو"

"کس قسم کا اعلان"

"یہی کہ میں پہلے اخباروں اور کتابوں...... نہیں نہیں یہ تو پڑھائی لکھائی کی باتیں ہیں یہی کہ میں پہلے ٹیلی ویژن پر قوم کی خدمت کرتا تھا لیکن وہاں بیٹھ کر اچھی طرح سے خدمت نہیں ہوتی تھی اس لئے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ میں میدان عمل میں کود کر اپنے آپ کو ملک اور قوم کے لئے وقف کر دوں"

"اگر میں اپنے آپ کو ملک اور قوم کے لئے وقف کر دوں گا تو پھر گھر کا خرچ کیسے چلے گا......؟"

"یقین کرو اس سے بہت بہتر چلے گا جس طرح کہ چل رہا ہے...... میں یہاں آس پاس کی خواتین کو جمع کر کے "محاذ برائے تارڑ" بنا لوں گی اور تم اپنے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر سارا دن شہر میں گھومتے رہنا اور لوگوں کے نعروں کا جواب ہاتھ ہلا کر دینا"

"ہاتھ ہلاؤں گا تو موٹر سائیکل سے گر پڑوں گا...... اور بیگم مجھے ووٹ کون دے گا...؟"

"یہ جو کالے منہ والیاں تمہیں دیکھ دیکھ کر ہنستی ہیں وہ دیں گی یہ طالب علم دیں گے جو ہر وقت تمہارا دماغ کھاتے رہتے ہیں"

یہ سب اکیس سال سے کم عمر کے ہیں...... ان کے علاوہ؟"

بیگم نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہنے لگیں "اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے جو تمہیں ووٹ دیں گے تم اللہ کا نام لے کر اعلان کر دو"

تو خواتین و حضرات میں بھی الیکشن میں کھڑے ہونے کا اعلان کرتا ہوں اب آپ کی عزت میرے ہاتھ میں ہے...... میرا مطلب ہے میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے اور چونکہ نیت تو میری یہی ہے کہ میں قوم اور ملک کی خدمت کروں لیکن مجھے کچھ ٹھیک سے معلوم نہیں کہ یہ خدمت کیسے کی جاتی ہے اس لئے آپ میری مشکل حل کیجئے اور اپنے گراں قدر مشوروں سے مجھے نوازیئے میرا نام تو آپ کو یاد نہیں رہے گا کیونکہ ذرا مشکل ہے اس لئے صرف میری شکل یاد رکھئے یہ شکل اتنی اچھی تو نہیں ہے کہ اسے یاد رکھا جائے لیکن اگر آپ عنایت حسین بھٹی اور منصور بلوچ کو یاد رکھ سکتے ہیں تو میرے لئے بھی زحمت کر لیجئے گا کہا یہ جا رہا ہے کہ صرف وہ اداکار الیکشن میں حصہ لے رہے ہیں جو ڈاؤن اینڈ آؤٹ ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں اور پبلک ان کو دیکھ دیکھ کر تنگ آ چکی ہے اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ انہیں ووٹ دے کر فلم اور ٹیلی ویژن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت کر دیا جائے...... یہ بالکل غلط پروپیگنڈا ہے سرفراز نواز کو دیکھئے وہ چاہتے تو ستر سال کی عمر تک کرکٹ کھیل سکتے تھے کیونکہ انہیں منع کر کے کسی نے مار کھانی ہے محمد قوی بھی ہمیشہ پولیس کی وردی میں رہ سکتے ہیں عنایت حسین بھٹی کا "محبت کا جنازہ جا رہا ہے" اب بھی جا رہا ہے اور کیا خوب جا رہا ہے...... معاف کیجئے گا میں جوش الیکشن میں اپنے حریفوں کا دفاع کئے جا رہا تھا۔ دراصل تجربہ نہیں ہے ناں آہستہ آہستہ وہ بھی ہو جائے گا فی الحال میرے اعلان پر گزارہ کیجئے اور ملک و قوم کی خدمت کرنے کے نسخے مجھے ارسال کر دیجئے۔ شکریہ!

آستینوں کے بُت

قدیم بدھ درسگاہ جولین کے کھنڈرات دیکھنے کے بعد ہم عہد رفتہ کے ایک عظیم شہر سری کپ کی پتھریلی دیواریں دیکھنے کے لئے گئے داخلے کے بورڈ پر ٹکٹ کی شرح درج تھی۔ میری بیوی نے بچوں اور بڑوں سمیت سب کو گنا پھر اپنے بٹوے میں جھانکا اور بولی "پہلے ٹیکسلا عجائب گھر...... بیس روپے، پھر جولین کے کھنڈرات...... بیس روپے اور اب یہ سری کپ کے پتھر...... کم از کم میں ان پتھروں کے ڈھیر کے لئے مزید بیس روپے خرچ نہیں کر سکتی ابھی میں نے ٹیکسلا کی سوغات پتھر کی کونڈی بھی خریدنا ہے"...... میں نے اسے سمجھایا کہ نیک بخت یہ صرف پتھر نہیں ہیں ایک قدیم شہر ہے...... اس کی تاریخ ڈھائی ہزار سال پیشتر شروع ہوئی اور مہاتما بدھ......"

"بس بس...... مہاتما بدھ بہت ہو چکا، پہلے اندلس کی تاریخ سنا سنا کر میرے کان پکائے ہیں اور اب مہاتما بدھ کے پیچھے پڑ گئے ہو۔"

میں بے حد ملول ہوا کہ یہ بی بی تاریخی شعور سے یکسر عاری ہے اور سر کپ کا شہر دیکھنے کی بجائے اپنے باورچی خانے کے لئے پتھر کی کونڈی خریدنا چاہتی ہے۔ بہر حال میں نے ایک اور کوشش کی "سر کپ کا شہر اتنا ہی اہم تھا جتنا کہ آج کا نیو یارک لنڈن، ٹوکیو یا لاہور......"

"اچھا تو کیا سری کپ میں رہنے والی گھریلو خواتین کے باورچی خانے میں مصالحہ پیسنے کے لئے پتھر کی کونڈیاں نہیں ہوتی تھیں؟ مجھے سری کپ نہیں چاہئے۔ کونڈی چاہئے۔

اگر کھنڈر دیکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو یہ سامنے والے ٹیلے پر چڑھ کر نگاہ ڈال لو اندر ضرور جانا ہے"...... جیسا کہ تمام حضرات جانتے ہیں بیویوں کو تاریخی شعور یا کسی بھی قسم کا شعور دینا خاوندوں کے لئے ناممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ میں ایک پالتو جانور کی طرح کان لپیٹ کر ٹیلے پر چڑھنے لگا...... وہ درست کہتی تھی یہاں سے سری کپ کے وسیع کھنڈرات نظر آ رہے تھے...... ٹیلے پر ایک نوجوان چرواہا اپنی بھیڑوں سے غافل کھنڈروں میں گھومنے والی سیاح خواتین کو دیکھ رہا تھا...... تب میں نے دیکھا کہ ایک غیر ملکی جوڑا باہر آیا اور ایک کمبل پوش مقامی نوجوان ان کی جانب بڑھا۔ اس نے ایک چور کی طرح ارد گرد احتیاط کی ایک نگاہ ڈالی اور پھر اپنے کمبل میں سے ایک چھوٹا سا مہاتما بدھ برآمد کر کے جوڑے کے سامنے پیش کر دیا وہ متاثر ہوئے بغیر آگے چلتے رہے۔ اور نوجوان اپنے کمبل میں سے مجسمے نکال نکال کر انہیں دکھاتا رہا لیکن ایک وقت میں صرف ایک مجسمہ۔ غیر ملکی جوڑا کوئی بھی مجسمہ خریدے بغیر اپنے تانگے پر سوار ہوا اور جولین کی جانب روانہ ہو گیا۔

میں ٹیلے سے نیچے آیا اور کمبل پوش کے پاس چلا گیا "کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے" اس نے بے رخی سے کہا اور چلنے لگا۔

"یار بات سنو" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا ہے؟" وہ پریشان ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کمبل میں تھے۔

"تمہاری آستینوں میں بت ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں صاحب جی...... ہم تو مسلمان لوگ ہیں، توبہ توبہ بت فروش تو نہیں"

"یہ کمبل کے اندر آستینوں میں کیا ہے؟......"

"آپ کوئی افسر ہیں......؟" وہ بے حد گھبرا گیا۔

"نہیں نہیں" میں نے اسے دلاسا دیا "دراصل میں بھی بت بیچتا ہوں......

بتوں کا سوداگر ہوں۔ ذرا دکھاؤ تو سہی تمہاری آستین میں کیا ہے..... اصلی ہیں یا نقلی؟"

"یہ تو نقلی ہیں" وہ ہڑبڑا کر بولا "اصلی تو گھر پر ہیں۔"

"گھر کہاں ہے؟"

"وہ سڑک کے پار جو گاؤں ہے وہاں....."

میں نے میجر جنجوعہ سے کہا کہ وہ بچہ لوگ کو لے کر ٹیکسلا چلا جائے اور میری بیوی کو پتھر کی کونڈی خرید دے میں پہنچ جاؤں گا۔

کمبل پوش کا گھر نہایت صاف ستھرا تھا۔ پرچھتیوں پر جاپانی ڈنر سیٹ اور چینی ٹی سیٹ سجے تھے۔ کونے میں ٹیلی ویژن تھا اور شاید رنگین تھا۔ اس نے مجھے ایک صوفے پر بٹھایا۔ دروازے کی چٹخنی چڑھائی اور پھر فرش پر ایک سفید چادر پھیلا دی۔

"صاحب جی اصلی پیش کروں یا نقلی....."

"دونوں" میں نے کہا۔ اس نے ایک بڑے سارے نواری پلنگ پر بچھی چادر کا کنارا اٹھایا اور اس کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک مجسمہ باہر نکالا۔ پھر دوسرا..... پھر تیسرا دو تین مہاتما بدھ تھے۔ چند یونانی خدوخال کے سر تھے۔ ایک ٹوٹا ہوا ہاتھ تھا۔ ایک گنگھو گھوڑا اور چند سکے....."

"نقلی کون سے ہیں؟" اس نے چند مجسمے اٹھا کر دکھائے میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ ان کی تراش خراش ہو بہو قدیم مجسموں کی سی تھی۔ البتہ ایک آدھ آنچ کی کسر بغور دیکھنے سے ظاہر ہو جاتی تھی۔ مثلاً ایک میں مہاتما بدھ تقریباً ہنس رہے تھے۔ یا ان کا ایک کان دوسرے سے لمبا ہو گیا تھا کمبل پوش انہیں گاؤں والوں سے چھپ کر بناتا تھا اور پھر کسی خاص تیزاب میں ڈبو کر انہیں "قدیم" کر لیتا تھا۔ پھر کناروں سے توڑا..... مٹی میں دبایا اور مجسمہ تیار۔ میں نے اس سے پوچھا کہ

وہ اصلی قدیم بت کہاں سے حاصل کرتا ہے کہنے لگا "صاحب جی بس یہ تو کاروبار کا راز ہے ویسے زیادہ تر پشاور اور سوات کے علاقے سے مال خرید کر لاتا ہوں۔ ٹوٹا پھوٹا۔ پھر اسے خود جوڑتا ہوں اور مرمت کر کے بیچ دیتا ہوں۔" میں نے کہا کہ بھائی میرے یہ کاروبار تو غیر قانونی ہے۔ ایسا کیوں کرتے ہو؟ کہنے لگا صاحب جی میں کوڑا کرکٹ جمع کر کے محنت کرتا ہوں اور چار پیسے بنا لیتا ہوں۔ کاروبار تو بڑے لوگ کرتے ہیں اور سب کے سامنے کرتے ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ بڑے مجسمے افسروں کے گھر چلے جاتے ہیں۔ میں تو پتھروں کے ٹکڑے لا کر جوڑ لیتا ہوں..."

کمبل پوش کے بنائے ہوئے قدیم مجسموں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ وہ شہر میں ہوتا تو آرٹس کالج میں لیکچر دیتا اور بت تراش کہلاتا۔ یہاں پر آستینوں میں بت چھپائے پھرتا ہے۔ گھر سے باہر آتے وقت اس نے پوچھا کہ صاحب جی آپ بھی تو بت بیچتے ہیں؟ اصلی یا نقلی؟..... میں نے کہا، میرا سارا مال نقلی ہے..... لفظوں سے بت بناتا ہوں اور پھر انہیں سفرناموں، افسانوں، ڈراموں اور کالموں کی صورت بیچنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن مقابلہ بڑا سخت ہے۔ وہاں شہر میں ایک سے ایک بڑا بت فروش پڑا ہے..... جو اپنے بت فروخت کرے، اس کے اصلی اور جو نہ کر سکے اس کے نقلی..... بقول تمہارے کوڑا کرکٹ اور پتھر کے ٹکڑے...

کمبل پوش نے خدا حافظ کہنے سے پیشتر اپنی آستین میں سے ایک بت نکالا اور کہنے لگا "صاحب جی یہ لے جاؤ، میری طرف سے..... اصلی ہے۔"

میں نے کہا "نہیں..... ادھر شہر میں ہزاروں بت بنے ہوئے ہیں..... کچھ بن بیٹھے ہیں۔ اس ہجوم میں تمہارا اصلی بت بہت اکیلا محسوس کرے گا..... رہنے دو۔"

میں ٹیکسلا واپس آیا تو میری بیوی پتھر کی کونڈی اور چند گملے خرید چکی تھی اور ہم واپس اسلام آباد روانہ ہو گئے۔

پکنک شرقپور اور چور بیگمات

دریائے راوی کا پل عبور کیا لاہور شیخوپورہ روڈ کی سائیکل فیکٹریوں کے ہجوم بسوں، ٹریکٹر، ٹرالیوں اور ویگنوں کے پر شور جنگل میں سے بچتی بچاتی شاہ کی موزدکی کار جب شرقپور جانے والی چھوٹی سڑک پر آئی تو یک دم وہ پریشان سا ہوا اور سٹیرنگ پر ہاتھ مار کر بولا "چودھری صاحب"

میں نے کہا "جی شاہ صاحب"

کہنے لگا "میرے کان بند ہو گئے"

"کان بند ہو گئے مجھے نہیں معلوم تھا کہ دماغ کے علاوہ تمہارے کان بھی کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں"

اب میں نے بھی غور کیا تو احساس ہوا کہ واقعی ہر سو ایک پراسرار قسم کی خاموشی تھی سردیوں کی نگھی دھوپ تھی اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

ایک گدھا گاڑی کو سڑک پر آتا دیکھ کر شاہ جی نے ہارن دیا "یار یہ ہارن تو سنائی دیتا ہے..... اور کچھ سنائی نہیں دیتا"

پچھلی نشست پر ہم دونوں کی بیگمات جو آس پاس سے لاتعلق اچھرہ میں فروخت ہونے والی انتہائی ارزاں اون کے بارے میں ایک عالمانہ گفتگو کر رہی تھیں خاموش ہو گئیں۔

"یہ تو اسی قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں کرتے رہتے ہیں، بھائی جان لیکن آپ کو کیا ہو گیا ہے آپ تو شاعر نہیں ہیں" بیگم شاہ نے کہا۔

"شاعر تو نہیں ہوں لیکن شاعر کے پہلو میں بیٹھا ہوں اس لئے اثر تو ہو جاتا ہے..... ویسے بھابھی آپ کو کچھ سنائی دے رہا ہے؟"

اس کا جواب ہماری بیگم نے دیا کہنے لگیں "اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کے لئے شاعر ہونا ضروری نہیں...... یہ بھی اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں..... ویسے آپ لوگوں کی اطلاع کے لئے عرض ہے لاہور اور شاہدرہ روڈ کے شور کے بعد یہاں بالکل سکون ہے اس لئے آپ کے کان نہیں بج رہے"

"واللہ میمونہ بیگم تم بالکل درست کہتی ہو" میں اپنی بیگم کی عقلمندی پر نڈھال ہو گیا "شہر کے شور و غوغا کے بعد شرقپور روڈ کا سکون ہمیں راس نہیں آیا تھا اور ہم یہ سمجھے کہ ہمارے کانوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے....."

"میں بھی مزاق کر رہا تھا" شاہ صاحب بولے "لیکن یار اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان پُرسکون فضاؤں کے لئے پیدا کیا ہے تو ہمارے اعصاب اتنے شور و غل میں جواب کیوں نہیں دے جاتے؟ اس وقت صرف گاڑی کے انجن کی ہلکی ہلکی آواز ہے ہوا کا خاموش شائبہ ہے کبھی کبھار مخالف سمت سے کوئی گاڑی آتی ہے اور چلی جاتی ہے..... شہر میں ہم کس عذاب میں رہتے ہیں"

"مائی ڈیئر شاہ جی یہ عذاب تو ہم نے اپنے لئے خود چنا ہے بلکہ ہمارے والد صاحبوں نے چنا ہے جو گاؤں سے اٹھے اور بہتر مستقبل کی خواہش میں شہروں میں آن بسے اب ہم واپس اسی سکون کو لوٹنا چاہتے ہیں تو بندہ سکون اور بہتر مستقبل میں سے ایک کو ہی چن سکتا ہے" "خاک بہتر مستقبل" شاہ جی بولے "شہر نے ہمیں کیا دیا ہے"

"شہر نے ہمیں کیا دیا ہے؟" بیگم شاہ نے ڈانٹ پلائی "کمال ہے۔ یہ شہر کی وجہ سے تم اس وقت اپنی کار پر سفر کر رہے ہو ورنہ کسی گدھے پر سواری کر

رہتے ہوتے کالج میں پڑھاتے ہو فنکشنوں میں مضمون پڑھتے ہو ٹیلی ویژن کے لئے کبھی کبھار لکھتے ہو..... یہ سب کچھ شہر کی وجہ سے ہی تو ہے۔"

"ہاں" شاہ جی نے سر ہلایا "لیکن کنٹری سائیڈ کی کیا بات ہے میرا تو جی چاہتا ہے کہ ادھر شرقپور روڈ پر کچھ زمین لے لوں اور کاشتکاری شروع کر دوں اور دوپہر کا کھانا کیا کہتے ہیں اسے ؟ ہاں بھتہ تم لے کر آؤ۔"

"پھر شادی بھی کسی گنوار سے کریں جو بھتے اٹھانے والی ہو" بیگم شاہ نے چمک کر کہا۔

"یہ بھی ہمیشہ شکایت کرتے رہتے ہیں" میری بیگم نے گرہ دی۔ "کہتے ہیں میں تو شہر سے تنگ آ گیا ہوں میں کہتی ہوں کہ آپ تنگ آ گئے ہوں میں تو شہر کی رہنے والی ہوں اور یہیں رہوں گی۔"

"اچھا" بیگم شاہ نے خوش ہو کر کہا "آپ بھی شہر کی ہیں ؟ میں بھی شہر ہی میں پلی بڑھی ہوں ؟"

"پلی زیادہ ہے اور بڑھی کم ہے" شاہ جی نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا "چپ کرو تم....." بیگم شاہ غصے میں آ گئیں "تم شکر کرو کہ تم جیسے پینڈو کو ایک پڑھی لکھی سلیقہ شعار شہری بیوی مل گئی کسی پینڈو بیوی کو اپنے شعر سناتے تو چھٹے سے مرمت کرتی....."

"میری بیگم بھلا کہاں چپ رہنے والی تھی اس نے بیگم شاہ کی شہ پا کر مجھ پر چڑھائی کر دی" اور تم بھی اللہ کا شکر کرو کہ میں تمہارے نصیب میں تھی ورنہ ادھر ضلع گجرات کی کسی ان پڑھ جٹی سے بندھ جاتے تو وہ اشاعت سے پیشتر ہی تمہارے کالم سفر نامے اور افسانے سنتی ؟ ٹیلی ویژن کی وجہ سے یہ جو چڑیلیں تمہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بے شرمی سے دیکھتی ہیں ان کے بال نہ نوچ لیتی..... میں تو چپ رہتی ہوں"

بات کہیں سے کہیں نکل گئی تھی۔

شرقپور روڈ کے آس پاس ہریاول کا رنگ تھا سبز کھیت درخت اور سرسوں کے پیلے پھول۔

"یار گاڑی روکو" میں نے شاہ سے کہا۔

"کیوں چودھری..... ضروری ہے ؟"

"ہاں بہت ضروری ہے"

اس نے گاڑی روکی اور میں سڑک سے اتر کر سرسوں کے پیلے کھیت کے کنارے جا کھڑا ہوا "اچھا تو یہ ہے سرسوں اور اس کی پیلاہٹ..... بہت عرصہ ہوا اسے دیکھے ہوئے اور اس کی باس کو نتھنوں میں محسوس کئے ہوئے" میں نے ایک طویل سرسوں بھرا سانس اپنے اندر کھینچا شاہ جی نے سگریٹ سلگا لیا اور ایک ٹیلے پر بیٹھ گئے ہماری بیگمات اپنے قیمتی کپڑوں ایڑھی کے شوز سمیت کھیت کے اندر گھومنے لگیں ہم طویل قید میں رہنے والے جانور تھے جو چند لمحوں کے لئے آزاد ہوئے تھے کھیت میں سے ایک مزدور برآمد ہوا جس نے حیرت سے دیکھا اور کدال اٹھا کر پگڈنڈی پر چلنے لگا "وے بھائی وے بھائی" بیگم شاہ نے پکارا وہ رک گیا۔

"بھائی ہم تھوڑا سا ساگ لے لیں ؟"

"آہو..... پر ایک مٹھ لینا" اس نے بھاری آواز میں کہا اور چلا گیا۔

ہماری بیگمات ساگ توڑنے لگیں اور توڑتی ہی گئیں۔

"بھئی اس بھلے مانس نے کہا تھا کہ صرف ایک مٹھی لینا پورے کھیت کا تو نہیں کہا تھا" شاہ جی چونکہ قدرے بزدل ہیں اس لئے ہراساں ہو کر بولے۔

"کوئی پکڑے گا تو ہمیں ہی پکڑے گا تم کیوں فکر کرتے ہو" بیگم شاہ نے جواب دیا۔

"کاش" شاہ جی نے ایک آہ بھری اور سگریٹ پینے لگے۔

ساگ کے پلندے ہم نے کار میں پھینکے اور پھر سفر شروع ہو گیا...... وہی پُرسکون ہوا اور ہریاول ہم لوگ شرقپور میں رہائش پذیر مرزا اطہر بیگ کے بھائی کی شادی میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے چنانچہ پہنچتے ہی شریک ہو گئے کیونکہ کھانا لگ چکا تھا یہاں شاہ جی نے ہاتھ کھینچ کر رکھا اور میں نے خوش خوراکی بلکہ بدخوراکی کا مظاہرہ کیا کیونکہ مقامی نائی نے اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار بلکہ بروئے دیگ لا کر کھانا تیار کیا تھا۔ مرزا صاحب فلاسفی کے استاد ہونے کے ناطے حسبِ معمول بوکھلائے بوکھلائے پھرتے تھے اور ان کی خوش شکل اور خوش لباس بیگم اٹھلائی اٹھلائی پھرتی تھیں کہ دیور کی شادی تھی مرزا صاحب کے والد جناب مرزا طاہر بیگ صاحب سے بھی ایک مختصر سی ملاقات ہوئی طعام کے بعد فیصلہ ہوا کہ شرقپور کے باغوں کی سیر کی جائے چنانچہ ہم قصبے سے باہر آئے اور نہر کی جانب چلے گئے جہاں سرکنڈوں سے بھری ایک "جھیل" تھی اور کھیت تھے اور امرودوں کے باغ تھے۔

"ہائے...... شلغم" بیگم شاہ جو کھیتوں میں گھس کر مختلف پتوں کو اکھاڑتے چلی جا رہی تھیں یکدم ان پتوں کے آخر میں لگے ہوئے شلغم کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔

"اور مولیاں بھی" ہماری بیگم کے ہاتھ میں دو عدد مولیاں تھیں۔

میں نے ایک شلغم اکھاڑا اور اس کی مٹی کو صاف کر کے کھانے لگا تو بیگم بولیں "نہ نہ یہ نہ کھایئے گندا بھی ہے اور کھانے کے بعد نقصان دہ ہے"

"کیوں شاہ جی؟" میں نے اصغر سے پوچھا۔

"کھاؤ کھاؤ...... تازہ ہے کچھ نہیں ہوتا" وہ بذاتِ خود مولیاں کھا رہا تھا۔

ہم "جھیل" کنارے ایک ٹیلے پر بیٹھ کر دھوپ سینکنے لگے اور شلغم کھانے لگے تھوڑی دیر بعد شاہ جی چونک کر بولے۔

"یار وہ ہماری بیگمیں کدھر گئیں؟"

"کیوں؟ تمہیں سکون اور آزادی پسند نہیں...... جہاں بھی گئیں ہیں آ جائیں گی"

"نہ بھی آئیں تو کیا فرق پڑتا ہے" شاہ جی ٹھنڈی سانس بھر کر بولے اور پھر مسکرانے لگے شاہ جی صاحب زیرِ مونچھ مسکراتے ہیں تو لگتا ہے جیسے کوئی معصوم سا بچہ نقلی مونچھیں لگا کر مسکرا رہا ہے یعنی بے حد سویٹ لگتے ہیں۔

"جھیل" میں سرکنڈے تھے اور ان میں ایک بگلا دھوپ سینک رہا تھا۔

بے حد پُرسکون منظر تھا ٹھہرا ہوا کائی زدہ پانی، سرکنڈے، تازہ ہوا اور آسودگی دینے والی نرم دھوپ یکدم اس پُرسکون اور خاموش منظر میں "ٹھہرو ٹھہرو چور چور" کی صدا بلند ہوئی ہم نے پلٹ کر دیکھا تو ہماری بیگمات دوپٹوں میں امرود بھرے نزدیکی باغ میں سے سرپٹ بھاگتی چلی آ رہی تھیں اور ایک رکھوالا سر پہ ہاتھ دھرے شور مچاتا ہوا ان کے پیچھے بھاگتا آ رہا تھا۔

"اوئے مارے گئے" شاہ جی نروس ہو گئے "بڑی بے عزتی کی بات ہے چودھری...... ہم عزت دار لوگ ہیں ادیب شاعر لوگ ہیں اور ہماری بیویاں چوری کر کے بھاگی چلی آ رہی ہیں"

بیویاں جب قریب آئیں تو ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے ساتھ ہی رکھوالا بھی پہنچ گیا جس کا چہرہ غصے سے دمک رہا تھا۔

"کچھ شرم کرو...... چوریاں کرتے ہو...... پڑھے لکھے ہو کوئی ان پڑھ تو نہیں...... حیا ہی نہیں رہی" وہ شور مچانے لگا۔

"بھائی جان میرے بھرا...... رکھوالا صاحب" شاہ جی نے لرزتے ہوئے اس کو سلام کیا "کوئی بات نہیں...... معاف کر دو انجانی بچیاں ہیں شہر سے آئی ہیں"

"اوئے شہر سے آئی ہیں تو کیا ہو..... جو بھی شہر سے آتا ہے ہمارے امرود توڑتا ہے اور یہی کہتا ہے کہ جی ہم شہر سے آئے ہیں تمہاری کسی دکان سے ہم چیز چرا کر یہ کہتے ہیں؟ کہ کوئی بات نہیں ہم گاؤں سے آئے ہیں۔"

"بابا کیوں کھپ ڈال رہا ہے۔" بیگم شاہ تنگ کر بولیں "پیسے لے لو۔"

"اوئے جا جا بڑی دولت مند....."

میں نے بھی حسب مقدور معافیاں مانگیں لیکن اس کا غصہ کم نہ ہوا تب شاہ جی نے اس کا کندھا پکڑ کر کہا "دراصل بھائی جی یہ تو ہماری بیویاں لیکن ہمارے بس میں نہیں ہیں معاف کر دو"

"بس میں نہیں ہیں؟" وہ یکدم مسکرانے لگا "اس کا مطلب ہے سبھی کی بیویاں ایسی ہی ہوتی ہیں آئندہ ادھر آئے تو....."

وہ جانے لگا تو بیگم شاہ نے اسے پکار کر کہا "بھائی امرودوں کے لئے شکریہ"

کار کی ڈگی میں سرسوں کا ساگ، چند شلغم اور کچھ امرود تھے اور ہم شرقپور سے واپس جا رہے تھے۔

شرقپور روڈ جب شیخوپورہ روڈ کے سنگم پر آئی تو اصغر یکدم پریشان سا ہوا اور سٹیرنگ پر ہاتھ مار کر بولا "چودھری صاحب!"

میں نے کہا "جی شاہ صاحب"

کہنے لگا "میرے کانوں میں گڑبڑ ہو گئی ہے اتنا شور ہے کہ پردے پھٹ رہے ہیں" اب میں نے بھی غور کیا تو احساس ہوا کہ واقعی ہر سو ایک وحشت ناک شور تھا..... ہم شہر میں داخل ہو چکے تھے۔

ہیجڑے اور شہزادے

خلیفہ خلفشاری سے ملاقات ہوئی میں نے پوچھا خلیفہ آج کا اخبار پڑھا ہے؟ کہنے لگے پڑھا لکھا ہوں اخبار پڑھتا ہوں آج کا اخبار بھی ہے لیکن یہ تم ساکت پنکھے کی جانب رخ کر کے "ناں ناں" کے انداز میں سر کیوں ہلا رہے ہو؟

میں نے عرض کیا کہ بجلی بند ہے اس لئے پنکھا بند ہے اس لئے..... "پنکھا بند ہونے سے شاید تمہارا دماغ پہلے پگھلا ہے پھر جل گیا ہے اس لئے اپنا سر ہلائے چلے جا رہے ہو....."

"نہیں نہیں" میں نے سر ہلانا موقوف کیا اور کہا "سنا ہے کہ یہ بھی ایک انداز ہوا کرتا ہے پنکھی ہاتھ میں پکڑ کر چہرے کے سامنے لا کے پنکھی کی بجائے اپنا چہرہ دائیں بائیں ہلانا شروع کر دو تو بھی ہوا آتی ہے بس وہی تجربہ کر رہا تھا....."

"بھائی میرے" خلیفہ نے کف افسوس ملنے کے بعد وہی کف میرے کندھے پر رکھی اور کہنے لگے "وہ تو ہاتھ کے پنکھے کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ تم ساکت پیڈسٹل فین کے آگے بیٹھ کر جو سر ہلائے چلے جاتے ہو تو اس طرح ہوا نہیں لگے گی۔"

"تبھی....." میں نے صرف ایک مرتبہ سر ہلایا "تبھی ہوا نہیں آ رہی تھی اور میں پچھلے دو گھنٹے سے خواہ مخواہ سر ہلائے چلا جا رہا تھا..... میں ابھی بازار سے ہاتھ کا پنکھا لاتا ہوں۔"

"لوڈشیڈنگ کی وجہ سے تم کچھ بیئر ہو گئے" خلیفہ نے ایک مرتبہ پھر کف افسوس ملنے کا مظاہرہ کیا "ہاں تو آج کے اخبار میں کوئی خاص خبر تھی؟"

"ہاں خلیفہ..... وہ امیتابھ نہیں ہے؟"

"ہاں ہاں جانتا ہوں پچھلے دنوں شاید اسی کی جانب سے ایک بیان آیا تھا کہ ہم ہندوستانی ہیجڑے حکومت پاکستان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ پاکستانی ہیجڑوں کو روزگار کے بہتر مواقع دے اور میڈیکل وغیرہ کا مفت بندوبست کرے"

"نہیں خلیفہ..... لوڈشیڈنگ کی وجہ سے میرا نہیں تمہارا دماغ چل گیا ہے بھئی یہ صاحب تو بڑے سپر سٹار ہیں اور رام کے فضل سے بہت خوش شکل ہیں اور الیکشن میں بطور مرد ہی کھڑے ہوئے تھے"

"تو پھر میرے ذہن میں امیتابھ کے نام کے ساتھ ہیجڑے کیوں ناچنے لگتے ہیں؟"

"اوہو..... وہ بھئی کسی فلم میں اس نے ایک ہیجڑے کا سوانگ بھرا تھا... بہرحال تم نے اصلی خبر کا تو ستیاناس کر دیا..... خبر یہ تھی کہ امیتابھ ان دنوں کشمیر میں ہے اور سری نگر کی بنی ہوئی چاکلیٹ پیسٹری چونکہ اسے پسند نہیں اس لئے خصوصی طور پر صرف اس کے لئے دلی سے چاکلیٹ پیسٹری منگوائی جاتی ہے.....؟"

"بچہ جو ہوا اسی لئے چاکلیٹ کھاتا ہے"

"نہیں خلیفہ خلفشاری وہ بچہ تو نہیں ہے....."

"سیاست میں تو بچہ ہے ناں اس لئے چاکلیٹ پیسٹری کھاتا ہے"

"یار خلیفہ ایک تو گرمی سے برا حال ہے اور دوسرے تم میری بات مکمل نہیں ہونے دیتے کہنا میں یہ چاہتا ہوں کیا ہندوستان ایسے ملک کے ایک شہری کے لئے چاکلیٹ پیسٹریاں بذریعہ ہوائی جہاز منگوانا زیادتی نہیں ہے؟"

"بالکل نہیں" خلیفہ فوراً بولے "عادت کے آگے بند باندھنا بڑا مشکل ہوتا ہے اسے چاکلیٹ پیسٹری کے بغیر مالیخولیا ہو جاتا ہو گا یا پھر ہر وقت چاکلیٹ کے لئے اس کی رال ٹپکتی رہتی ہو گی..... میرے ایک دوست انگلستان میں ایک پاکستانی ہوٹل میں گئے جی بھر کر مرغ پلاؤ وغیرہ نوش کیا پھر کھیریں کھائیں..... مینو پر ایک آئٹم "لاپانو" نام کی تھی جس کی قیمت دو پونڈ درج تھی..... انہوں نے یہ سمجھ کر کہ "لاپانو" کوئی اطالوی سویٹ ڈش ہے ویٹر سے فرمائش کر دی اور وہ سیدھا سادا الائچی سپاری والا پان لے آیا..... یہ پان والا تذکرہ جانے کہاں سے بیچ میں آ گیا بہرحال امیتابھ کو عادت ہو گی چاکلیٹ پیسٹریاں کھانے کی ان کے بغیر اسے ایک ایک کے دو دو دکھائی دیتے ہوں گے"

"کمال ہے خلیفہ خلفشاری" میں نے جھلا کر کہا "تم بات کو سمجھتے نہیں ہو بھئی ایک غریب ملک کے باشندے کے لئے.....؟"

"اچھا سنو" خلیفہ یکدم سنجیدہ ہو گیا "ہمارا ملک بھی تو اتنا امیر نہیں ہے لیکن یہاں ایک شخصیت ایسی ہے جس کے ذاتی استعمال کی تمام تر اشیاء بذریعہ ہوائی جہاز یورپ اور امریکہ وغیرہ سے آتی ہیں اور ان کے لئے روپوں میں نہیں سونے کی صورت میں ادائیگی کی جاتی ہے....."

"نہیں یار....." میں نے حیران ہو کر خلیفہ کا بازو پکڑ لیا "تم مذاق کر رہے ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ..... بھئی اپنے ہاں اللہ کا دیا سب کچھ ہے خوراک بہت ہے لباس کافی ہے اور کیا چاہیئے؟..... اس شخصیت کا نام کیا ہے؟"

"پہلے میں تمہیں ان چند اشیاء کے بارے میں بتاتا ہوں جو اس شخصیت کے ذاتی استعمال کے لئے باہر سے منگوائی جاتی ہیں اور کچھ حالتوں میں سمگل کی جاتی ہیں....."

"مثلاً؟"

"مثلاً امریکہ سے مشروبات ڈنمارک سے آئس کریم، جاپان سے دودھ، سری لنکا سے چائے، ہندوستان سے پان، فرانس سے خوشبویات، انگلستان سے میک اپ کا سامان، سنگاپور سے مچھلیاں، جاپان ہی سے کاریں اور موٹر سائیکل، اطالیہ سے شیونگ کریم اور آفٹر شیو لوشن، تھائی لینڈ اور تائیوان سے جوتے اور کپڑے......"

"خدا کے لیے خلیفہ خلفشاری مجھے اس شخص کا نام بتادو جو ملک و قوم کا اتنا ضیاع کر رہی ہے؟"

"وہ شخصیت تم ہو" خلیفہ اطمینان سے بولا۔

"میں؟" میں اچھل پڑا "وہ کیسے؟"

میں اس کی وضاحت نہیں کروں گا تم خود ہی ماشاء اللہ بہت بڑی اور موٹی عقل والے ہو ذرا اس بارے میں سوچو"...... خلیفہ یہ کہہ کر اٹھا اور چلا گیا اور میں سوچتا رہا...... اور پھر آہستہ آہستہ اس کی بات میری سمجھ میں آنے لگی۔ یہ جو خشک دودھ ہم استعمال کرتے ہیں جاپان سے آتا ہے آئس کریم ڈنمارک والے بنا رہے ہیں مشروبات امریکی فارمولا کی ہیں میرے شیو کا تمام تر سامان غیر ملکی ہے...... ان میں سے کچھ چیزیں درآمد ہوتی ہیں اور کچھ سمگل ہوتی ہیں اور لاہور کی ہر دکان پر ملتی ہیں...... ہاں میں ایک عام پاکستانی نہیں ہوں بلکہ ایک کروڑ پتی شہزادہ ہوں جس کے ذاتی استعمال کی بیشتر اشیاء بذریعہ ہوائی جہاز یا سمندری جہاز غیر ممالک سے منگوائی جاتی ہیں...... سونے کے بدلے میں.....

بولنے والا گھوڑا

گرمی زوروں پر تھی۔

میکلوڈ روڈ کے باغیچے میں سُرخ پینٹ کیے ہوئے مٹکوں میں چینی کا شربت تھا، برف کوٹی جا رہی تھی اور لوگ اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے کہ کب تخم ملنگاں سے لبریز گلاس نصیب ہو اور اُسے حلق میں انڈیل کر پیاس بجھائی جائے۔ میری پیاس نے بھی مجھے روک لیا۔ میں بھی اس بھیڑ میں شامل ہو کر سوکھے ہوئے لبوں پر زبان پھیرنے لگا۔ ہر دو چار منٹ بعد دس بارہ گلاس تیار ہوتے جو چھلکتے ہوئے منتظر ہاتھوں میں چلے جاتے...... میں اپنے گلاس کا انتظار کرنے لگا پچھلے تین گھنٹوں سے شہر لاہور کی تپتی ہوئی سڑکوں پر سرگشت کرنے کے بعد میرا بھیجہ بھی اسی درجہ حرارت پر تھا جو پگھلے ہوئے تارکول کا تھا.....

"آج تو بڑی جبر جنگ گرمی ہے"...... میرے پیچھے کھڑے کسی صاحب نے کہا "ہاں گرمی تو ہے" میں نے کہا اور پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا...... البتہ ایک گھوڑا مزے سے منہ چلا رہا تھا اس کا مالک تانگے کی پچھلی نشست پر نیم دراز اونگھ رہا تھا میں نے پھر اپنی توجہ کوٹی جانے والی برف کی ٹھنڈی ٹھنڈی ٹکڑیوں اور شربت میں پھولتی ہوئی تخم ملنگاں کی جانب مبذول کر دی...... یہ کالے کالے بیج شاید ملنگ حضرات اپنی سردائی میں استعمال کرتے ہوں گے اس لئے انہیں تخم ملنگاں کہا جاتا ہے۔ میں نے سوچا۔

"یوں بُت بنے سارا دن کھڑے رہو گے تو باری نہیں آئے گی۔ ذرا ٹھاچی

اک گلاس اِدھر دی" کا نعرہ لگاؤ..... میں نے پھر پیچھے دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا صرف وہ گھوڑا تھا...... تب وہ گھوڑا مسکرایا یا شاید ہنسا اور کہنے لگا "اب تم پوچھو گے کہ کس کو کہہ رہے ہو، تو میں تم کو کہہ رہا ہوں، اور کیا حال چال ہے؟"

"ٹھیک ہے" میں نے جواب دیا اور اِدھر اُدھر دیکھا تمام لوگ یا تو اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے اور یا شربت پی رہے تھے......

"یار تم بولتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں میں نہیں بول سکتا۔ کیا میں بے زبان ہوں"..... اور اس نے اپنی لمبی ہانپتی ہوئی زبان باہر نکال کر اپنی "زبان" والی کا ثبوت پیش کیا۔

"کمال ہے گھوڑے بھی ہو اور بولتے بھی ہو......" میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تم انسانوں پر بڑا ترس آتا ہے....." وہ سر ہلا کر گویا ہوا مجھے دیکھو عیش کرتا ہوں سردی ہو یا گرمی میرا مالک میرا خیال رکھتا ہے ایک دو پھیرے لگانے کے بعد کسی سبیل سے مجھے پانی پلاتا ہے۔ دن میں تین مرتبہ کسی سایہ دار سپاٹ میں کھڑا کر کے چارہ آگے رکھتا ہے میرے سم باقاعدگی سے چیک کرتا رہتا ہے اور شام کو مالش کرتا ہے...... ذرا سست پڑوں تو ڈنگر ڈاکٹر کے پاس بھاگا جاتا ہے اور دوائی لے کر آتا ہے..... عیش ہے ناں؟...... اور تمہارا خیال کون رکھتا ہے؟"

"میرا خیال کس نے رکھنا ہے..... ہم انسان ہیں اور انسانوں میں کوئی کسی کا خیال نہیں رکھتا۔ صبح ہوتی ہے تو گھر سے نکلتا ہوں اور تمام دن جانوروں کی طرح مارا مارا پھرتا ہوں....."

"جانوروں کی طرح نہیں انسانوں کی طرح...." گھوڑے نے فوراً ٹوکا۔

چلو انسانوں کی طرح سہی..... شہر کی سڑکوں پر گھومتا رہتا ہوں اور کسی جگہ ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس تک نصیب نہیں ہوتا۔ ایل۔ ڈی۔ اے نے ایک دو جگہ ٹھنڈے پانی کے بورڈ لگا رکھے ہیں اور وہاں گرم پانی بھی نہیں ملتا۔ صاحبِ ثروت حضرات جوش میں آ کر کبھی کبھی کوئی شاندار سبیل بناتے ہیں اور اس پر اپنے نام کا بورڈ لگاتے ہیں اور دوسرے روز وہ خشک ہو جاتی ہے۔ بورڈ باقی رہتا ہے پانی غائب ہو جاتا ہے۔ پورے شہر لاہور میں کہیں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں سے پیاسی مخلوق کو ٹھنڈے پانی کے دو گھونٹ مل سکیں۔ بچے دوپہر کے وقت سکولوں سے باہر آتے ہیں تو ان کی زبانیں تمہاری طرح یعنی گھوڑوں کی طرح باہر لٹک رہی ہوتی ہیں۔ کسی سماجی کارکن کو خیال نہیں آتا۔ کوئی فلاحی تنظیم دھیان نہیں کرتی کہ فیض کے اسباب میں چاہ بنانا بھی شامل ہے ثواب کمانے کا اس سے آسان طریقہ اور کون سا ہو گا کہ چند مٹکے پانی کے دو چار گلاس اور من دو من برف میرے پاس اگر گنجائش ہوتی تو....."

گھوڑا ہنہنایا "تمہارے پاس گنجائش ہوتی تو تم بھی ان کی طرح ہی ہوتے جن کے پاس گنجائش ہے۔ بھلا ائیر کنڈیشنڈ کاروں میں سفر کرنے والوں کو کیا پتہ کہ باہر سڑکوں پر رب کی مخلوق ہے جو پیاسی ہے..... تم گفتگو جاری رکھو"

"تو جناب گھوڑا صاحب ہم انسانوں کا بُرا حال ہے..... تم تو ٹرانسپورٹ کے معاملے میں خود کفیل ہو لیکن ہمیں بسوں اور ویگنوں کے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔ گوشت کا سرکاری نرخ چھبیس روپے مقرر ہے لیکن بکتا تیس بتیس روپے کے حساب سے ہے سرکاری افسر بھی اسی بھاؤ خریدتے ہیں اور جب تقریر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جناب مارکیٹ میں جا کر دیکھیں گوشت چھبیس روپے عام بک رہا ہے۔ البتہ کبھی کبھار پولیس اور مجسٹریٹ وغیرہ شغل کے لئے چھاپے مارتے ہیں اور قصائیوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ قصائی واپس آتے ہیں اور جرمانے اور نذرانے کی

رقم گاہکوں سے وصول کر لیتے ہیں۔"

"گوشت وغیرہ نہاری پرابلم ہے۔ میں تو کھاتا ہی نہیں" گھوڑے صاحب نے کہا۔

"ہاں میں بھول گیا تھا کہ گھوڑا گوشت نہیں کھاتا۔۔۔۔"

"سنو" گھوڑے نے سرگوشی کی۔

"سناؤ" میں بھی اس کے قریب ہو گیا۔

"تم گھوڑے بن جاؤ" اس نے کہا۔

"اچھا" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "پر کیسے؟"

"کمال ہے انسان گدھے بن جاتے ہیں اُلو بن جاتے ہیں سانپ بن جاتے ہیں، تم گھوڑے بن جاؤ، سکھی رہو گے۔"

"باؤجی گلاس پکڑو" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دکان پر کام کرنے والا لڑکا تخم ملنگاں سے بھرا ہوا گلاس لئے کھڑا تھا۔

"نہیں" میں نے کہا "گھوڑے تخم ملنگاں والا شربت نہیں پیتے۔۔۔۔ چوک نسبت روڈ پر گھوڑوں کے لئے ایک سبیل ہے وہاں جا کر مفت میں پانی پیوں گا۔"

میں چوک نسبت روڈ کی جانب ہنہناتا ہوا روانہ ہوا تو پیچھے سے کسی نے کہا۔۔۔۔ لو بھئی باؤ الٹ گیا ہے گرمی نال۔۔۔۔ کہتا ہے میں گھوڑا ہوں۔

ٹھرواوے

کل ایک صاحب میرے ہاں تشریف لائے، پریشان حال سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتے ہوئے البتہ تازہ ترین ماڈل کی جاپانی کار میں سے برآمد ہوئے اور آتے ہی پوچھنے لگے "تم ہی ہو جس کا نام پھپھپھٹی میں بولتا ہے؟"

میں نے شرمندہ ہو کر کہا "ہاں" "ففتی ففتی" والے جب کبھی تنگ دست ہو جاتے ہیں تو میرے نام سے لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"اچھا" وہ بولے "تو تم مشہور ہو بابا۔"

میں نے کہا "بس چند لوگ جانتے ہیں۔"

"کچھ لکھت پڑھت بھی تو کرتے ہو؟"

"ہاں کرتا ہوں۔"

"تو بابا لکھو"

"کیا لکھوں؟"

"کچھ لکھو، مصالحے دار، مزیدار، چٹپٹا" میں نے عرض کیا کہ میں مصالحہ کمپنیوں کے لئے اشتہار نہیں لکھتا۔

کہنے لگے "نہیں بابا، ہم ادھر کراچی سے ایک میگزین نکال رہے ہیں تم اس میں لکھو، پیسہ ویسا بھی دیں گا۔"

میں نے پوچھا "کس قسم کا میگزین"

کہنے لگے "بہت اچھا والا، آرٹ پیپر، کلرڈ، ٹرانسپیرنسیز۔۔۔۔ ٹائٹل پر کرکٹ

والے عمران خان کا بڑا تصویر"۔

"میرا مطلب ہے کہ اس میگزین کا مزاج کیا ہوگا۔ ادبی، سیاسی، فلمی ٹیلی ویژنی.... کس قسم کا ہوگا؟"

"وہ گھڑی دیکھ کر بولے" بابا "تھرواوے" ٹائپ کا ہوگا۔

"تھرواوے؟ یہ کونسی قسم ہے؟" میں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"بابا آج کا تھرواوے کلچر کا زمانہ ہے..... دیکھو پہلے زمانے میں مال پکا پکا بنتا تھا۔ ایک مرتبہ خریدا اور ساری عمر استعمال کیا۔ پہلے زمانے کی کار دیکھو اور ادھر اس کو دیکھو..... انہوں نے اپنی نئی کار کی طرف اشارہ کر کے کہا" اس کی بانٹ پر میرا چھوتا ہے نہیں وہ بیٹھ گیا..... دیکھو ادھر سے ایک دم ڈینٹ پڑ گیا..... پہلے لائیٹر ہوتا تھا نہیں؟ اس میں چقماق ڈالو؟ گیس ڈالو اور ساری جندگی سگریٹ پیو..... اور اب باجارسے لوچھ روپے کا استعمال کرو پھینک دو۔ تھرواوے..... گھڑی ہوتا تھا اومیگا اور ویسٹ اینڈ اور پتہ نہیں کیا کیا؟ چمڑہ بدلتے جاؤ اور مرنے کی ٹیم اپنے چھوٹے کو دے دو۔ اب ایسا نہیں ہے۔ پچاس روپے کی گھڑی لو جب اس کا سیل ختم ہو جائے تو پھینک دو، تھرواوے..... اس طرح آج کل اس میگزین کا زمانہ نہیں ہے کہ غور غور سے سارا فیملی پڑھو سنبھال کر رکھو۔ اس کا بائنڈنگ کرا کے لائبریری میں رکھو..... اب تو میگزین اٹھاؤ کلرڈ فوٹو دیکھو لطیفے پڑھو سکینڈل دیکھو اور پھر پھینک دو..... ایسا ہوتا ہے تھرواوے میگزین تم ادبی سیاسی پوچھتا ہے"۔

میں نے عرض کیا کہ میرے لئے کیا حکم ہے؟

بولے "بس تم کچھ لکھو۔ ہم کو تمہارا نام چاہئے اور بڑا سارا فوٹو بس کچھ لکھ دو ہم چھاپ دیں گا۔ اور دیکھو مصالحے دار ہو۔ کوئی ادب ودب اور اخلاق مخلاق مت ڈالنا۔ بالکل تھرواوے ہونا چاہئے..... ایسا کام نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ سنبھال کر رکھیں..... بابا اگر وہ میگزین سنبھال لیں گے تو دوسرا ایشو کیسے خریدیں گے ہیں..... بس پڑھیں اور پھینک دیں ایسا"۔

میں نے کہا "جناب یہ تو آپ بہت خطرناک باتیں کر رہے ہیں۔ ہم تو روائتی آدمی ہیں اس قسم کا تھرواوے کلچر ہمارے لئے مفید نہیں ہے۔ آج آپ کاریں، لائٹر، گھڑیاں اور میگزین تھرواوے کر رہے ہیں۔ کل کلاں دوستیاں، محبتیں اور چاہتیں بھی تھرواوے کر دیں گے"۔

وہ مسکرائے" بابا یہ چیزیں تو شروع سے ہی تھرواوے ہیں۔ دوستی کرو، کام نکالو اور..... تھرواوے..... اور یہ محبت وغیرہ تو بالکل یہی کام ہے بابا..... ان دنوں تو یہی ملے گا۔ یہ سیاست والا لوگ کیا کرتا ہے۔ وعدہ کرتا ہے ووٹ لیتا ہے اور پھر تھرواوے..... بابا ہم کو ماڈرن ہونا پڑے گا۔ ادھر یورپ میں یہی کلچر ہے۔ بچہ یا بچی جوان ہوتی ہے تو والدین اس کو تھرواوے کر دیتا ہے اور والدین بوڑھا ہو جاتا ہے تو ان کو اولڈ پیپلز ہوم میں تھرواوے کر دیا جاتا ہے۔ یہی چلتا ہے بابا..... تم ادیب لوگ بالکل سٹوپڈ رہا ہے۔ ہمیشہ ادب کے پیچھے بھاگتا ہے بابا پیسے کے پیچھے بھاگو۔ تھرواوے کلچر پر ایمان لے آؤ اور مزے کرو..... کہو ہمارے میگزین کے لئے لکھو گے؟"

"بالکل نہیں" میں نے میز پر مکا مار کر کہا" ہم ابدی اور ازلی اقدار پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں۔ ہم اپنی محبتوں، دوستیوں اور تحریروں کو تھرواوے نہیں بنا سکتے"۔

"نہیں بنا سکتے؟" وہ صاحب ہنسنے لگے" بابا اپنے آس پاس دیکھو غور سے۔ سب ایسا کر رہے ہیں اور تمہیں معلوم نہیں..... کہو لکھو گے؟"

آپ کتنے پیسے دیں گے؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔ انہوں نے میرے کان

میں چپکے سے ایک رقم بتا دی جو اتنی زیادہ تھی کہ میں اس کے لئے بہت کچھ تھرواوے کر سکتا تھا چنانچہ ان سے لکھنے کا وعدہ کرکے انہیں رخصت کر دیا اسی شام جب میں لکھنے بیٹھا تو میرے تھرواوے لائٹر کی گیس ختم ہو گئی اور میں نے اسے باہر پھینک دیا۔ تھوڑی دیر بعد میرا بیٹا باہر سے آیا تو اس کے ہاتھ میں وہی لائٹر تھا "ابو آپ نے اس لائٹر کو کیوں پھینک دیا ہے؟"

میں نے کہا "بیٹے آج کل تھرواوے کلچر کا زمانہ ہے۔ چیز استعمال کی اور پھینک دی ..... یورپ میں تو لوگ بوڑھے والدین کو بھی تھرواوے کر دیتے ہیں.... لیکن ابھی ہم اتنے ماڈرن نہیں ہوئے"

"تو ابو" وہ حیران ہو کر بولا "اگر ہم اتنے ماڈرن ہو گئے تو دادا جان کو بھی تھرواوے کر دیں گے؟..... اور ابو جب آپ بوڑھے ہو جائیں گے تو میں کیا کروں گا؟"

ٹریفک جیم

منزل کے لئے دو گام تو نہیں کئی گام چل کر میں یہاں تک پہنچا ہوں اور منزل بھی میرے سامنے آ چکی تھی، بلکہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے آ چکی تھی اور باقاعدہ دکھائی دے رہی تھی، اگر یہ لب بام تھی تو صرف دو چار ہاتھ کے فاصلے پر تھی، قسمت کی خوبی یا خرابی کا کہ بھی نہیں تھا۔ کیونکہ کمند بھی ٹوٹی نہیں تھی۔ بلکہ صحیح سالم میرے ہاتھ میں تھی.... اور پھر بھی پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے ایک جگہ پر ساکت کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ سارے راستے مسدود ہو چکے تھے..... میں ایک ٹریفک جیم میں گھرا کھڑا تھا.....

گھر سے نسبت روڈ چوک تک کا فاصلہ میں نے پندرہ منٹ میں طے کیا اور جب وہاں سے گوالمنڈی چوک کی جانب دیکھا تو سڑک غائب تھی اور اس کی جگہ کاروں، موٹر سائیکلوں، رکشوں، ویگنوں، سائیکلوں اور ریڑھیوں کا ایک جم غفیر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ بلکہ ٹھاٹھیں بھی نہیں مار رہا تھا۔ بالکل ایک جگہ پر کھڑا بے بسی سے کسمسا رہا تھا۔ ٹریفک کونسے مقام پر جیم ہوئی تھی اس کا تعین بھی مشکل تھا کیونکہ جہاں تک نظر جاتی تھی کاریں اور گھوڑے آپس میں راز و نیاز کر رہے تھے۔ لوگ ہارن بجا بجا کر اپنی بیٹریاں ڈاؤن کر چکے تھے اور اب بے بسی سے صرف کھڑے تھے اور انتظار کر رہے تھے میں اگر اس میلے میں گھس جاتا تو میرا گم ہو جانا بھی یقینی تھا اور مجھے بہر صورت چند ضروری فون کرنے کے لئے دکان پر پہنچنا تھا جہاں چند ایسے دوست میرے

تعلیم حاصل کرتے رہتے ہیں اور اب ملازمتوں کی تلاش میں ہیں بے شمار ایسے افراد ہیں جو چھوٹی موٹی نوکریوں کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں یہ لاکھوں افراد اپنے آپ کو کس طرح طویل اقامت کرکے ان کی نظروں میں آئیں؟...... یہ تو میری طرح عام سے نارمل پاکستانی ہیں..... کیا عوام اور کاروباری اداروں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ابنارمل ہونا ضروری ہے؟ پلیز فرقان بھائی تم مجھے کھینچ تان کر طویل اقامت کردو......"

"...... میں ڈاکٹر کو اطلاع کرتا ہوں......" ☆



کوفتوں والی بھابھی

خاتون ایک پرانی وضع کے پرنٹ کی شلوار قمیض میں ملبوس تھیں اور سر پر دوپٹہ تھا وہ خاصی معمر لگ رہی تھیں اور ان کی مسکراہٹ سے شک ہوتا تھا کہ میں نے انہیں کہیں دیکھا ہوا ہے ان کے ہمراہ تین بچے تھے یہ بچے بلوغت کی حد کو چھوتے تھے دو لڑکیاں جن کے بال کٹے ہوئے تھے اور وہ چست پتلونوں اور کھلے گریبان کی قمیضوں میں کولہوں پر ہاتھ رکھے بیزاری سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ایک لڑکا جو پھیکے رنگ کی نیلی جین اور بنیان پہنے ہوئے تھے بار بار کچھ سونگھتا اور پھر کندھے جھٹک کر برا سامنہ بناتا خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ نے مجھے شاید پہچانا نہیں؟......"

"جی...... مجھے یاد نہیں آرہا"

"میں بیگم باقی ہوں...... اور یہ میرے بچے ہیں"

بیگم باقی؟ میں نے ذہن پر زور ڈالا...... میں نے انہیں کہاں دیکھا تھا..... انگلستان کے قیام کے دوران مختلف رہائشی تجربے ہوتے ہیں کچھ لوگ ایک کمرہ کرایہ پر لے کر خوراک کا بندوبست خود کرتے ہیں اور بیشتر پے انگ گیسٹ کے طور پر کسی خاندان یا درمیانی عمر کے جوڑے کے ہمراہ رہائش اختیار کرلیتے ہیں طے شدہ رقم میں کمرے کا کرایہ صبح کا ناشتہ رات کا کھانا اور ہفتے اتوار کو لنچ شامل ہوتا ہے...... برطانوی روایت میں "لینڈ لیڈی" کا ایک اہم کردار ہے اور

تو بتاؤ" وہ کہنے لگا: "طریقہ یہی ہے کہ میری طرح موٹر سائیکل چھوڑ دو اور پیدل آیا کرو...... سلام علیکم" اس نے اپنے کھیسے میں سے ایک پان نکالا، لپیٹ کر اپنے منہ میں رکھا اور مسکراتا ہوا چلا گیا...... میں اسی طرح بند موٹر سائیکل پر بیٹھا ٹریفک جیم میں پھنسا رہا اور اس لب بام کو دیکھتا رہا جو صرف دو چار ہاتھ رہ گیا تھا، جو میری منزل تھا اور میں اسے سامنے پانے کے باوجود اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔



مجھے کھینچ کر لمبا کر دو

☆ ......: بھائی فرقان ......

☆ "ہاں بھائی یرقان"

☆ "ذرا غور سے میری طرف دیکھو"

☆ ...... "دیکھ تو رہا ہوں......"

☆ ......: "کمال ہے میرے چہرے کو دیکھ کر تمہیں ہنسی نہیں آ رہی...... تمہیں تو اب تک ہنس ہنس کر بے حال ہو جانا چاہیے تھا......"

☆ ...... "واللہ یرقان بھائی تم بالکل درست کہہ رہے ہو...... یہ تم نے کیا صورت بنا رکھی ہے؟...... سر کے بال غائب ہیں اور اب وہاں چمکتی ہوئی چندیا ہے، ماتھے اور گالوں پر سفیدی تھوپ رکھی ہے اور گلے میں جوتیوں کا ہار ہے، تم چاہتے کیا ہو؟......"

☆ ......: میں عجوبہ بننا چاہتا ہوں...... میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ میری طرف دیکھیں، میں جہاں بھی جاؤں لوگ میرے گرد جمع ہو جائیں میرے ساتھ تصویریں اتروائیں اور ہاتھ ملائیں......"

☆ ......: اور اس کے بعد پاگل خانے جمع کروا دیں؟......"

☆ ......: نہیں فرقان میں پاگل خانے نہیں جانا چاہتا"

☆ ...... "تو پھر اپنا حلیہ ٹھیک کرو......"

☆ ......" وہ تو میں کروں گا لیکن ایک بات بتاؤ..... کیا میری آنکھیں بھی دو ہی رہیں گی تین نہیں ہو سکتیں؟......"

☆ ......" ایک ہو سکتی ہے، تین نہیں ہو سکتیں....."

☆ ......؟ اور میرے کان دو کی بجائے چار پانچ نہیں ہو سکتے"

☆ ......" یرقان یرقان یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم چاہتے کیا ہو؟....."

☆ ......" میں نے بتایا ناں کہ میں ایک عجوبہ بننا چاہتا ہوں....."

☆ ......" لیکن کیوں.....؟"

"تم پہلے مجھے عجوبہ بننے کا نسخہ بتاؤ پھر بتاؤں گا...... دیکھو ناں میں ایک غریب اور ان پڑھ ماں باپ کا بیٹا تھا، میں نے محنت کر کے مشقت کر کے ماں باپ کی خدمت کی اور اس کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی کی اور میٹرک کے امتحان میں وظیفہ حاصل کر لیا......؟"

☆ ......" واہ واہ یرقان تم تو عجوبہ ہو میرے بھائی..... اپنی ہمت سے کسی کی مدد کے بغیر تم نے میٹرک میں وظیفہ حاصل کر لیا تو یہ ایک عجوبہ ہی تو ہے...."

☆ ......" لیکن میری تصویریں اخباروں میں نہ چھپیں لوگ میرے گرد جمع نہ ہوئے اور انہوں نے مسکرا کر میرے ساتھ ہاتھ نہ ملائے...... میں اسی طرح محنت مزدوری کرتا رہا اور پھر فرسٹ ڈویژن میں بی۔اے کر لیا....."

☆ ......واہ، واہ یرقان تم تو پاکستانی نوجوانوں کے لئے مشعل راہ ہو تمام تر ذاتی مشکلات پر قابو پانے اپنے زور بازو سے گریجوایشن کر لینا اور وہ بھی فرسٹ ڈویژن میں یہ تو واقعی عجوبہ ہے....."

☆ ......" لیکن پھر بھی مجھے کسی نے نہ پہچانا، پیٹھ پر تھپکی نہ دی شاباش نہ ملی...... تم میرا ایک کام کر دو فرقان"

☆ ......" یرقان بھائی تم حکم کرو......"

☆ ......" تم کسی نہ کسی طرح، کسی مشین میں کس کر دو اونٹوں کے درمیان باندھ کر کسی بھی طریقے سے مجھے لمبا کر دو"

☆ ......" تمہیں لمبا کر دوں؟ کھینچ کر؟...... یار کیا اول فول بک رہے ہو... اچھا بھلا قد ہے تمہارا مزید لمبے ہو کر کیا کرو گے؟

☆ ......" یا پھر مجھے قد بڑھانے کی کوئی دوائی لا دو.... کچھ کرو لیکن مجھے لمبا کر دو"

☆ ......" لیکن تم لمبے ہو کر کرو گے کیا؟....."

"میں ایک عجوبہ بن جاؤں گا، سب لوگ میری طرف دیکھیں گے، میں جہاں بھی جاؤں گا لوگ میرے گرد جمع ہو کر مجھے احمقوں کی طرح منہ کھول کر دیکھیں گے اور میرے ساتھ تصویریں اتروائیں گے اور ہاتھ ملائیں گے.... میرے جوتے کا سائز اخباروں کی شہ سرخی ہوگا، میری چارپائی کی تصویریں بنیں گی اور ڈاکٹروں کے بیان دھڑا دھڑ آئیں گے کہ ابھی یرقان کا قد بڑھ رہا ہے اور آئندہ برسوں میں امید ہے کہ بڑھ کر آسمان کو چھوئے گا..... اور یہ بچشم خود ہفت افلاک کا مشاہدہ کرے گا..... بس فرقان بھائی تم مجھے لمبا کرنے کا بندوبست کر دو"

☆ ......" میرا خیال ہے کہ تمہارا دماغ چل گیا ہے، میں ڈاکٹر کو اطلاع کرتا ہوں"

☆ ......" لیکن طویل القامت ہونے کا سب سے بڑا فائدہ جانتے ہو کیا ہو گا؟...... مجھے بالآخر ملازمت مل جائے گی، اخباری ادارے اشتہاری کمپنیاں اور ٹیلی ویژن والے مجھے نوکری کی پیشکش کریں گے..... یہ ادارے نہیں جانتے کہ پاکستان میں لاکھوں ایسے نوجوان ہیں جنہوں نے طویل القامت ہونے سے زیادہ مشکل کارنامے سرانجام دیئے ہیں، وہ مالی مشکلات اور خاندانی مصیبتوں کے باوجود

منتظر تھے جو صرف مجھے ملنے کی خاطر اسلام آباد سے آئے ہوئے تھے چنانچہ میں چوک چھوڑ کر ایک ایسی گلی میں داخل ہو گیا جو گھوم پھر کر گوالمنڈی چوک میں نکلتی تھی میں نے اپنے تئیں بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا تھا لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس قسم کی عقل دیگر موٹر سائیکل سواروں کے پاس بھی تھی جو اب اپنے اپنے "ثبوت" یعنی موٹر سائیکل تھامے گلی سے سڑک پر نکلنے والے راستے میں کھڑے تھے اور ان کے سامنے ٹریفک کی سیسہ پلائی دیوار کھڑی تھی. چنانچہ میں نے اسی میں عافیت جانی کہ واپس نسبت روڈ چوک میں جا کر قسمت آزمائی کی جائے. چوک میں پہنچ کر میں نے اللہ کا نام لیا اور ٹریفک کے بحرِ بے کراں میں اپنا موٹر سائیکل ڈال دیا. پندرہ منٹ کے اندر اندر میں گوالمنڈی چوک میں پہنچ چکا تھا. گلی سے چوک میں داخل ہونے کے خواہش مند حضرات ابھی تک وہیں جمع کھڑے تھے چوک میں سے وہ دکان اور اس کا بورڈ دکھائی دے رہا تھا جہاں مجھے پہنچنا تھا.

اور وہ دکان اور اس کا بورڈ اگلے ڈیڑھ گھنٹے تک دکھائی دیتا رہا اور میں اس تک نہ پہنچ سکا یہاں پر صرف ٹریفک جیم ہی نہیں تھی بلکہ ریڑھیوں کے "بم" کاروں کے بمپر سائیکلوں کے ٹائر آپس میں "مربوط" ہو چکے تھے موچی دروازے کے قریب اگر کوئی کار دو انچ پیچھے کھسکتی تو ساری ٹریفک میں ایک نابالغ قسم کا زلزلہ آ جاتا. ونڈ سکرینوں اور ہیڈ لائٹوں کے شیشے ٹوٹنے لگتے. ناقابل بیان الفاظ فضا میں تیرتے اور پھر سکون ہو جاتا اس ہجوم میں میو ہسپتال سے نکلی ہوئی ایک ایمبولنس بھی کھڑی تھی جو سائرن بجا بجا کر اب خاموش ہو چکی تھی. شاید اس کے اندر لیٹا ہوا جاں بلب بھی خاموش ہو چکا ہو. چند نوجوانوں نے اپنے سائیکل ہواؤں میں بلند کر کے اس دلدل میں سے نکلنے کی کوشش کی مگر قدم کہاں رکھ کر نکلتے چنانچہ سائیکلیں

نیچی کیں تو اب وہ جگہ بھی پُر ہو چکی تھی جہاں وہ پہلے رکھی ہوئی تھیں. اس ساری صورت حال کو صرف گھوڑے "انجوائے" کر رہے تھے وہ اپنی تھکی ہوئی ٹانگوں کو آرام دے رہے تھے اور تھوتھنیاں چلا رہے تھے...... ایک گھوڑا اپنے آگے رکے سر کو چاٹ رہا تھا جو ایک موٹر سائیکل والے کا تھا اور وہ غریب شور مچا رہا تھا. کہ بھائی "تانگے والے اپنے گھوڑے کو منع کرو اور تانگے والا آگے سے کہہ رہا تھا کہ باؤ جی آپ آگے سے ہٹ جاؤ جانور ہے تو منہ مارتا ہے. ٹریفک جیم اتنا گھنا اور مکمل تھا کہ ریلوے روڈ سے نمودار ہوتا ہوا بھینسوں کا ایک ریوڑ اپنی پوری وحشی رفتار کے باوجود اس کے اندر اپنے لئے کوئی مقام پیدا نہ کر سکا.

اس دوران معراج پتھر جانے کہاں سے نازل ہو گیا وہ حسب معمول زندگی اور اپنے آپ سے بے حد خوش تھا. مجھے یوں پھنسا ہوا دیکھ کر کہنے لگا "بادشاہو کھڑے ہو ناں ایک ہی جگہ پر. وہ سامنے چند قدم پر تمہاری ہٹی ہے اور تم وہاں تک پہنچ نہیں سکتے" میں نے کہا "ماجھے! اس میں میرا کیا قصور ہے...... میں تو خواہ مخواہ پھنس گیا ہوں" معراج پتھر نے صبح کی کھائی ہوئی نہاری کا ایک ڈکار لیا اور بولا "ہمارا سب کا قصور ہے بادشاہو...... ہمارے ملک کے لوگ ہی ایسے ہیں ...... رکشا والا یا کار ڈرائیور یہ نہیں دیکھتا کہ آگے ٹریفک رکی ہوئی ہے تو کسی وجہ سے رکی ہو گی. انتظار نہیں کرتا. دوسروں کو بے وقوف سمجھتا ہے جو انتظار کر رہے ہوتے ہیں اور اپنا ہاتھ چھوڑ کر سب کو اوور ٹیک کر کے آگے چلا جاتا ہے اور جناب ادھر سے ادھر آنے والے کا راستہ روک لیتا ہے...... بس ٹریفک بند ...... سائڈ پر ریڑھیوں والے کھڑے ہیں اور بس کھڑے ہیں"

میں نے تنگ آ کر کہا "یار پتھر اس ٹریفک جیم سے نکلنے کا کوئی طریقہ بھی

آپ کو اپنے قیام کے دوران طرح طرح کی لینڈ لیڈیوں سے سابقہ پڑتا ہے.... لالچی، محبت کرنے والی، شرابی، طلاق شدہ، قریب المرگ، بہترین اخلاقیات اور خلوص کی مالک، آپ کی چمڑی ادھیڑ لینے والی...... غرض کہ انسانی فطرت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک ملی جلی آبادی میں لینڈ لیڈی خالص برطانوی کے علاوہ پولش، ہنگیرین، چینی بھارتی اور کبھی کبھار پاکستانی بھی ہو سکتی ہیں.... بیگم باقی ایک پاکستانی لینڈ لیڈی تھیں۔ میں جب ان کے خاوند شیر باقی کے مکان میں رہائش پذیر ہوا تو وہ غیر شادی شدہ تھے..... پاکستان میں سائیکلیں کرایہ پر اٹھاتے تھے اور پنکچر وغیرہ لگاتے تھے انگلستان پہنچے اور فیکٹریوں میں لوہا کوٹ کوٹ کر ایک مکان خریدا خوراک اور لباس کے پیسوں میں سے رقم جمع کر کے سیکنڈ ہینڈ فرنیچر اور قالینوں سے مکان کو فرنش کیا۔ خود تہ خانے میں چلے گئے اور تین کمروں کو کرائے پر اٹھایا...... پاکستان میں ان کی منگنی ہو چکی تھی لیکن انگلستان میں صاحب جائیداد بن جانے کے بعد ان کا سٹینڈرڈ بھی بلند ہو گیا۔ اور انہوں نے اپنی منگیتر کی بجائے اس کی چھوٹی بہن سے شادی کا اظہار کیا...... اور یہ خواہش پوری ہوئی ٹیلی فون پر نکاح ہوا اور تمام کرایہ دار شیر باقی کو ہار پہنا کر لندن ایئر پورٹ پہنچے جہاں پاکستان سے آنے والے جہاز میں سے ایک نو خیز ڈری ڈری معمولی تعلیم یافتہ لڑکی برآمد ہوئی جو کہ ہماری بھابی تھیں، اور مستقبل کی لینڈ لیڈی..... وہ کچھ روز تو ہم سے بھی گھونگھٹ نکالتی رہیں اور پھر آہستہ آہستہ انہوں نے "شاپنگاں" پر جانا شروع کر دیا۔ مجھے کو سپون کہنے لگیں اور کھڑکی بند کرنے کو "ونڈو شٹ کرو ے" کہنا شروع کر دیا۔ ہمارا کرایہ بڑھا دیا گیا اور ایک معقول رقم کے اضافے سے ہمیں پاکستان کی خوراک بھی ملنے لگی......

کچھ عرصہ بعد انہوں نے اپنے خاوند کے ساتھ فیکٹری میں ملازمت شروع کر

دی اور ایک نئی کار اور دوسرے مکان کا خواب دیکھنے لگیں..... بیگم باقی ہمیں کھانا دینے کے معاملے میں بے حد کنجوس تھیں، اور جب بھی ہم شکایت کرتے تو مسکرا کر کہتیں "بھائی جان ان گوروں کو دیکھو سینڈوچ اور ڈبل روٹی کھاتے ہیں اور آپ ہو کہ دو روٹیوں اور آلو شوربے کھا کر بھی خوش نہیں ہو شکر کرو اللہ کا کہ میں آپ کی لیڈی ہو گئی ہوں گھر والا سالن بنا کر کھلاتی ہوں گوری لیڈی کے پاس ہوتے تو ابلے ہوئے آلو کھاتے..... اچھا کل گوشت پکاؤں گی تو آپ کو دو بوٹیاں دوں گی...... لیکن وہ ہمیں ہمیشہ "سٹاروینشن ڈائٹ" پر ہی رکھتیں۔ چنانچہ ایک اور پاکستانی نوجوان کو ساتھ ملا کر ہم نے بیگم باقی کی غیر موجودگی میں ان کی ہانڈی میں سے بوٹیاں وغیرہ چوری کرنی شروع کر دیں...... بیگم باقی فیکٹری سے واپس آتیں کچن میں جاتی اور پھر برآمدے میں آ کر شور مچا دیتیں "ہائے ہائے صبح گن کر گئی تھی آٹھ بوٹیاں تھیں اب چھ ہیں، بھائی جان آپ کو کچھ پتہ ہے۔ "بھابی مجھے کیا پتہ...... بلی کھا گئی ہو گی"..... اس طرح کوفتے پکتے وقت تو وہ بھی غائب ہو جاتے..... ایک روز فیکٹری سے واپس آئیں اور مجھے کچن میں لے گئیں دیگچی میں سردی سے جما ہوا سالن تھا اور اس میں دو بڑے بڑے سوراخ تھے جہاں کبھی کوفتے ہوا کرتے تھے..... غلطی مجھ سے ہوئی کہ جمے ہوئے شوربے میں سے کوفتے نکال لئے اور یہ نہ سوچا کہ ان کی رہائش گاہ خالی پڑی ہوئی ہے پتہ چل جائے گا۔ بہر حال میں نے اپنی معصومیت ظاہر کی اور آئندہ سے یہ احتیاط کرنا شروع کر دی کہ کوفتے یا بوٹی وغیرہ نکال کر سالن کو پھر سے گرم کر کے ٹھنڈا کر لیا اور یوں یہ سلسلہ جاری رہا..... تین چار ماہ بعد میں کسی اور جگہ شفٹ ہو گیا..... اس دوران معلوم ہوا کہ بیگم باقی کے ہاں یکے بعد دیگرے تین بچے پیدا ہوئے ہیں...... اور اب اتنے برسوں بعد بیگم باقی میرے سامنے بیٹھی تھیں،

"اوہو آپ تو ہماری بھابی ہیں کوفتوں والی" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"آہو بھائی جان...... پر سچ سچ بتا دیں اب وہ کوفتے آپ ہی چراتے تھے؟"
"میرے خیال میں اب اعتراف کرنے میں کیا ہرج ہے جرم کافی پرانا ہو چکا...... باقی صاحب کا کیا حال ہے؟"
"انہیں فوت ہوئے تو تین سال ہو گئے بھائی جان...... بس کام کرتے کرتے فیکٹری ہی میں گر پڑے...... بڑا مشکل وقت تھا پر اب ماشاء اللہ ہمارے چار مکان ہیں سب کرائے پر چڑھے ہوئے ہیں اور بھی بڑا کچھ بنا گئے ہیں باقی صاحب......"
"کتنے دنوں کے لئے پاکستان آئی ہیں؟"
"آئی تو رہنے کے لئے تھی...... بھائی جان لڑکیاں جوان ہو گئی ہیں وہاں گوروں کے ساتھ پھرتی ہیں ڈانس کرتی ہیں لڑکا بھی کئی کئی دن غائب رہتا ہے...... بھائی میں تو پاکستان آئی تھی کہ یہاں رہ جاؤں پر یہ بچے......" وہ آبدیدہ ہو گئیں...... اور بچے لاتعلق کھڑے رہے...... "یں دھرم پورے میں ہوں اپنے بھائی کے پاس ان کو نہ محلہ پسند ہے نہ وہ لوگ ان سے بات نہیں کرتے...... کہتے ہیں تم بے شک یہاں رہ جاؤ پر ہم جا رہے ہیں ہمارے پاس نیشنلٹی ہے...... بھائی جان میرا جی بڑا اداس رہتا ہے لاہور سے...... اپنے بھائیوں سے پر میں مجبور ہوں...... مجھے پتہ ہے کہ یہ تینوں مجھے چھوڑ جائیں گے. اور میں اکیلی رہ جاؤں گی...... میں کیا کروں آپ ہی کچھ بتاؤ...... وہ بچے مجھے اس طرح گھور رہے تھے جیسے میں ان کے راستے کی کوئی رکاوٹ ہوں...... تھوڑی دیر بعد بیگم باقی کہنے لگیں" لو پھر بھائی جان دعا کرنا اپنی بھابی کے لئے کہ اسے وطن کی مٹی نصیب ہو" اور چلی گئیں۔



شوشہ ایک سفید چوہا

لفظ "شوشہ" کا صوتی تاثر بے حد دلچسپ ہے اور پھر جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں نے یہ شوشہ چھوڑا تو ذہن میں کچھ اس قسم کی تصویر ابھرتی ہے کہ "شوشہ" دراصل کوئی سفید چوہا قسم کی چیز ہے جسے کوئی صاحب جیب میں چھپا کر لاتے ہیں اور کسی بھری محفل میں چھوڑ دیتے ہیں وہاں خوب کھلبلی مچتی ہے اور بالآخر معلوم ہوتا ہے کہ جو شے بڑی تیزی سے ادھر ادھر بھاگ رہی تھی اور جس نے کاروبارِ حیات کو اتھل پتھل کر کے رکھ دیا ہے دراصل شوشہ تھا۔ لوگوں میں کھلبلی مچانے کے بعد وہ صاحب اپنے شوشے کو پکڑتے ہیں، جیب میں ڈالتے ہیں اور اسے کسی اور محفل میں "چھوڑنے" کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔

مختلف قسم کے شوشے حکومتوں اداروں اور اہم شخصیات نے پال رکھے ہوتے ہیں جو وہ بوقت ضرورت چھوڑتے رہتے ہیں قدرے نچلی سطح پر آ جایئے تو آپ اور مجھ ایسے ناچیزوں کے پاس بھی اپنے اپنے چھوٹے موٹے ناتواں قسم کے شوشے ہوتے ہیں لیکن ہمیں ان شوشوں کو چھوڑنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے کیونکہ شوشہ پالنے اور اسے چھوڑنے کے لئے ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ اگر آپ کوئی حکومت ہوں تو سپر پاور ہوں اور اگر ادارہ ہوں تو بہت پاورفل ہوں (جیسے ایل ڈی اے واپڈا، ٹیلی فون وغیرہ) اور اگر شخصیت ہوں تو بااثر ہوں (مثلاً سرکاری افسر سیاست دان وغیرہ) اور اگر آپ یہ سب کچھ نہیں ہیں اور آپ اپنا غریب غربا شوشا چھوڑنا چاہیں تو اوّل تو وہ اتنا ناتواں ہو گا کہ چھوٹنے سے انکار کر

دے گا اور اگر آپ اسے دھکا سٹارٹ کر کے چھوڑ دیں تو لوگ اسے نہیں چھوڑیں
گے اور آپ کو دروغ گوئی اور جعل سازی کے الزام میں دھر لیا جائے گا اور آپ
کے شوشے کو جوتیاں مار مار کر بھگا دیا جائے گا۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد آپ آئندہ کے
لئے تائب ہو جائیں گے اور اپنے شوشے کو بھی ہدایت کریں گے کہ وہ کوئی اور باذر
مالک تلاش کرے۔

حکومتوں کی سطح پر ہر دوسرے روز کسی ایک سپر پاور کی طرف سے بیان جاری کیا
جاتا ہے کہ دنیا میں امن ہونا چاہیئے جنگ نہایت خوفناک چیز ہے تخفیف اسلحہ
نہایت ضروری ہے اور یہ کہ ہمارے ملک نے ہمیشہ دنیا میں امن قائم رکھنے کے
لئے جدوجہد کی ہے یہ بیان ایک شوشہ ہوتا ہے جو چھوٹے موٹے ملکوں کو اطمینان
دلانے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس دوران یہ سپر پاور انہی چھوٹے موٹے ملکوں میں
سے کسی ایک میں امن قائم کرنے کی خاطر اپنی فوجیں بھیج دیتی ہے اس پر دوسری سپر
پاور بے حد اپ سیٹ ہوتی ہے اور فوراً اپنی سرحد کے آس پاس کوئی ایسا ملک تلاش
کرتی ہے جہاں "امن" قائم کیا جائے ایسا ملک دستیاب نہ ہو تو اسے ایسا بنا دیا جاتا
ہے اور پھر فوج کشی کر کے وہاں امن قائم کر دیا جاتا ہے اس عمل کو عرف عام
میں بیلنس آف پاور کہا جاتا ہے۔

اسی طور بین الاقوامی اور ملکی اداروں کے پاس بھی اپنے اپنے پالتو شوشے
ہوتے ہیں جو وہ ہمہ وقت چھوڑتے رہتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے پاس حق رائے دہندگی
کا شوشہ ہے جو وہ کشمیریوں کو خوش کرنے کے لئے کبھی کبھار چھوڑ دیتی ہے۔ ویٹو کا
حق صرف سپر پاورز کو دیا گیا ہے تاکہ وہ بیلنس آف پاور قائم رکھنے کی خاطر اسے
ایک دوسرے کے کیمپ میں وقتاً فوقتاً چھوڑتی رہیں ہمارے اپنے ایل ڈی اے کے

پاس مال روڈ اور نہر کے کناروں کو بیوٹی فائی کرنے کا شوشہ ہے جو وہ بقیہ شہر کی گندگی
اور ٹوٹی ہوئی سڑکوں پر چھوڑتی رہتی ہے واپڈا ایک طرف تو ملک میں بجلی کے اضافے
کی نوید سناتا ہے یا سناتی ہے اور دوسری جانب موسم سرما کے شروع ہوتے ہی پانی
کی کمی کے باعث بجلی کی کمی کا شوشہ چھوڑ دیا جاتا ہے کچھ ایسے شوشے بھی ہیں جو
آدم خور ہیں یعنی لاہور شہر اور اس کے نواح میں دوڑنے والی ویگنیں جو پٹرول کی
بجائے انسانی خون پر چلتی ہیں اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ انہیں کس نے چھوڑ رکھا ہے
اگر موٹر سائیکلیں اور کاروں کے ساتھ ساتھ ان کی بھی چیکنگ ہو تب پتہ چلے کہ
انہیں کس نے چھوڑ رکھا ہے افواہ ہے کہ انہیں چیکنگ کرنے والوں نے ہی چھوڑ
رکھا ہے اور افواہ پر کون یقین کرے کیونکہ یہ شوشے کی چھوٹی بہن ہوا کرتی ہے۔

شوشے چھوڑنے کے سلسلے میں ہمارا ہمسایہ ملک بھی بہت ایڈوانس ہے بلکہ
چھیماپن ہے اس کے پاس انواع و اقسام کے شوشے ہیں جو وہ موقع محل کی مناسبت
سے چھوڑتا رہتا ہے ان میں سے بیشتر شوشوں کا رخ پاکستان کی جانب کر دیا جاتا
ہے کہ جاؤ بچہ وہاں جا کر کھلبلی مچا دو ادھر سے چھوڑے جانے والے سیاسی شوشوں
کی تعداد اتنی زیادہ ہے انہیں یہاں درج کرنا ممکن نہیں اس لئے ماضی میں چھوڑے
گئے صرف ایک شوشے پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ وہ صاحب تاج محل دراصل مغلوں
نے نہیں بلکہ راجپوت ہندوؤں نے تعمیر کیا تھا اور یہ مقبرہ وغیرہ نہیں کسی اعلیٰ قسم
کی دیوی کا مندر ہے یہ شوشہ اگرچہ بہت ہی لاغر اور ناتواں قسم کا تھا لیکن اس
پر خوب بحثیں ہوئیں اور معاملہ ابھی تک حل طلب ہے انہی دنوں لائف
میگزین میں تاج محل کی ایک رنگین تصویر شائع ہوئی جس میں ایک سکھ خاندان
بمعہ اپنی پگڑیوں کے عمارت کے حسن سے لاتعلق مونگ پھلیاں وغیرہ کھا رہا ہے اور
نیچے لکھا تھا یہ عمارت ان کے آباؤ اجداد نے تعمیر کی تھی۔ یعنی شوشے کا احترام کیا تک

پہنچ گیا تھا میں نے ایک محب الوطن ہندوستانی سے اس نئی دریافت کے بارے
میں استفادہ کیا تو اس کا جواب یہ تھا کہ ٹھیک ہے تاج محل بنانے کا حکم تو شاہجہاں
نے دیا تھا لیکن اس پر جو مزدور کام کرتے رہے وہ تو ہندو اور سکھ تھے اب یہ تو
سبط الحسن ضیغم ہی بتا سکیں گے کہ شاہجہاں کے زمانے میں سکھوں کی تعداد کتنی تھی
لیکن اگر اس شوشے کو مان لیا جائے کہ عمارت بنوانے والے کے نام نہیں ہوتی بلکہ
اسے تعمیر کرنے والے افراد کی ہوتی ہے تو اس سے بے شمار شوشے جنم لے سکتے ہیں
مثلاً یہ کہ اہرام مصر یہودیوں نے بنائے تھے، مسجد قرطبہ کی تعمیر میں چونکہ عیسائی
کاریگر بھی شامل تھے اس لئے وہ عیسائیوں نے تعمیر کی تھی۔ وینس کے ایک کلیسا
کی تعمیر میں بھی ترکوں نے حصہ لیا تھا اس لئے وہ کلیسا دراصل ترکوں نے بنایا تھا۔
سکھوں کے مقدس دربار صاحب کا سنگ بنیاد چونکہ میاں میر صاحب نے رکھا تھا
اس لئے یہ بات نکلتی ہے تو بہت دور تک جا سکتی ہے۔

اسی شوشے نے میری راتوں کی نیند اڑا دی ہے کیونکہ میں براہ راست اس کی زد میں
آیا ہوں یعنی میں نے دھکے کھا کھا کر اور مقروض ہو کر ایک مکان بنوایا ہے وہ
اس شوشے کی رُو سے میرا نہیں بلکہ مستری غلام علی اور ہدایت کا ہے۔

ایک حالیہ سروے کے مطابق

آج صبح سویرے اپنے بزرگ ادیب خلیفہ خلفشاری میرے ہاں تشریف لے آئے
اور آتے ہی کہنے لگے بھائی میاں پنکھا چلتا ہے؟

میں نے عرض کیا "جی چلتا ہے" اور انہیں پنکھے کے نیچے بٹھایا۔

"واہ واہ کیا خوب گھومتا ہے" انہوں نے اس پر ایک محبت بھری نظر ڈالتے
ہوئے کہا "اپنے ہاں تو اس وقت لوڈ شیڈنگ ہے۔ گرمی کے ہاتھوں ستائے ہوئے
بچے بیگم کو تنگ کر رہے تھے اور بیگم ہمیں کاٹنے کو دوڑ رہی تھیں اس لئے ہم ادھر
دوڑ آئے اور آنا تو ویسے بھی تھا کیونکہ تم سے کچھ پوچھنا تھا؟

"جی ارشاد" میں نے بصد ادب عرض کیا۔

"یہ سروے وغیرہ کون لوگ کرتے ہیں؟

"کونسا سروے؟

"وہی والا جس کے بارے میں اخباروں میں چھپتا ہے کہ ایک سروے کے مطابق
..... یا ایک حالیہ سروے میں...... تو یہ سروے کون لوگ کرتے ہیں؟

"پتہ نہیں خلیفہ..... بھلے لوگ ہی ہوں گے جو کرتے ہیں"

"میں تو ٹینٹوا دبا دوں ان سب کا......" خلیفہ غصے سے بولے "میری تو
زندگی اجیرن کر رکھی ہے ان سروے والوں نے....."

"کیوں؟ میں نے بے حد حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"بھئی یہ لوگ ہر شے میں ٹانگ اڑاتے چلے جاتے ہیں، دنیا میں کوئی ایسا موضوع

نہیں ہے۔ جس کے بارے میں سروے نہ کیا جاتا ہو۔ عجیب و غریب سروے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ مثلاً اخبار اٹھا کر دیکھ لو اس میں اس قسم کی رپورٹیں ہوں گی کہ ایک حالیہ سروے کے مطابق خربوزے کھانے سے بینائی کمزور ہو جاتی ہے۔ دوسرے صفحے پر درج ہو گا کہ ایک سروے کے مطابق خربوزے کھانے سے بینائی تیز ہو جاتی ہے۔۔۔۔“

”لیکن علامہ اسے تو تحقیقی رپورٹ کہا جائے گا، سروے تو۔۔۔۔؟“

”بھئی ہم جو کچھ پڑھتے ہیں وہ تحقیقی رپورٹ نہیں ہوتی اس کا ہلکا پھلکا سروے ہوتا ہے۔۔۔۔ غسل خانے میں جاتا ہوا ڈرتا ہوں کہ جانے دنیا کے کس حصے میں یہ سروے ہوا ہو گا کہ غسل خانے میں جانے والے کتنے فیصد لوگ دانتوں پر برش پھیرتے پھیرتے فوت ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے میں بھی اس فیصد کا ایک حصہ بن جاؤں۔۔۔۔ کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے سوچ لیتا ہوں کہ اس کے بارے میں کوئی سروے تو نہیں ہو چکا۔ بھئی سچ پوچھو تو میں سروے کو سچ سمجھتا ہوں ان پر یقین رکھتا ہوں۔۔۔۔“

”تو پھر شکایت کس بات کی خلیفہ؟“

”میرے بچوں نے حد کر دی۔۔۔۔۔۔ پہلے تو روزانہ ایک روپیہ فی کس انہیں جیب خرچ کے طور پر دیا جاتا تھا پھر ایک روز بڑے صاحبزادے فرمانے لگے کہ ابو وہ ٹمبکٹو میں ایک سروے ہوا ہے جس کے مطابق بچوں کو صرف ایک روپیہ جیب خرچ دینے سے ان کی ذہنی نشوونما پر برا اثر پڑتا ہے۔ میں نے ان کا جیب خرچ بڑھا دیا۔۔۔۔ مجھے بھنڈی توری بہت پسند ہے۔ ان دنوں گھر میں روزانہ پکتی ہے۔ کل منجھلے صاحب زادے فرمانے لگے کہ ابو جنوب مشرقی اور شمال مغربی ٹوگولینڈ میں ایک سروے ہوا ہے جس کے مطابق بھنڈی توریاں کھانے سے انسان اول جلول ہو جاتا ہے۔۔۔۔ چنانچہ ہماری بھنڈی توری بند ہو گئی۔۔۔ پچھلے ماہ نیا ٹیلی ویژن خریدنے گئے تو سب سے چھوٹی بیٹی کہنے لگی' ابو کیا ہم اچھے ہیں یا بن مانس؟ میں

بے حد حیران ہوا کہ یہ بن مانس کہاں سے آ گئے بہر حال میں نے کہا کہ بیٹا جان دفع کرو موئے بن مانسوں کو تم زیادہ اچھے ہو۔ اس پر وہ خوش ہو کر بولی' تو پھر آپ ہمیں رنگین ٹیلی ویژن خرید کر دیں۔ اب میں تو گھر سے نکلا تھا بلیک اینڈ وہائٹ ٹیلی ویژن کی رقم جیب میں ڈال کر اور یہاں رنگین کی فرمائش ہو رہی تھی چنانچہ میں نے انہیں ڈانٹا کہ نہیں آپ فی الحال بلیک اینڈ وہائٹ سے ہی گذارہ کریں۔۔۔۔۔ اس پر چھوٹی بیٹی نے منہ بسور کر کہا،

ابو اس کا مطلب ہے کہ ہم سے بن مانس اچھے ہوتے ہیں۔۔۔ اب دیکھئے ناں ایک حالیہ سروے کے مطابق بن مانس بھی ٹیلی ویژن دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اور رنگین پروگراموں کو ترجیح دیتے ہیں۔۔۔۔۔ اب بن مانس جو ہیں وہ رنگین ٹیلی ویژن دیکھیں اور ہم بلیک اینڈ وہائٹ، تو ہم سے وہی اچھے ہوئے۔۔۔۔“ بہر حال قرض لیا اور رنگین لیا۔۔۔۔ ان سروے والوں نے تو میری زندگی اجیرن کر دی ہے“ علامہ پنکھے کے نیچے بیٹھ کر قدرے بحال ہوئے، چائے کی ایک پیالی نوش فرمائی اور پھر رخصت ہونے سے پیشتر کھانس کر بولے“ اور ہاں خوب یاد آیا میں نے دو سو روپے صرف دو روز کے لئے ادھار دیئے تھے اب دو ماہ ہونے کو آئے بھئی وہ تو واپس کر دو۔۔۔۔“

”ہائے ہائے خلیفہ خلفشاری“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا” تمہیں شرم آنی چاہیئے۔“

”کیوں۔۔۔۔“ خلیفہ مچلے” تم نے مجھ سے ادھار نہیں لیا تھا؟“

”لیا تھا۔۔۔۔ لیکن ایک حالیہ سروے کے مطابق اگر جمعرات کی صبح کو۔۔۔۔ اور آج جمعرات کی صبح ہے۔۔۔۔ کسی سے قرض واپس مانگا جائے تو وہ بے چارہ اول جلول ہو جاتا ہے۔۔۔۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں اول جلول ہو جاؤں۔۔۔۔ کم از کم میں تو نہیں چاہتا اس لئے خدا حافظ۔۔۔۔“

انشورنس کی گدھا سکیم

ایک کامیاب سیلزمین کی تعریف کچھ یوں کی جاتی ہے کہ وہ اپنی گفتگو سے ایک اسکیمو کو بھی قائل کرلے گا کہ اسے ایک عدد فریج خریدنا چاہیے یا وہ اپنی باتوں سے ایک تنور والے کے آگے الیکٹرک ہیٹر فروخت کردیتا ہے کچھ اسی طور ایک انشورنش ایجنٹ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک انتہائی خوشگوار اور زندگی سے بھرپور صبح کو آپ کے پاس آئے گا اور کہے گا کہ جناب آپ دیکھنے میں تو بالکل بھلے چنگے نظر آتے ہیں ماشاء اللہ صحت مند ہیں لیکن فرض کیجیے کہ ابھی اسی وقت آپ دھڑام سے نیچے گرپڑیں اور فوت ہوجائیں تو؟...... اس پر آپ یقیناً یہی کہیں گے کہ بھائی صاحب زندگی اور موت تو اللہ کے اختیار میں ہے لیکن فی الحال میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں آپ خواہ مخواہ میرا وقت ضائع نہ کریں میں انشورنس نہیں کراؤں گا......
تب وہ انشورنش ایجنٹ آپ کے سامنے آپ ہی کی موت اور اس کے بعد آپ کے بال بچوں کی حالتِ زار کا ایسا دلدوز نقشہ کھینچے گا کہ آپ اپنی ہی موت پر آبدیدہ ہونے لگیں گے اور انشورنس کروانے کی حامی بھر لیں گے کہا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کی شخصیت انتہائی باوقار اس کا لباس نہایت دیدہ زیب اور اس کی گفتگو بے حد مسحور کن ہو اور حیرت انگیز طور پر اس کی تمام دلچسپیاں اور مشاغل وہی ہوں جو آپ کے ہیں تو بس جان لیجیے کہ وہ یا تو ایک عدد عاشق ہے اور یا وہ انشورنش ایجنٹ ہے۔ ویسے تو عاشق بھی ایک طرح کا انشورنس ایجنٹ ہی ہوتا ہے یعنی یہ زندگی

چند روزہ ہے جو کچھ کرنا ہے کر گزرو.....
انسانوں، کارخانوں، عمارتوں اور کاروں وغیرہ کی انشورنس تو سننے میں آتی رہتی ہے لیکن انہی دنوں ایک انشورنش کمپنی کی جانب سے جانوروں وغیرہ کو بھی یہ نوید سنائی گئی ہے کہ آپ بھلا کسی سے کم ہیں اب تاریخ میں پہلی مرتبہ آپ کی انشورنش بھی ہوسکتی ہے ہماری کمپنی سے رجوع کریں اور اپنے بچوں اور مالکوں کا مستقبل محفوظ کریجیے۔ البتہ اس اشتہار میں واضح نہیں کیا گیا کہ مویشیوں اور جانوروں کو انشورنش کی جانب مائل کرنے کے لیے ایجنٹ انسان ہوں گے یا اس مقصد کے لئے خصوصی طور پر جانور بھرتی کیے جائیں گے لیکن ہم فرض کرلیتے ہیں کہ یہ خوشگوار فریضہ بھی عام انسان ایجنٹ ہی سرانجام دیں گے۔ ظاہر ہے ان ایجنٹوں کی تمام تر ٹریننگ صرف انسانوں کو بیمہ کرنے کے لئے ہوگی چنانچہ انہیں کسی خصوصی ٹریننگ کورس میں ان آداب سے روشناس کرایا جائے گا جو کسی جانور یا مویشی کو انشورنش کی طرف مائل کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہوں گے۔ اس ٹریننگ کورس میں انہیں یہ بھی بتایا جائے گا کہ کس جانور کے سامنے جاکر بیٹھا جائے اور کون سے جانور کے پیچھے جاکر گفتگو کی جائے۔ اور کئی ایسے بھی جانور ہیں جن کے آگے پیچھے بیٹھنے کی بجائے یہ بہتر ہوگا کہ ان کے قریب کسی درخت پر براجمان ہوکر گفتگو کی جائے مثلاً شیر وغیرہ
اس خصوصی ٹریننگ کے بعد ایک انشورنس ایجنٹ مثلاً خان صاحب فیلڈ میں نکلتے ہیں اور سب سے پہلے ایک گدھے کے پاس پہنچتے ہیں۔ انہیں علم ہے کہ گدھے کے پیچھے سے نہیں گزرنا چاہیے ورنہ دولتی پڑے گی اور وہ سامنے جاکر آداب بجالاتے ہیں اور کہتے ہیں "صبح بخیر گدھے صاحب کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہماری انشورنش کمپنی نے دنیا کے تمام گدھوں کا مستقبل تابناک بنانے کے لئے ایک بالکل نئی "گدھا سکیم" تیار کی ہے۔ اگر آپ اس سکیم کے تحت انشورنش

کرواتے ہیں تو آپ کی وفات کی صورت میں آپ کی بیگم اور آپ کے بچوں یعنی گدھے کے بچوں کو ایک چراگاہ پیش کی جائے گی جہاں وہ اپنی بقیہ زندگی چین سے چرتے ہوئے گذار سکتے ہیں...... کہیے کیا خیال ہے؟..... اس پر گدھے صاحب ایک لمبی ڈھینچوں کریں گے۔ اور کہیں گے "بیگم صاحبہ ایک عرصے سے غائب ہیں۔ بچوں کا بھی کچھ پتہ نہیں کہ کتنے ہیں اور کہاں ہیں... میں انشورنس پھر بھی کروا لوں گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ میری کمر پر ذرا کھجلی کر دیں۔ بڑی دیر سے بے چین ہو رہا ہوں"..... خان صاحب انتہائی مستعدی سے گدھے کی کمر پر کھجلی کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں اور اس دوران اپنی ٹریننگ بھول کر ایک ایسے مقام پر جا کھڑے ہوتے ہیں جو دولتی مارنے کے لئے انتہائی موزوں ہوتا ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ گدھے کے ساتھ کنویسنگ کرنے کے بعد خان صاحب کو چند روز کے لئے "چک" پڑ جاتی ہے اور وہ فیلڈ سے باہر ہو جاتے ہیں۔

روبصحت ہونے کے فوراً بعد خاں صاحب ایک نئے عزم کے ساتھ کھیت میں کام کرنے والے ایک بیل کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور گفتگو کا آغاز کچھ یوں کرتے ہیں "جناب بیل صاحب" آپ کی زندگی کیا ہے؟ غم کا ایک دریا ہے جو بہتا چلا جاتا ہے، دن رات مشقت کرتے رہتے ہیں، کیا آپ نے کبھی اپنے بہتر مستقبل کے لئے سوچا ہے؟ فرض کیجیے کہ آپ آج ہی مر جاتے ہیں تو پھر کیا ہوگا؟ بیل سر اٹھاتا ہے۔ اور بڑے اطمینان سے کہتا ہے "ہوگا کیا؟ چمڑا اتار لے جائیں گے اور ماس گدھ کھا جائیں گے" اس پر خاں صاحب مسکرا کر کہتے ہیں "نہیں بھائی.... میرا مطلب ہے آپ کے مالک کا کیا ہوگا...... وہ غریب تو بھوکا مر جائے گا" بیل اس سادہ لوح انسان کی بے وقوفی پر خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے "نہیں جناب وہ بھوکا نہیں مرے گا بلکہ ایک اور بیل خرید لائے گا....؟"

خان صاحب اچھل پڑتے ہیں "بالکل..... لیکن اس کے پاس رقم کہاں سے آئے گی۔ اگر آپ ہماری کمپنی سے بیمہ کروالیں تو آپ کی وفات کے بعد آپ کے مالک کو اتنی رقم مل جائے گی کہ وہ ایک کی بجائے دو بیل خرید ے گا....؟" بیل ناراض ہو کر کہتا ہے "آپ میرے سینگوں کی زد سے باہر ہیں ورنہ آپ کی حماقت کا احساس دلاتا بھئی اگر میں خود مر جاتا ہوں تو مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرا مالک ایک بیل خریدتا ہے یا دو...... میں تو فوت ہو گیا ناں.... اور اس کے علاوہ ہم مویشیوں میں ایک کہاوت ہے کہ ہمیں کچھ فرق نہیں پڑتا کہ ہم کہاں ہیں اور کیسے ہیں ہم نے چارہ ہی کھانا ہے بس....."

خاں صاحب مایوس ہو کر واپس آجاتے ہیں۔ لیکن ایک کامیاب انشورنس ایجنٹ کی طرح وہ کبھی بھی مایوس نہیں ہوتے چنانچہ وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ بڑے بڑے جانوروں کی بجائے مسکین اور چھوٹے چھوٹے جانوروں پر قسمت آزمائی کی جائے۔ اس دوران اتفاق سے ان کا گذر پولٹری مارکیٹ میں سے ہوتا ہے، جہاں ایک بڑے ڈربے میں سینکڑوں مرغیاں بند ہیں۔ ان کی رگِ انشورنس پھڑکتی ہے اور وہ مرغیوں سے محوِ کلام ہو جاتے ہیں "تمام مرغ اور مرغیوں کی خدمت میں آداب آپ سب آج تک اپنے مستقبل سے غافل رہے ہیں، میں آپ کو اس خوابِ غفلت سے جگانے آیا ہوں، کبھی یہ بھی سوچا کہ تمہاری موت کے بعد تمہارے ننھے منے چوزوں کا کیا ہوگا۔ تمہارے رحم دل مالک پر کیا گزرے گی؟۔ آج ہی ایک روپیہ فی مرغی کے حساب سے انشورنس کروا لو اور عیش کرو"..... مرغیوں کا رحم دل مالک بھی قریب ہی کھڑا ہے، چنانچہ وہ باقاعدہ آبدیدہ ہو کر پوچھتا ہے کہ جناب یہ تو بہت بھولی بھالی مخلوق ہے، مجھ سے بات کیجیے یہ لیجیے ایک سو دس روپے اور میری پیاری مرغیوں کی زندگی کا بیمہ کر دیجیے۔ خاں صاحب اس کامیابی پر بے حد نازاں ہوتے ہیں اور رقم

وصول کرکے ہیمہ کر دیتے ہیں اس کامیاب مشن کی رپورٹ دینے کے لئے جب وہ اپنے دفتر پہنچتے ہیں تو مرغیوں کا مالک اُن سے پہلے وہاں موجود ہے، اور اب بھی آبدیدہ ہے اور کہتا ہے "جناب میری ساری مرغیاں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اور اس وقت روسٹ کرنے والی مشینوں پر گھوم رہی ہیں۔ براہِ کرم فی مُرغی تیس روپے کے حساب سے تین ہزار تین سو روپے کی ادائیگی کر دیں۔ آپ کے فارم میں لکھا ہے کہ صرف خودکشی کی صورت میں ادائیگی نہیں ہوگی تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انہوں نے خودکشی نہیں کی بلکہ باقاعدہ حلال کی گئی ہیں"۔..... خاں صاحب کی کمپنی کو مجبوراً ادائیگی کرنا پڑتی ہے اور یہ رقم ان کی نالائقی کی وجہ سے ان کی تنخواہ میں سے کاٹ لی جاتی ہے۔ تب خاں صاحب فیصلہ کرتے ہیں کہ اب وہ کسی ایسے جانور کی انشورنس کریں گے جس کے مرنے اور مارنے کا احتمال کم ہو چنانچہ وہ چڑیا گھر جا کر ایک شیر کے سامنے جا بیٹھتے ہیں۔

اسی شام ایک شیر انشورنس کمپنی کے دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہاں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ تمام کارندے فرار ہو جاتے ہیں صرف منیجر صاحب اتنے بہادر ہوتے ہیں کہ اپنی کرسی پر بیٹھے رہتے ہیں۔ کیونکہ شیر کمرے کے واحد دروازے میں آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ شیر بھی آبدیدہ ہو کر کہتا ہے "کیا آپ کے ایجنٹ خاں صاحب نے انشورنش بھی کروا رکھی تھی؟ اگر کروا رکھی تھی تو مہربانی کرکے بیمے کی رقم ان کے بال بچوں کو دے دی جائے۔ اس پر منیجر صاحب ہکلاتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ خاں صاحب اس وقت کہاں ہیں؟...." شیر ایک لمبا ڈکار لیتا ہے اور میز پر رکھی سیون اپ کی بوتل اٹھا کر پینے لگتا ہے۔

بچے ہوں گے تو طوطے ہوں گے

آج سے تقریباً پندرہ برس پیشتر دسمبر کی ایک غیر معمولی طور پر خنک رات تھی رضائی میں گھسنے سے پیشتر مجھے احساس ہوا کہ صبح کے لئے سگریٹوں کا ذخیرہ ختم ہے اور صبح چھٹی کا دن بھی تھا، چنانچہ میں اپنے آپ پر جبر کرکے اٹھا اور مال روڈ پر آ گیا اس وقت کوئی بارہ بجے کا عمل تھا۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ ایک کھوکھے سے سگریٹ کا پیکٹ خرید کر میں واپس جا رہا تھا کہ ایک سکوٹر ہارن دیتا ہوا میرے قریب آ کھڑا ہوا۔ سکوٹر پر معراج پتھر سوار تھا۔ اس نے اپنے مختصر سراپے پر اتنے زیادہ کوٹ اور اوورکوٹ وغیرہ چڑھا رکھے تھے کہ میں اسے پہچان نہ پایا۔ تب اس نے مفلر میں سے منہ نکال کر اپنے بھاری آواز میں کہا "السلام علیکم تارڑ صاحب اتنی سردی میں اور رات کے اس وقت مال روڈ کی سیریں کر رہے ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے کہا معراج پتھر میں تو سگریٹ خریدنے کے لئے نکلا تھا۔ تم کس سلسلے میں گھوم رہے ہو؟

"میں طوطا دیکھنے کے لئے گیا تھا" وہ بولا۔

"طوطا؟....." میں نے حیرت پوچھا۔

معراج پتھر اگرچہ عجیب و غریب عادات و خصائل کا مالک ہے لیکن رات کے بارہ بجے وہ طوطا دیکھنے کے لئے نکلا ہوا ہے، یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔

"ہاں ہاں طوطا نہیں ہوتا۔ تو تیا من تو تیا والا طوطا۔ ہریل طوطا"

"اچھا تو پھر دیکھ لیا؟" میں نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"نہیں" اس نے مایوس ہو کر کہا "چڑیا گھر بند ہے"۔

"ظاہر ہے کہ آدھی رات کے وقت تو چڑیا گھر بند ہوتا ہے، جانوروں کو بھی آرام کی ضرورت ہوتی ہے"۔

"تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہو، جس کے پاس طوطا ہو اور ہم اس طوطے کو دیکھ سکیں؟" اس نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

تب میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور میں نے خاصی درشتگی سے معراج پتھر سے مخاطب ہو کر کہا بھائی جان میرے مہربان آپ کا دماغ تو درست ہے؟ یا تو تم مجھے اُلّو بنا رہے ہو اور یا تم خود اُلّو بن چکے ہو۔

معراج پتھر ہنسنے لگا۔ تمہاری شادی ہو گی ناں پھر تم بھی اُلّو بن جاؤ گے میری طرح۔

میں نے کہا کہ یہ شادی اور طوطے کا کیا تعلق ہے؟

کہنے لگا، بہت گہرا تعلق ہے جناب۔ شادی ہو گی تو بچے ہوں گے... ٹھیک، اور بچے ہوں گے۔ تو طوطے ہوں گے۔

"بچے ہوں گے یا طوطے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے۔ معراج پتھر میں جا رہا ہوں یا تو تم اپنی طوطا کہانی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ ورنہ میں جا رہا ہوں"۔

"اوئے باندر" معراج پتھر نے سکوٹر کے آگے رکھی ہوئی ایک بڑی سی گٹھڑی سے مخاطب ہو کر کہا "سلام کر چاچے کو"۔

اس گٹھڑی میں سے پہلے ایک چھوٹا سا ہاتھ برآمد ہوا، پھر ایک ننھا چہرہ اور اس نے ٹھٹھرتے ہوئے کہا "سلام چاچا جی"۔

"اوئے یہ کیا ہے؟" میں نے پتھر سے پوچھا۔

تمہارا بھتیجا ہے۔ تارڑ صاحب؟

"اتنی سردی میں اس غریب کے بال کو کیوں لئے پھر رہے ہو؟"

"اس غریب کے بال کی وجہ سے تو میں اس سردی میں پھر رہا ہوں،... جناب ہوا یہ کہ ہم سارے سوئے ہوئے تھے اپنی اپنی رضائیوں میں..... اور یہ باندر میرے پاس سوتا ہے۔ یہ بھی سویا ہوا تھا، آدھی رات کو اُٹھ بیٹھا اور رونے لگا۔ میں نے دھمکیاں دیں، پیار کیا لیکن یہ چپ نہ ہوا.... کہنے لگا پہلے طوطا دکھاؤ پھر چپ کروں گا۔ میں نے بہتیرا سمجھایا کہ چاند میرے، صبح ہو جانے میں تمہیں طوطے کبوتر، شتر مرغ جو کہو گے دکھا دوں گا لیکن اس کی ایک ہی رٹ کہ میں تو طوطا دیکھوں گا اور اسی وقت دیکھوں گا..... میں اب اتنا بھی بے وقوف نہیں کہ تارڑ صاحب کہ مجھے یہ بھی نہ پتہ ہو کہ رات کو چڑیا گھر بند ہوتا ہے۔ پر اس کی ضد تھی، چنانچہ مجبوراً اٹھا، یہ تمام اوورکوٹ وغیرہ پہنے اسے کپڑے پہنائے اسکوٹر نکالا اور اب اسے چڑیا گھر کا بند دروازہ دکھا کر واپس گھر جا رہا ہوں"۔

میں نے کہا معراج پتھر اتنی مصیبت کرنے کی بجائے ایک تھپڑ لگا دیا ہوتا خود ہی چپ کر جاتا۔

معراج پتھر مسکرانے لگا، اپنی اولاد کو اتنی آسانی سے نہیں مارا جا سکتا تارڑ جی..... بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے..... ان کا کہنا ماننا پڑتا ہے..... جب شادی ہو گی ناں اور بچے ہوں گے تب پوچھوں گا کہ سناؤ جی اولاد کو کبھی اس بات پر تھپڑ مارا کہ وہ طوطا دیکھنا چاہتی ہے... خدا حافظ۔

معراج پتھر چلا گیا اور میں سوچتا رہا کہ کتنا احمق انسان ہے اتنی سردی کے باوجود بچے کی ایک ناممکن خواہش کے لئے بستر کا آرام چھوڑ کر طوطا تلاش کر رہا ہے۔

پھر میری بھی شادی ہو گئی۔ اللہ نے اولاد کی نعمت سے نوازا... سردیوں

کی ایک رات تھی، میرا اجڑا بیٹا سلجوق جو اس وقت تین چار برس کا تھا۔ اچھا اور رونے لگا میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ کہنے لگا! ابو مکھن ٹافی کھانی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ تمام دکانیں بند ہو چکی ہیں لیکن میں نے کپڑے بدلے گھر سے نکلا اور آدھا شہر چھان کر اس کے لئے مکھن ٹافیوں کا ایک پیکٹ ڈھونڈ کر لے آیا۔ تب مجھے معراج پتھر بہت یاد آیا۔

آج صبح میں گرمی سے بھنایا ہوا بیٹھا تھا کہ معراج پتھر ایک عرصے کے بعد پھر سے نازل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ایک آٹھ دس سالہ بچہ تھا اندر داخل ہوتے ہی اس نے بچے کے سر پر ایک ہلکی سی چپت رسید کی "اوئے باندر، سلام کر چاچے کو" پیارے بچے نے مجھے سلام کیا اور بیٹھ گیا۔ "آپ کا بھتیجا ہے؟" معراج پتھر نے حسب عادت دونوں پاؤں کرسی پر رکھے اور سگریٹ کا ایک لمبا سوٹا لگایا۔

"یہ وہی ہے طوطے والا؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں جی وہ تو ماشاء اللہ اب جوان ہو چلا ہے یہ چھوٹے والا ہے وہی جو گٹر میں جا پڑا تھا" ادھر ادھر کی سیاسی اور سماجی گپ شپ کے بعد معراج کہنے لگا۔ "تمہارے پاس ایک کام سے آیا ہوں"۔ میں نے کہا فرماؤ۔

پتھر کہنے لگا، اپنے بھتیجے کو گھوڑا دکھا دو۔

"گھوڑا؟ کون سا گھوڑا؟"

"وہی جس کے ساتھ تم باتیں کرتے رہے ہو"

"معراج پتھر گرمی بہت ہے مجھے تنگ مت کرو۔ کون سا گھوڑا؟"

"یار تم نے کالم نہیں لکھا تھا، پچھلے ہفتے کہ تخم ملنگاں کا شربت پیتے ہوئے تم سے ایک گھوڑا باتیں کرنے لگا تھا؟"

"ہاں لکھا تو تھا لیکن یار وہ تو گرمی کا اثر تھا۔ میرا دماغ چل گیا تھا...... اور

کالموں وغیرہ کو اتنی سنجیدگی سے نہیں لیا کرتے"۔

"میں تو نہیں لیتا" اس نے بچے کے گال پر ایک اور چپت رسید کی "لیکن یہ لیتا ہے...... پچھلے ہفتے مجھے کہنے لگا کہ ابا یہ گھوڑے کے پیچھے دو پہیے کیوں لگے ہوتے ہیں...... میں نے بتایا کہ وہ اس کے پہیے نہیں ہوتے بلکہ ٹانگے یا ریڑھے کے پہیے ہوتے ہیں...... کہنے لگا، میں نے آج تک جتنے گھوڑے دیکھے ہیں ان کے پیچھے پہیے ہوتے ہیں...... میں خالص گھوڑا دیکھنا چاہتا ہوں...... لو جی تارڑ صاحب اسے سکوٹر پر بٹھا کر سارا شہر چھان مارا لیکن کہیں بھی خالص گھوڑا نہیں ملا۔ ایک وقت ہوتا تھا کہ اس شہر کی سڑکوں پر گھوڑے زیادہ اور باقی سواریاں کم ہوتی تھیں۔ پھر گھوڑے ٹانگوں اور ریڑھوں میں بندھ گئے۔ اور اب صرف گھوڑا نظر نہیں آتا...... آپ کا کالم مجھے اچھا لگا، میں نے اسے سنایا تو کہنے لگا۔ بس کام بن گیا۔ اس چاچے کے پاس گھوڑے ہوں گے مجھے دکھاؤ۔ چنانچہ تمہارے پاس لے آیا...... اب دکھاؤ گھوڑا؟"

میں گھوڑا کہاں سے دکھاتا صرف دانت دکھائے اور بچے سے کہا برخوردار لاہور کا چڑیا گھر مختلف ممالک سے چھ لاکھ روپے مالیت کے جانور برآمد کر رہا ہے جن میں کنگرو، چیتے، بندر اور مختلف پرندے شامل ہوں گے گوریلا منگوانے کا بھی ارادہ تھا۔ تاہم جگہ کی کمی کی وجہ سے اسے منگوانے کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا ہے.... میں اپنی پہلی فرصت میں چڑیا گھر والوں سے ملاقات کروں گا۔ اور سفارش کروں گا کہ دیگر جانوروں کے علاوہ چند گھوڑے بھی درآمد کر لئے جائیں تاکہ لاہور کے بچے لوگ اصلی گھوڑے دیکھ سکیں۔

معراج پتھر اٹھا قدرے مایوس اور ملول کہ بچے کی خواہش پوری نہیں ہو سکی اور "سا مالیکم" کر کے چلا گیا...... اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ لاہور میں

واقعی جانور کم ہوتے جا رہے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ایک عرصے سے میں نے بھی اصلی گھوڑا نہیں دیکھا جب دیکھا پہیوں کے ساتھ دیکھا۔ ایک زمانے میں بندر اور ریچھ کا تماشہ دکھانے والے گلی گلی ملتے تھے، جانے کہاں گئے۔ کبوتر اور بٹیرے وغیرہ رکھنے کا رواج بھی ختم ہو چلا ہے۔ اندرون شہر لوگ بٹیرے بھی پالتے تھے...... شاید جانوروں کے لئے اب ہمارے پاس وقت نہیں رہا یا شاید اب ہمیں جانوروں کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ ان دنوں انسانوں میں ہی جانوروں کی بیشتر خصوصیات ملنے لگی ہیں۔

چوہانیت اور انسانیت

خبر یہ ہے کہ ادھر مغرب میں آج کل کچھ عجیب و غریب تجربات کئے جا رہے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ چوہوں میں کچھ انسانی جراثیم یا مادے وغیرہ داخل کر کے دیکھا جا رہا ہے کہ ایسا کرنے سے چوہا صاحب کو کیا ہوتا ہے وہ چوہا بھی رہتا ہے یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان تجربات کے خلاف مغرب کے چوہا دان حضرات اور "چوہوں سے پیار کرو سوسائٹی" کے اراکین نے شدید احتجاج کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ چوہوں میں انسانی مادے داخل کر دینا چوہا پن اور "چوہانیت" کی تذلیل ہے کیونکہ اس طرح ان میں انسانیت پیدا ہونے کا امکان ہے اور یہ کسی بھی چوہے کے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ اس میں انسانیت پیدا ہو جائے یورپ اور امریکہ کی پبلک کے بارے میں یہ تو معلوم تھا کہ وہ جانوروں سے بے حد پیار کرتے ہیں اور وہاں "کتوں سے پیار کرو انجمن"، "سانپ آپ کے رفیق ہیں"، "گھوڑے انسانوں سے بہتر ہیں" اور "گلہریوں سے محبت کرنے والوں کی سوسائٹی" وغیرہ قسم کی مختلف تنظیمیں ہیں جو کتوں، سانپوں، گھوڑوں اور گلہریوں کی فلاح و بہبود کے لئے دن رات کام کر رہی ہیں مگر یہ معلوم نہ تھا کہ وہاں چوہوں کے عشاق بھی وافر تعداد میں پائے جاتے ہیں ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ مغرب میں کتے کو کتا نہیں سمجھا جاتا گدھے کو گدھا نہیں سمجھا جاتا اور انسان کو انسان نہیں سمجھا جاتا...... تو پھر یقیناً وہاں چوہے کو بھی چوہا نہیں سمجھا جاتا۔ انگلستان میں میرے ایک استاد ہوا کرتے تھے جن کا اسم گرامی مسٹر گرانٹ تھا موصوف

ہمہ صفت انگریز تھے یعنی انہیں جب دیکھا سکاٹش ٹویڈ کے ایک بوسیدہ کوٹ میں ملبوس دیکھا جس کی کہنیاں گھٹنے ٹیک چکی تھیں ورسٹڈ کی گرے پتلون کسی زمانے میں سیاہ تھی جو دھیرے دھیرے گرے ہو چکی تھی جیب میں دس بیس پینی سے زیادہ مالیت کے سکے نہیں رکھتے تھے کیونکہ پورا ایک پاؤنڈ لئے پھرنے سے بقول ان کے طبیعت فضول خرچی کی جانب مائل ہو جاتی تھی شیو روزانہ کرتے لیکن کسی ایسے بلیڈ سے جو اب تک اپنی خصلت بھول چکا تھا بال بھی خود کاٹتے تھے...... اور پاکستانی کھانوں کے بے حد شوقین تھے چنانچہ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ میرے کمرے میں عین اس وقت داخل ہو جاتے۔ جب میں بڑی مشقت سے پکایا ہوا آلو قیمہ سامنے رکھے ڈبل روٹی کا نوالہ بنا رہا ہوتا......" آہا زبردست مشرقی خوشبو ہے" مسٹر گرانٹ ہاتھ ملتے ہوئے کہتے اور مجھے مجبوراً کہنا پڑتا کہ آیئے ناں مسٹر گرانٹ ایک لقمہ لیجئے اور مسٹر گرانٹ میری پورے ہفتے کی ہانڈی چٹ کر کے چلے جاتے...... ان کے روز روز کے چھاپوں سے تنگ آکر ایک اتوار میں خود ان کے گھر جا دھمکا اور جاتے ہی کچن کی جانب ناک اٹھا کر بولا" آہا مسٹر گرانٹ کیا زبردست مغربی خوشبو ہے"...... اب مسٹر گرانٹ بے چارے کیا کرتے انہوں نے مجبوراً مجھے بھی کھانے کی دعوت دے ڈالی اگرچہ مسز گرانٹ انہیں گھورتی رہیں کیونکہ میز پر جتنی خوراک تھی وہ مسٹر گرانٹ، مسز گرانٹ اور ان کے بیٹے ٹونی کے لئے بھی بہت کم تھی، بہر حال کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔

ٹونی ایک بارہ سالہ چپ چاپ قسم کا بچہ تھا اور ایک کھلے گلے کی قمیض پہنے ہوئے تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے کھانا کھانے لگا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی قمیض کو درست کرنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی قمیض کے اندر کوئی شے ہے جو باہر آنا چاہتی ہے اور ٹونی اسے مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے۔ وہ شے حرکت میں تھی اور باقاعدہ پھدک رہی تھی۔

"برخوردار" یہ کیا شے ہے جسے تم اتنی محبت سے بھینچ رہے ہو؟" میں نے مچھلی کا ایک قتلہ منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

ٹونی نے باچھیں کھلا کر کہا" انکل چوہا ہے"

اس انکشاف پر انکل کی مچھلی منہ سے باہر آتے آتے بچی۔

"چوہا"

"جی انکل میرا پالتو ہے سفید رنگ کا ہے اور بے حد فرمانبردار" یہ کہہ کر اس نے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک خاصا گورا چٹا چوہا برآمد کر کے میز پر رکھ دیا۔ اس سفید چوہے نے میری کالی رنگت پر آنکھیں گھماتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا اور پھر نہایت نفاست سے چلتا ہوا میری پلیٹ کے کنارے کے قریب آیا اور مچھلی کا ایک قتلہ منہ میں ڈال کر اسے بڑے اخلاق سے کترنے لگا۔

"دیکھا مسٹر تارڑ" مسٹر گرانٹ نے اس کے سر پر ایک شفقت بھری انگلی رکھتے ہوئے کہا" کیسا سلجھا ہوا چوہا ہے"

یہ میری اور اس سلجھے ہوئے چوہے کی آخری ملاقات تھی کیونکہ اس کے بعد میں نے مسٹر گرانٹ کے گھر جانے سے توبہ کر لی۔

ہم پاکستانی بھی جانوروں کی محبت میں کسی سے پیچھے نہیں۔ ہم جانوروں سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں بشرطیکہ وہ بھنے ہوئے روسٹ شکل میں ہوں یعنی روسٹ مرغ، بھنے ہوئے تیتر بٹیر، روسٹ بکرے وغیرہ۔ اس طرح محبت کرنے میں بہت آسانی رہتی ہے جانور کو کچھ کھلانے کی بجائے آپ اسے کھا جاتے ہیں۔ روزانہ ایک نئے جانور سے محبت کی جا سکتی ہے جانور کبھی بوڑھا ہو کر نہیں مرتا کیونکہ آپ اسے عین جوانی میں ہی نوش کر جاتے ہیں...... غالباً ہاتھی اور کوے کی عمر اسی لئے سو سال کے لگ بھگ ہوتی ہے کیونکہ انہیں کوئی نہیں کھاتا....

لیکن اپنے شہرہ آفاق فاسٹ باؤلر سرفراز نواز نے جانوروں سے محبت کا ایک مختلف پہلو پیش کیا ہے۔ وہ آئندہ الیکشنوں میں اپنا انتخابی نشان "گھوڑا" رکھیں گے مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے بطور خاص گھوڑے کو ہی کیوں چنا ہے لیکن شنید ہے کہ گھوڑوں کے لئے وہ اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں کیوں رکھتے ہیں؟.....

یہ وہی لوگ بتا سکتے ہیں جنہوں نے انہیں دنیا کے مایۂ ناز بلّے بازوں کی جانب سرپٹ بھاگتے دیکھا ہے اور انہیں آؤٹ کرتے دیکھا ہے سوال یہ ہے کہ اگر کل کلاں ہمارے دیگر کھلاڑی یا ادیب الیکشن لڑنے کا ارادہ کر لیں تو وہ کس جانور کو اپنا انتخابی نشان بنائیں گے؟...... سب سے زیادہ ڈیمانڈ تو ظاہر ہے شیر کی ہوگی کیونکہ عورتوں کی گیلری کا مخصوص نعرہ...... فلاں ساڈھا شیر اے۔ باقی ہیر پھیر اے۔ ہوتا ہے "یہ فلاں" ہر میچ میں بدل جاتا ہے اب شیر میں قباحت یہ ہوتی ہے کہ یہ صرف ایک ہی قسم کا اور ایک ہی شکل کا ہوتا ہے چنانچہ صرف ایک امیدوار کے کام آسکتا ہے یہ امیدوار اگر پچ پچ کے شیر کے سامنے آجائیں تو پھر شیر کے کام آسکتے ہیں البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ لاہوری شیر پشاوری شیر اور کراچوی شیر کے نشان علیحدہ علیحدہ ہوسکتے ہیں عمر کے لحاظ سے بھی دو قسمیں سامنے آتی ہیں۔ ایک شیر اور دوسرا بڈھا شیر۔ کرکٹ ٹیم میں کئی حضرات ایسے ہیں۔ جو بڈھے شیر ہوسکتے ہیں جانور تو شیر کے علاوہ بھی بے شمار ہیں مثلاً گدھے۔ لومڑ۔ لگڑ بگڑ۔ بن مانس۔ شتر مرغ۔ زرافے اور کنگرو وغیرہ لیکن مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ میں آپ کو یہ بتا سکوں کہ کونسے کھلاڑی کا نشان گدھا ہونا چاہیئے اور کس ادیب کو کنگرو سوٹ کرے گا پسند اپنی اپنی۔

ہاں تو بات چوہوں سے شروع ہوئی تھی اور پہنچ گئی گدھوں تک....

جن چوہوں میں انسانی جراثیم داخل کیے گئے ان کے بارے میں ابھی تک معلوم

نہیں ہوسکا کہ ان میں بالآخر کیا تبدیلی آئی۔ لیکن ہم جو انسانی فطرت کو بخوبی جانتے ہیں تھوڑا بہت اندازہ کرسکتے ہیں قیاس کرسکتے ہیں کہ وہ چوہے کیا ہوگئے ہوں گے۔ مثلاً ایک چوہا ہیں "ٹکی" نام کا اور دوسرے چوہا صاحب ہیں "ملکی" جن میں انسانی جراثیم داخل ہوچکے ہیں۔ اگر دونوں میں ملاقات ہوجائے تو کچھ اس قسم کی گفتگو سننے میں آئے گی۔

"ہیلو ملکی کیا حال ہے؟"

ہیلو ٹکی تم کیسے ہو؟"

"یار تم بڑے دنوں سے غائب تھے کونسی اور کس کی بل میں گھسے ہوئے تھے؟...... کسی چوہیا کے چکر میں تو نہیں ہو؟"

"نہیں ٹکی تمہیں پتہ ہے کہ میں بہت شریف قسم کا چوہا ہوں...... دراصل میں...... بہرحال پھر بتاؤں گا...... کچھ کھانے پینے کو مل رہا ہے ان دنوں؟"

"ہاں شکر ہے خدا کا...... تم سناؤ"

"بڑا برا حال ہے یار...... آج صبح گھر سے نکلا تو ایک چوہیا جا رہی تھی میں نے اس کا پرس چھین لیا......"

"یار تم تو ایسے نہیں تھے"

"پرس میں سے ایک لپ اسٹک نکلی اور پانچ روپے کا ایک نوٹ پھر ایک چھوٹا سا بچہ مل گیا سکول جاتا ہوا اسے اغوا کیا"

"یار تم تو ایسے نہیں تھے"

اس کے والدین کو فون کیا کہ فوراً ایک لاکھ روپے کا انتظام کرو ورنہ بچے کو مار دوں گا کل کا وعدہ ہے دیکھیں کیا ہوتا ہے؟

"یار ملکی"

”یار مکی میرا جی چاہتا ہے کہ میں چوہوں کے گھر لوٹ لوں، چوہوں کو اٹھا کر لے جاؤں سب لوگ میری دہشت سے کانپنے لگیں۔ میرے ایک ہاتھ میں گنڈا سا ہو اور دوسرے میں ٹوکا اور میں ہر چوہے سے پوچھوں تواں آیا ایں سوہنیا؟“

”مکی تمہیں ہو کیا گیا ہے؟“

”میرا جی چاہتا ہے کہ میں ہیروئن کی سمگلنگ شروع کر دوں۔ ملک بدنام ہوتو ہو لیکن میرے پاس مال ہونا چاہیئے، کاریں، بنگلے، لندن اور پیرس میں فلیٹ...“

”یار تم تو بالکل ایسے نہیں تھے اچھے بھلے چوہے تھے کیا ہو گیا ہے..... تمہیں.....؟“

”مکی میں کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتا۔ کسی کو ہنستا ہوا نہیں دیکھ سکتا..... میرا جی چاہتا ہے..... میرا جی چاہتا ہے کہ مکا مار کر تمہاری بتیسی بھی باہر نکال دوں“

”مکی او للہ بولے آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ تم تو ایسے نہیں تھے“

”میں اب تک نہیں تھا لیکن اب ہوں کیونکہ میرے جسم میں انسانی جراثیم داخل ہو گئے ہیں“

مُنّے کی سالگرہ مبارک

جس طرح پہلے بچے کی پیدائش کے موقع پر بندے کی شکل وصورت پر ایک عجیب ہونق پن طاری ہو جاتا ہے خوشی کے ساتھ ساتھ اس کے اعصاب جواب دے رہے ہوتے ہیں اور اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کیا ہو گا۔ بلکہ بعض اوقات تو شک ہونے لگتا ہے کہ کچھ ہو گا بھی یا نہیں اور اگر ہو گا تو لڑکا یا لڑکی اور اس کی شکل وصورت کیسی ہو گی گورا ہو گا یا کالا ہو گا یا کیا ہو گا۔ اور کیسے ہو گا یہی صورتحال اس وقت وجود میں آتی ہے جب آپ کو زندگی کا پہلا اخباری کالم لکھنا ہوتا ہے آج سے ٹھیک ایک برس پیشتر جب ”مشرق“ کی انتظامیہ نے مجھے کالم نگاری کے میدان میں آجانے کی دعوت دی تو اس وقت تو میں نے کمال خود اعتمادی سے یہ دعوت قبول کر لی لیکن جب قلم ہاتھ میں لے کر سفید کاغذ کی طرف دیکھا تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے غالب کے ہاتھ پاؤں تو خوشی سے پھول گئے تھے لیکن میرا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ میری شکل وصورت پر بھی ایک عجیب ہونق پن طاری ہو گیا۔ خوشی کے ساتھ ساتھ اعصاب جواب دے گئے اور مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ اب کیا ہو گا۔ ہو گا بھی یا نہیں اور اگر ہو گا تو کیسا ہو گا..... سب سے پہلے تو مجھے یہ تعین کرنا تھا کہ میرے آئندہ کالموں کا دائرہ کار کیا ہو گا۔ ان کا موڈ کیا ہو گا اور وہ جو انفرادیت پیدا کی جاتی ہے۔ اپنے سٹائل اور زبان میں وہ کس طرح پیدا ہو گی..... بس وہی پہلے بچے کی پیدائش سے پیشتر پیدا ہونے والے وسوسے

اور خدشات ...... اس دوران مجھے وہ صاحب بے حد یاد آئے جنہیں ایک مقامی روزنامے میں ایک چھوٹا موٹا ادبی کالم لکھنے کے لئے کہا گیا۔ چنانچہ اپنا پہلا کالم لکھنے سے پیشتر انہوں نے ٹی ہاؤس کی میز پر مکّے چلاتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ اب ہمارے پاس بھی کالم کی تلوار آگئی ہے، نپٹ لیں گے انتظار حسین سے ...... پتہ نہیں وہ چچا انتظار سے نپٹ سکے یا نہیں البتہ ان کے اخبار نے چند کالموں کے بعد انہیں نپٹا دیا۔ مجھے چونکہ خون خرابہ پسند نہیں اس لئے میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اب ہمارے پاس بھی کالم کی تلوار آگئی ہے اور ویسے بھی انتظار حسین ہمارے بزرگوں میں سے ہیں اور مشرق کے دریا میں بہت دیر سے رہتے ہیں.... بہرحال بہت زور مارا لیکن کالم نہ بن سکا یا یوں کہہ لیجئے کہ کالم باندھا نہ جا سکا۔ اس پر صوفی ذوالفقار احمد تابش نے مشورہ دیا کہ تم فی الحال اپنے سے سینئر کالم نگاروں کے کالم انتہائی دیدہ دلیری سے پڑھو اور ان کے سٹائل میں لکھنے کی کوشش کرو آہستہ آہستہ ان سب کے مکسچر میں سے تمہارا اپنا ایک جداگانہ سٹائل ابھر آئے گا۔ میں نے کہا کہ اگر نہ ابھرا تو؟ ...... تابش کہنے لگا کمال ہے سمندر میں سے جزیرے ابھر آتے ہیں۔ نئی اداکارائیں اگر ہسپانی ہوں تو وہ "ابھر" آتی ہیں۔ تمہارا سٹائل بھی ابھر آئے گا۔ چنانچہ میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور سب سے پہلے نیکی کا آغاز گھر سے شروع کیا، یعنی چچا انتظار کے سٹائل میں لکھنے کی کوشش کی۔ کالم کا آغاز کچھ یوں ہوا۔

"صاحبو لاہور میں ان دنوں گرمی کی وہ شدت ہے کہ الامان الحفیظ، چیل انڈہ چھوڑ دیتی ہے۔ سارے شہر میں چھاؤں کا نام ونشان نہیں۔ ہم نے کارپوریشن والوں سے درخواست گزاری تھی کہ جناب یہاں نیم کے چند پیڑ ہی لگوا دیجئے انہوں نے سنی ان سنی کر دی۔ ہماری بات پر کان ہی نہیں دھرا، حالانکہ مئی کا مہینہ ہے اور اس مہینے کے بارے میں مولوی اسماعیل میرٹھی نے کیا خوب کہا ہے کہ مئی کا آن

پہنچا ہے مہینہ ...... اور رکشوں والوں کو بھی گرمیوں کی آمد کی خبر ہو چکی ہے ان کے مزاج ساتویں آسمان پر ہیں۔ کیا خوب دن تھے جب لاہور میں تانگے چلا کرتے تھے اور ہم دو آنے دے کر بھاٹی سے اسٹیشن تک چلے جایا کرتے تھے۔ پچھلے دنوں مشکور حسین یاد نے ہمیں یاد کیا اور ایک "خاص و عام" پارٹی پر بلا کر قرۃ شت کھلائے لیکن کاٹ کر اور پلیٹوں میں سجا کر گٹھلیاں غائب تھیں۔ اب صاحبو آپ ہی انصاف کرو کہ آم کھانے کے ساتھ ساتھ اگر گٹھلیاں چوسنے کو نہ ملیں تو خاک مزا آئے گا۔ یعنی صرف آم کے آم تھے گٹھلیاں ......!

میں انتظار حسین کے تتبع میں کالم لکھتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا کہ ایک غلطی کا احساس ہوا وہ یہ کہ مجھے جو کالم لکھنا تھا وہ ماہ اگست کے لئے تھا اور اس میں مئی کا مہینہ آن پہنچا تھا اور آموں کا تذکرہ بیچ میں پتہ نہیں کہاں سے آن ٹپکا کہ ان دنوں ٹپکے کا آم ہوتا ہی نہیں۔ تب میں نے انتظار حسین کی نقالی کا بھاری پتھر چوم کر رکھ دیا اور محترم ضمیر جعفری صاحب کی بھاری بھر کم شخصیت کی طرف رجوع کرتے ہوئے کالم کا آغاز کیا جو کچھ یوں تھا۔

"یہ ان دنوں کا تذکرہ ہے جب ہم برما کے محاذ پر جاپانیوں کے خلاف برسرپیکار تھے۔ اپنے مرشد مولانا چراغ حسن حسرت اپنے خیمے سے نکلے اور ...."

ضمیر صاحب کو میں نے فوراً ہی چھوڑ دیا کیونکہ برما اور حسرت صاحب دونوں سے ہی میری یاد اللہ نہیں تھی۔ ضمیر صاحب کے محاذ پر مجھے شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد جب عبدالقادر حسن کی طرف آیا تو ان کے کالم کا عنوان دیکھ کر ہی چپکے سے واپس آگیا۔ میں سیاسی کالم نگار نہیں بننا چاہتا تھا کیونکہ اس میں ہر حکومت کی تبدیلی سے مشکل مقام آجاتے ہیں اور اس کے لئے بے شمار پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور ان پاپڑوں میں نمک مرچ کا حساب کتاب رکھنا پڑتا ہے ورنہ آپ

کا حساب کتاب کر دیا جاتا ہے۔

رفیق ڈوگر کے کالموں میں غصہ بہت تھا۔ بیباکی اور بے خوفی بہت تھی اور میں یہ سب کچھ افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

تب میں نے منو بھائی کے کالموں کو سامنے رکھا اور اپنے کالم کا آغاز کر دیا۔

" شورکوٹ سے میری ایک بہن ثمینہ خاں نے لکھا ہے...... منو بھائی! میں آپ کو آج اسی طرح آواز دے رہی ہوں جس طرح آج سے کئی سو برس پہلے ایک مظلوم بہن نے محمد بن قاسم کو آواز دی تھی۔ کیا آپ اپنی بہن کی آواز پر، اس کی پکار پر کان دھریں گے۔ میرے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوا ہے۔ میں ایک مقامی سکول میں استانی ہوں اور تین ماہ سے مجھے محکمہ تعلیم کی طرف سے تنخواہ کی ایک پائی ادا نہیں کی گئی۔ خدارا مجھے انصاف دلایئے بلکہ انصاف نہ بھی دلایئے تو کم از کم تنخواہ دلا دیجئے۔ آپ کی دکھی بہن...... ثمینہ خاں شورکوٹ روڈ۔

بہن ثمینہ میں آپ کا خط پڑھ کر خون کے آنسو رو دیا چنانچہ میری واحد سفید قمیص کا ستیاناس ہو گیا۔ کیونکہ اب اس پر ان آنسوؤں کے سرخ دھبے ہیں۔.... اس پر مجھے ایک لاطینی شاعر ابرتونتو نیوگارسیا توچینی کا ایک شعر یاد آ گیا جس میں وہ کہتا ہے کہ

" یہ خون کے آنسو
میرے آنسو ہیں۔
تمہارے آنسو ہیں۔
کل کائنات کے آنسو ہیں۔
آنے والا کل ان کی سرخی آسمانوں پر لکھ دے گا"

تو بہن ثمینہ خان وہ دن دور نہیں جب میرے ملک کی مائیں بہنیں ایک

ایسی صبح دیکھیں گی جب......؟

یہاں تک پہنچتے پہنچتے مجھے احساس ہوا کہ پھر غلطی ہو گئی ہے کیونکہ مجھے تو قارئین کے خط اس وقت وصول ہوں گے جب میرا کوئی کالم چھپے گا اور اگر نہیں بھی وصول ہوں گے تو بنا لوں گا لیکن اپنے کالم کے لئے یہ انداز ہرگز مناسب نہیں ہو گا چنانچہ آخر میں میں نے برادر اظہر جاوید کے انداز تحریر کو اپنانے کی کوشش کی آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"قارئین آپ سے کیا عرض کروں آج صبح صبح لتا منگیشکر کا ایک گانا سن لیا نہ تم بے وفا ہو نہ ہم بے وفا ہیں...... بس کچھ مت پوچھئے کہ اس عفیفہ کی سریلی، شرمیلی، نوکیلی، بھڑکیلی اور البیلی آواز نے دل ناتواں پہ کیا کیا ستم ڈھائے کیا ہوا دل پہ ستم تم نہ سمجھو گے بلم۔ عجب زمانہ آ گیا ہے لوگ کیسے شاعروں اور ادیبوں کو بھول گئے ہمیں کون یاد رکھے گا ہم تو ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں کرچی کرچی ہو گئے ہیں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے ہیں دوست ساتھ چھوڑ گئے بیگانے تو پہلے بیگانے تھے آہ زندگی کیا ہے غم کا دریا ہے اس جینے کے ہاتھوں ہم تو مر چلے......؟"

اظہر جاوید کے سٹائل میں لکھتے لکھتے یہاں تک پہنچا تھا تو خیال آیا کہ اس قسم کا آہ و زاری سے بھرپور کالم لکھوں گا تو یہ نہ ہو کہ "مشرق" کی انتظامیہ پہلے کالم کی اشاعت کے بعد ہی ہماری چھٹی کرا دے کہ میاں کیوں لوگوں کو صبح صبح اشکبار کرتے ہو ہمارے پرچے کا مزاج یہ نہیں ہے......

خواتین و حضرات تب مجھ پر یہ کھلا کہ کالم نگار بھی ایک اداکار کی طرح ہوتا ہے جب وہ اخبار کی سٹیج پر جاتا ہے تو وہ بالکل اکیلا ہوتا ہے اگر اس میں کچھ ٹیلنٹ ہو تو وہ داد وصول کر لیتا ہے ورنہ اس پر ٹماٹر اور انڈوں کے چھلکے پھینکے جاتے ہیں...... وہ دوسرے کامیاب اداکاروں کی نقل کرے گا تو مارا جائے گا

چنانچہ میں نے اللہ کا نام لے کر قلم پکڑا اور آج سے ایک برس پیشتر اپنا پہلا کالم لکھنے لگا اور آج میں اپنا سواں کالم لکھ رہا ہوں کالم نمبر ایک سے لے کر کالم نمبر سو تک قارئین کی طرف سے بے شمار ٹماٹر اور گندے انڈے بھی پھینکے گئے لیکن ہم ڈھیٹ بن کر لکھتے گئے اور "مشرق" کی انتظامیہ اپنی شرافت میں چھاپتی گئی ورنہ کیا پدی کیا پدی کا شوربہ...... البتہ ان ٹماٹروں گندے انڈوں میں کبھی کبھار ایک آدھ پھول بھی آجایا کرتا ہے جو مجھے ہمت دیتا ہے کہ ہر سیاہ بادل کے کناروں پر ایک روپہلی لکیر بھی ہوتی ہے قارئین کیا آپ "کارواں سرائے" کو سالگرہ مبارک نہیں کہیں گے؟...... بہت بہت شکریہ۔

آئی بسنت

دنیا کے مختلف ملکوں میں عمر عزیز کے گزرنے کا حوالہ مختلف موسم بنتے ہیں مثلاً یورپ میں اگر ایک بوڑھا پچھلے زمانوں کو یاد کرے گا تو کہے گا کہ اتنے موسم سرما پہلے کی بات ہے یا یہ کہ میں نے ان آنکھوں سے اتنی سردیاں دیکھی ہیں۔ یورپ میں چونکہ موسم سرما بے حد قاہر ہوتا ہے اس لئے بوڑھے ہمیشہ اسی کا حوالہ دیتے ہیں جب کہ نوجوان لوگ یہ کہیں گے کہ آہا یہ فلاں موسم گرما کی بات ہے کہ ساحل سمندر پر مجھے فلاں سے عشق ہو گیا...... یا یہ کہ زندگی کو ایک طویل موسم گرما ہونا چاہیے جس میں گرم دھوپ چمکتی رہے......

اپنے اس پاکستان میں اور اس کے گرد و نواح میں ہم موسم گرما یا سرما کا تذکرہ نہیں کرتے کیونکہ ہر دو عذاب ہوتے ہیں چنانچہ یہاں موسم بہار کے حوالے سے بات ہوتی ہے۔ فلاں نے زندگی کی اتنی بہاریں دیکھیں یا یہ کہ جیا بے قرار ہے آئی بہار ہے وغیرہ وغیرہ...... لیکن ہمارے دوست نوازش علی کا پیمانہ وقت سب سے جدا ہے...... فلاں کام اگلی بسنت سے پہلے پہلے کرنے کا ارادہ ہے یوں بھی وہ خاصے "بسنتی" واقع ہوئے ہیں...... بسنت کے دوسرے روز ملیں گے تو کہیں گے "پتہ نہیں اب اگلی بسنت دیکھنی نصیب ہوتی ہے یا نہیں...... یار اس مرتبہ استاد بسا امرتسری نے کام ٹھیک نہیں کیا پتنگوں میں سنگاپور کے بانس کی بجائے ملایا کا بانس استعمال کیا اور یوں میری ساری

پتنگیں "جھپ" مارتی تھیں، اگلی بسنت پر...... اور یوں اگلی بسنت کے لئے تیاری شروع ہو جاتی ہے...... بسنت سے تقریباً چھ سات ہفتے قبل وہ دنیا سے غائب ہو جاتے ہیں یعنی اس دنیا سے جس میں ہم اور آپ رہتے ہیں۔ ان دنوں میں وہ رات گئے تک سڑکوں کے کنارے گیس کی روشنی میں بیٹھ کر ذاتی نگرانی میں ڈوریں لگواتے ہیں۔ دھاگہ خود درآمد کرتے ہیں کبھی ہندوستان سے اور کبھی انگلستان سے "گڈی میکر" استادوں کے گھروں میں قیام کرتے ہیں اور حسب پسند مال تیار کراتے ہیں بسنت سے چند روز پہلے ادھر میرے ہاں تشریف لائے اور کہنے لگے "یار کوئی نرسری والا واقف ہے؟"

میں نے عرض کیا کہ بیشتر اپنے جاننے والے ہیں فرمائیے کیا کام ہے...... کوئی نایاب نسل کا پودہ یا پھول وغیرہ درکار ہے؟

کہنے لگے "نہیں بھئی بانس کے پودے درکار ہیں...... سنا ہے کہ تازہ بانس کی بنی ہوئی پتنگ میں لچک بہت ہوتی ہے...... اور ہاں جھڑبیری کے پودے بھی خریدنا ہیں؟

میں نے پوچھا کہ ان کا کیا کیجئے گا؟ کہنے لگے وہ ڈھانگوں کے آگے باندھ کر کٹی ہوئی گڈیاں لوٹیں گے۔

میں نے کہا کہ حضرت آپ تو اڑانے والوں میں سے ہیں لوٹنے والوں میں کب سے شامل ہو گئے؟

تب انہوں نے نہایت رازداری سے بتایا کہ اس مرتبہ انہوں نے محلے کے چند نوجوانوں کو صرف بسنت کے لئے ملازم رکھ لیا ہے تاکہ وہ ان کی کٹی ہوئی پتنگیں اور گڈے لوٹ لیں۔ یہ اہتمام اس لئے کیا گیا ہے تاکہ فریق مخالف بسنت کے بعد ان کی کٹی ہوئی پتنگوں کی نمائش کر کے ان کو شرمندہ نہ کر سکے۔

ایک مرتبہ مجھے بھی اندرون شہر ان کے گھر پر بسنت دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا یہ ایک چار منزلہ پرانا مکان تھا جو مسجد وزیر خاں کے نواح میں واقع ہے۔ میں جب چاروں منزلوں کی تاریک سیڑھیاں طے کر کے کوٹھے پر پہنچا تو نوازش صاحب اپنے درجنوں پتوں اور سینکڑوں پتنگوں اور گڈوں اور کم از کم ایک درجن دوستوں کے ہمراہ ایک آٹھ فٹ ضرب آٹھ فٹ بلند ممٹی پر معلق تھے۔ ان کے علاوہ اس ممٹی پر چاولوں کی ایک دیگ، ایک بھونپو اور ٹیپ ریکارڈر بھی رکھا ہوا تھا مجھے دیکھ کر کہنے لگے "آجاؤ آجاؤ"

میں نے پوچھا جگہ ہے؟
کہنے لگے "تم آؤ تو سہی"

میں بانس کی سیڑھی پر قدم جماتا جب ممٹی کے کنارے تک پہنچا تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اوپر کھینچ لیا۔ میں بمشکل کھڑا ہوا اور بیٹھ گیا۔ کہنے لگے "اٹھو بسنت دیکھو"

میں نے کہا نہیں جناب مجھے اسی طرح بیٹھا رہنے دیں.....

انہوں نے زبردستی میرا ہاتھ پکڑا اور کھڑا کر دیا...... میرے پاؤں کے نیچے جو ممٹی تھی وہ لرز رہی تھی میری ٹانگیں لرز رہی تھیں اور لاہور شہر کا منظر یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے میں شاہی مسجد کے مینار کے گنبد کے اوپر بیٹھ کر دیکھ رہا ہوں...... فضا میں ہر طرف پتنگیں ہی پتنگیں تھیں۔ نوازش صاحب سرخوشی اور مستی کے ایسے عالم میں تھے جہاں ان کو کچھ خبر نہیں تھی کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے، میرا کیا حال ہے۔ میرا چہرہ زرد کیوں ہو رہا ہے۔ جس کنارے پر میں جھول رہا ہوں اس کے عین نیچے کئی سو فٹ کی گہرائی میں مسجد وزیر خاں سے ملحقہ بازار بہہ رہا ہے...... وہ میرے وجود کو بھول چکے تھے چنانچہ میں

نے موقع غنیمت جانا اور فوراً بیٹھ گیا۔

نوازش صاحب ایک بڑی پتنگ اڑانا چاہتے تھے لیکن اگلے کوٹھے پر بڑ ان کے چند اناڑی گڈی باز چھوٹی چھوٹی گڈیاں اڑا رہے تھے اور پتنگ کے ٹیک آف میں دشواری ہو رہی تھی چنانچہ دو تین حضرات کو اس کارِ خیر پر مامور کیا گیا کہ وہ ان کوٹھوں پر جائیں اور اول تو ان کو معمولی قسم کی پھینٹی لگائیں اور اگر ادھر سے بھی مقابلے کا خطرہ ہو تو ان کی خدمت میں دس دس روپے کے نوٹ بطور رشوت پیش کئے جائیں...... صرف چند منٹ کے لئے وہ اپنا ہاتھ روک لیں تاکہ نوازش صاحب کی پتنگ ٹیک آف کر جائے...... اس کام پر مامور حضرات نے اس ممٹی پر سے چھلانگ لگائی اور بازار کو چار منزلہ ممٹی سے عبور کر کے ان کوٹھوں پر پہنچ گئے جہاں اناڑی حضرات کا قبضہ تھا...... تھوڑی سی گفتگو اور "گسن علی" کے بعد تصفیہ ہو گیا اور نوازش صاحب کی پتنگ ٹیک آف کر کے پرواز کرنے لگی۔ اس ممٹی پر صرف نوازش صاحب ہی سرگرم عمل نہیں تھے بلکہ دو تین دوست ذیلی پتنگیں بھی اڑا رہے تھے تاکہ بڑی پتنگ کے نزدیک آنے والے چھوٹے گڈے اور گڈیوں کو کاٹ دیا جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد نوازش صاحب کو میری موجودگی کا احساس ہوا۔

کہنے لگے "اڑاؤ گے؟"

میں نے کہا "نہیں صرف دیکھوں گا۔"

"چھوڑ یار بسنت کون سا روز روز آتی ہے...... یہ لو ذرا اسے پکڑو" انہوں نے پتنگ کی ڈور میرے ہاتھ میں دے دی...... ڈور پکڑتے ہی مجھے ایک دھچکا سا لگا اور میں ممٹی سے گرتا گرتا بچا۔ پتنگ بل فائٹنگ والے بھینسے کی طرح منہ زور اور وحشی ہو رہی تھی۔ بار بار میرے قدم اکھڑتے اور نوازش صاحب

مجھے سہارا دیتے "اوئے ڈھیل دو" میں ڈھیل دیتا تو وہ کہتے "اوئے بس"...... اسے اٹھا" میں اٹھاتا تو وہ مجھے اٹھانے لگتی۔

"بہت بہت شکریہ" میں نے ڈور نوازش صاحب کو تھمائی اور پھر ممٹی پر دبک کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد وہ پھر سیرِ افلاک کو چلے گئے...... بہت دیر بعد واپس آئے تو مجھے دیکھ کر حیران سے ہوئے "اوئے تم کب آئے؟"

میں نے بتایا کہ بھئی بہت دیر سے آیا ہوا ہوں۔

کہنے لگے "تو پھر بیٹھے کیوں ہو؟ کچھ کرو"

"کیا کروں" میں نے پوچھا "اس ممٹی پر کھڑا تو میں نہیں ہوں گا۔ بیٹھ کر کیا کروں؟"

"بھونپو بجاؤ"

"بھونپو؟"

"ہاں ہاں یہ بگل...... جب میں کوئی پتنگ کاٹوں گا تم اسے بجانا...... ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے" میں نے بگل سنبھال لیا۔

ہر طرف شور تھا جو شہر کے پرانے مکانوں حویلیوں اور کوٹھوں پر گونج رہا تھا اور تیز ہوا تھی۔

نوازش صاحب نے ایک دور افتادہ پتنگ کے ساتھ اپنی پتنگ کے ذریعے تھوڑی سی گفت و شنید کی اور پھر پیچا لڑا دیا...... اب ساری ممٹی نے مشورے دینے شروع کر دیئے۔

"اوئے اٹھا اسے...... اٹھا...... تنکا مار...... تنکا...... نہیں نہیں اب اسے یہیں رکھ...... نہ نہ بے ہوائی نہ کر...... ہوا میں رکھ......"

اس دوران نوازش صاحب کی انگلیوں سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے لیکن اس مرد میدان نے اف تک نہ کی۔ فرض کی ادائیگی میں مشغول رہا اور میدان میں ڈٹا رہا...... پتنگیں اتنی دور جا چکیں تھیں کہ ان کو تلاش کرنا مشکل ہو رہا تھا بلکہ کچھ عرصہ نوازش صاحب کسی اور پتنگ کو اپنی سمجھ کر ڈھیل دیتے رہے......

یکدم نوازش صاحب چیخے "ادے بو...... ادے بو کاٹا" اور ممٹی پر موجود حضرات نے جگہ کی کمی کے باوجود ایک مخدوش سا بھنگڑا ڈالا۔

"یار بگل بجا" مجھے حکم ہوا۔

میں نے بگل میں پھونک ماری تو کچھ بھی نہ ہوا۔ پھر پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر کوشش کی تو ایک ہلکی سی "شرز" ہوئی...... بالآخر جب متعدد کوششوں کے بعد بگل میں سے ایک "بھاں" کی آواز برآمد ہوئی تو نوازش صاحب کہنے لگے "یار اب نہ بجا...... ہماری بھی کٹ گئی ہے......؟

میں نے بگل زمین پر رکھا اور بیٹھ گیا...... اس کے بعد وہ پھر مگن ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد جب وہ اپنی انگلیوں پر ٹیپ لگانے کے لئے رکے تو مجھے دیکھ کر پھر حیران ہوئے "یار تو کب آیا؟"

"میں صبح سے یہاں ہوں" میں نے عرض کیا۔

"ہاں ہاں...... یار آج کا دن مجھے معاف کر دینا...... تو بیٹھا کیوں ہے کچھ کر"

"کیا کروں؟"

"اس لکھنؤ کاٹ میں تناویں ڈال دے"

میں نے تناویں ڈال کر دیں۔ انہوں نے گڈے کے سینے پر انگلیاں رکھ کر اس کا بیلنس دیکھا اور پھر ہوا میں لہرا کر بولے "یہ سُدھ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "بے سُدھ ہے؟"

کہنے لگے "نہیں چھوڑ کر کوئی اور کام کر"

"کیا کام کروں؟"

"تو...... اس دیگ میں پلاؤ ہے...... تو بیٹھ کر پلاؤ کھا"

چنانچہ میں اس بلند مقام پر بیٹھا سارا دن پلاؤ کھاتا رہا۔

اس برس ارادہ ہے کہ میں بھی دھوم دھام سے بسنت مناؤں گا بلکہ جس وقت آپ یہ کالم پڑھ رہے ہوں گے۔ اس لمحے میں اپنے کوٹھے پر چڑھ کر پتنگیں اڑا رہا ہوں گا۔ البتہ ایک چھوٹی سی دشواری ہے ان دنوں بازار میں مختلف قسم کی پتنگیں فروخت ہو رہی ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بسنت کے لئے کونسی پتنگ منتخب کروں...... چند اقسام درج کر رہا ہوں آپ مشورہ دیجئے گا۔

سُدھ پتنگ...... یہ پتنگ بے حد شریف النفس قسم کی ہوتی ہے...... منشیات سے اجتناب کرتی ہے۔ اڑانے والا جدھر چاہے اڑا سکتا ہے اور یہ اُڑتی جاتی ہے۔

بے سُدھ پتنگ...... نام سے ظاہر ہے کہ اس پر شرعی قوانین کا نفاذ ہو سکتا ہے اس لئے اس سے اجتناب برتا جائے۔

سیاسی پتنگ...... ان دنوں بہت مقبول ہے۔ لیکن کنی بہت کھاتی ہے...... دائیں ہاتھ مڑتی ہے تو مڑتی ہی چلی جاتی ہے۔ بائیں جانب جانے لگے تو جاتی ہی چلی جاتی ہے...... کٹنے پر آئے تو کٹتی ہی چلی جاتی ہے...... البتہ اس کا ایک فائدہ ہے کہ اگر کٹ بھی جائے تو اڑانے والا یہی سمجھتا ہے کہ ابھی اڑ رہی ہے اور وہ خالی ہوا میں ہاتھ چلاتا رہتا ہے۔

الیکشن پتنگ...... ہر کوئی اسے خرید رہا ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ کے پاس ڈور کے کم از کم پچاس پنّے موجود ہوں...... اس کی خوبی یہ ہے کہ ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اسے اڑائے گا اور اس کے حواری یہ کہتے ہیں کہ جناب آپ کی پتنگ اس وقت سب سے اونچی ہے...... جب کٹتی ہے تو آپ کو بھی کاٹ کر جاتی ہے۔

چکری پتنگ...... اس میں بنیادی نقص یہ ہوتا ہے کہ ہوا میں جاتے ہی گھومنے لگتی ہے چکر کھاتی ہے اور اڑانے والے کو چکرا دیتی ہے...... دیکھنے والوں کو چکر دے جاتی ہے۔ لیڈر حضرات میں بہت مقبول ہے۔

ڈسکو پتنگ...... اس کے اڑنے کا انداز بے حد قابل اعتراض ہوتا ہے اور فحاشی کے زمرے میں آسکتا ہے اڑتی کم ہے مٹکتی زیادہ ہے......

کٹی پتنگ...... اسے آپ خرید نہیں سکتے لوٹ سکتے ہیں۔ طرح طرح کے دعوؤں سے پکڑ سکتے ہیں...... لیڈر حضرات اپنے بانس لئے ان کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہیں...... یہ کچھ کچھ عوام الناس کی طرح ہوتی ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے اس بسنت پر مجھے کونسی پتنگ اڑانی چاہیئے؟

تازہ ترین ماڈل کے شتر مرغ

چند برس پیشتر میں صبح کی سیر کا "مریض" تھا میں اس مرض کے ہاتھوں لاچار تھا مجبور تھا اور اس کے آگے بے بس ہو چکا تھا منہ اندھیرے اٹھتا جوگر شوز اور ٹریک سوٹ پہنتا اور اچھلتا کودتا باغ جناح کی تازہ صبح میں داخل ہو جاتا...... جس روز کسی مجبوری کے باعث سیر کو نہ جاسکتا اس روز میری حالت اس عادی افیونی کی سی ہوتی جسے افیون نہ ملی ہو میری اس عادت میں صبح کی سیر کے فوائد اور صحت بنانے کا کوئی عمل دخل نہ تھا بس میں مریض ہو چکا تھا یہ مرض کس طرح دور ہوا یہ الگ داستان ہے لیکن باغ جناح کی سیر کے دوران جہاں طرح طرح کے پرندے دیکھنے میں آتے وہاں مختلف قسم کے سیر کے مریض بھی دکھائی دیتے جو پرندوں سے کم دلچسپ نہ ہوتے تھے ان میں سے چند ایک کا تذکرہ اس کالم میں آچکا ہے بلکہ ایک مرتبہ جب میں نے باغ جناح میں دوڑتے ہوئے اور مسلسل دوڑتے ہوئے ایک صاحب کے بارے میں یہ لکھا کہ انہیں عرف عام میں "جھنبیری" کہا جاتا تھا کیونکہ ہم نے انہیں کبھی آرام سے سیر کرتے یا کہیں سستاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا تو اگلی صبح ایک فون آیا میں نے فون اٹھا کر پوچھا "جی کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"جی میں جھنبیری بول رہا ہوں" ادھر سے جواب آیا۔

"جھنبیری؟"

"جی ہاں...... ویسے تو مجھے قریشی صاحب کہا جاتا ہے لیکن آپ نے

اپنے کالم میں ہمیں جھنجھیری لکھ دیا ہے اس لئے ہم جھنجھیری ہیں"

ظاہر ہے میں بے حد شرمندہ ہوا لیکن جھنجھیری صاحب ..... میرا مطلب ہے قریشی صاحب کا ظرف ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے اس خطاب کا بالکل بُرا نہ مانا بلکہ کالم کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا ..... بہرحال باغ جناح میں گھومنے والے ان کرداروں میں سے ایک پہلوان محمد دین بھی تھے جو چڑیا گھر کے پہلو میں واقع ایک ویران سبزہ زار میں دیکھے جاتے تھے ویران اس لئے کہ یہ علاقہ عام سیر کرنے والوں کی زد سے باہر تھا وہاں شاید باغ میں کام کرنے والے مالیوں کے کوارٹر تھے اور ان کے ساتھ گورنمنٹ کالج لاہور کا باٹنی گارڈن تھا یہ گارڈن اب ختم ہو چکا ہے سوائے ایک دو سوکھے ہوئے تالابوں کے جن کے کنول اب بھی موسم برسات میں پھول دے جاتے ہیں میں اکثر اس پرائیویٹ باغ میں ورزش کیا کرتا تھا ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ ایک منحنی سا شخص ایک مرغ کے ساتھ سیر کر رہا ہے مرغ اصیل قسم کا تھا اور گردن اکڑائے مٹر گشت کر رہا تھا ان صاحب کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی تھی جس کی مدد سے وہ مرغ کو سیر کروا رہے تھے مرغ ایک جگہ رکتا تو وہ چھڑی سے اسے چھوتے یا اس کا رخ موڑ دیتے ..... یہ پہلوان محمد دین تھے ان دونوں کی تفصیل میں جانے سے پیشتر میں آپ کو وہ خبر سنائے دیتا ہوں جس کی وجہ سے آج پہلوان محمد دین اور ان کا مرغ میرے کالم میں آئے ہیں۔

"چینی صبح کی سیر پرندوں کے ساتھ کرتے ہیں" ..... یہ ہے خبر کا عنوان اور اس کی تفصیل کچھ یوں درج ہے کہ چین میں پالتو جانوروں کی بجائے پرندے پالنے کا رجحان زور پکڑ رہا ہے چین میں عام طور پر صبح کے وقت یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ایک ضعیف شخص ہاتھ میں پنجرہ لئے جا رہا ہے جس میں گانے والا ایک پرندہ

مقید ہوتا ہے اور یہ شخص صبح کی سیر کے لئے گھر سے نکلتا ہے چین میں اس طرح وہ تلف لوگ صبح کی سیر کے بعد یہ پنجرہ سائیکل کے پیچھے رکھ لیتے ہیں اور گھر چلے آتے ہیں ان پنجروں پر رنگ برنگے غلاف چڑھے ہوتے ہیں بیجنگ کے ایک اخبار کا کہنا ہے کہ شہر کے پچاس ہزار افراد نے گانے والے پرندے رکھے ہوئے ہیں۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ یہ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے اپنے شہر لاہور میں سینکڑوں برسوں سے لوگ پرندوں کے ساتھ سیر کرتے آئے ہیں لیکن اس کی خبر کہیں نہیں چھپی یہ بھی درست ہے کہ اہل لاہور کو زیادہ تر بھنے ہوئے پرندے پسند ہیں لیکن کبوتروں اور بٹیروں سے ان کا لگاؤ تو ایک تاریخی حقیقت ہے بہرحال میں ان صاحب کو جو اپنے مرغ کو جناح باغ میں سیر کرا رہے تھے روزانہ دیکھتا تھا ایک روز میں نے قریب جا کر زور سے "السلام علیکم" کہا تو وہ چونک گئے اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آہستہ بولنے کی تلقین کی اور پھر کہنے لگے

"آہستہ بولو میرا ککڑ ڈر جائے گا"

میں نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا "یہ آپ کا ککڑ ہے؟"

کہنے لگے "تمہارا خیال ہے کہ یہ اکیلا سیر کرنے آ گیا ہے؟" پھر وہ چھڑی کے ساتھ مرغ کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

اگلے روز پھر ملاقات ہو گئی بلکہ میں جان بوجھ کر ان کی پرائیویٹ سیر گاہ میں چلا گیا انہوں نے بتایا کہ ان کا نام پہلوان محمد دین ہے دبلے پتلے ہونے کے باوجود پہلوان اس لئے ہیں کہ ان کا سارا خاندان کسی زمانے میں پہلوانی کیا کرتا تھا اور سب کے ناموں کے ساتھ "پہلوان" کا لاحقہ بہت ضروری ہوتا تھا یوں وہ بھی پہلوان ہو گئے میں نے پوچھا کہ پہلوان جی یہ مرغ ..... انہوں نے فوراً ٹوک دیا "ناں ناں اسے مرغ نہ کہو ..... یہ ککڑ ہے ککڑ ... اور اس کا نام پھُرا ہے"

میں نے پوچھا کہ پہلوان جی یہ جو آپ کا ککڑ ہے آپ اس کے ساتھ سیر کو
آتے ہو یا یہ آپ کے ساتھ سیر کو آتا ہے؟

وہ کہنے لگے "باؤجی دراصل یہ بڑا نسلی ککڑ ہے چوک نواب صاحب میں اس
کا راج ہے، مجال ہے کوئی ککڑ اس کے مقابلے پر آجائے لیکن پچھلے مہینے یہ بیمار
ہوگیا آپ کو معلوم ہے آج کل ہر چیز میں ملاوٹ ہوتی ہے بس اس کے دانے
پانی کا خیال نہ رکھا اور یہ کمزور ہوگیا مانی قصائی کے ککڑ کو دیکھ کر ذرا نروس ہوگیا
میں اسی دن ڈنگر ڈاکٹر کے پاس لے گیا اس نے بتایا کہ خوراک ٹھیک رکھو اور صبح
کو اسے سیر کرایا کرو تاکہ ذرا اس کا بدن کھل جائے..... اب دو مہینے ہوگئے ہیں
اس کے ساتھ آتے ہوئے....."

"تو پھر کچھ فرق پڑا؟" میں نے پوچھا

"آہو جی" پہلوان خوش ہوکر بولے "اب تو طاقتوں میں ہے پر جناب بے حد
شریف ہے مجال ہے کسی ککڑی کو دیکھ کر بانگ دے آنکھیں نیچی کر لیتا ہے....."

میں پہلوان محمد دین اور ان کے ککڑ کو اکثر باغ میں سیر کرتے ہوئے دیکھتا
پھر دونوں غائب ہوگئے کچھ عرصہ بعد جب میں موچی دروازے کی طرف بھنی ہوئی
مونگ پھلی خریدنے گیا تو وہاں اتفاقاً پہلوان سے ملاقات ہوگئی میں نے پوچھا کہ
ان دنوں آپ باغ میں دکھائی نہیں دیتے کیا بات ہے؟

پہلوان آزردہ ہوکر بولے "بس اس نامانیم ککڑ نے بے عزتی خراب کردی
مانی قصائی کے ککڑ سے ہار گیا۔"

"چلئے کوئی بات نہیں اگلی مرتبہ جیت جائے گا ہماری کرکٹ ٹیم بھی تو
ہار جاتی ہے" میں نے ان کا دل رکھنے کی خاطر کہا۔

"نا جی ککڑوں کی لڑائی میں کوئی اگلی مرتبہ نہیں ہوتی ایک مرتبہ جو ککڑ ہار

جائے وہ دل چھوڑ جاتا ہے میدان کا..... ہوتا یہ ہے میں نے تو جس دن وہ ہارا ہے
اسی شام اس کے مرغ چھولے پکائے تھے پر جی خود نہیں کھائے بال بچوں کو کھلا
دیئے تھے....." پہلوان محمد دین باقاعدہ آبدیدہ ہوگئے..... یہ ان کے ساتھ
میری آخری ملاقات تھی۔

یوں تو جناح باغ میں کئی "افراد" "پرندوں" کے ساتھ سیر کے لئے آتے ہیں لیکن
ان کا حوالہ یہاں نہیں آسکتا کیونکہ یہ "پرندے" دراصل پرندے نہیں ہوتے بلکہ
انگریزی زبان کے "برڈ" ہوتے ہیں اور عام طور پر نوجوان ہوتے ہیں اور خوبصورت
ہوتے ہیں۔

چین کی طرح اگر پاکستان میں بھی پرندوں کے ساتھ سیر کرنے کا رجحان عام
ہو جائے تو ہم سوچ سکتے ہیں کہ صورت حال کیا ہوگی..... لوگ اپنے کبوتروں
اور بٹیروں کے ساتھ باغوں میں آئیں گے بلکہ شہر کے دوسری جانب حضوری باغ
میں تو ایسے لوگ اب بھی مل جائیں گے البتہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی مالی استطاعت
کے مطابق اپنا پرندہ ساتھ لائے گا..... مثلاً غریب غربا کے پاس کوئی چھوٹی موٹی
چڑیا ہوگی جسے وہ مٹھی میں دبائے سیر کو نکلیں گے شاعر حضرات عام طور پر بلبلوں
کے ساتھ دیکھے جائیں گے اور اگر بلبل سیر سپاٹے کی وجہ سے تھک کر سو جائے
تو وہ اس کے سرہانے بیٹھ کر قریب سے گزرنے والوں سے درخواست کریں گے
کہ میرا بلبل سو رہا ہے شور و غل نہ مچا..... کچھ ایسے لوگ ہوں گے جن کی شخصیت
کے حوالے سے گدھ مناسب ترین پرندہ ہوگا اور آہستہ آہستہ موٹر کاروں کی طرح
پرندے بھی سٹیٹس سمبل میں شامل ہو جائیں گے اور محفلوں میں کچھ اس قسم کی گفتگو
بھی سننے میں آیا کرے گی۔

بھئی ناصر کو آج صبح دیکھا تھا؟ کتنے فاقہ زدہ قسم کے طوطے کے ساتھ سیر

کر رہا تھا...... بھلے آدمی اگر تم کوئی اچھی اور مہنگی قسم کا پرندہ افورڈ نہیں کر سکتے تو کم از کم طوطے کی خوراک کا ہی خیال رکھا کرو؟

اور راشد صاحب ان دنوں بٹیروں کے ساتھ سیر کرتے ہیں.....؟

"میں نے تو انکل سے کہہ دیا تھا کہ امریکہ سے واپسی پر کوئی اچھا سا برڈ لیتے آنا وہ ایک نئی چچی جان لے آئے اور کہنے لگے یہ بھی برڈ ہے"

بھئی مرزا صاحب امیر آدمی ہیں ہر دوسرے ہفتے اپنا پرندہ بدل ڈالتے ہیں کہتے ہیں ماڈل پرانا ہو گیا ہے ان دنوں کونسا پرندہ ہے ان کے پاس.....

"شتر مرغ"

"اچھا!..... امپورٹڈ ہو گا"

"ہاں شتر مرغ کا تازہ ترین ماڈل ہے جب اس کے ساتھ صبح کو سیر کے لئے نکلتے ہیں تو پوری دنیا دیکھتی ہے"

"سنا ہے شتر مرغ انڈے بھی دیتا ہے"

"بیوقوف شتر مرغ نہیں بلکہ شتر مرغی انڈے دیتی ہے.....؟

"بس جی پیسے کی بات ہے..... کبھی توفیق ہوئی تو ہم بھی شتر مرغ سے کوئی بڑا پرندہ خریدیں گے اور اسے ساتھ لے کر مرزا صاحب کے گھر کے سامنے سے گزریں گے..."

میں بھی اسی سوچ میں ہوں کہ اگر کل کلاں پرندوں کے ساتھ سیر کرنے کا رواج ہو گیا تو میں کونسے پرندے کے ساتھ سیر کرنا پسند کروں گا صرف اُلو ذہن میں آتا ہے لیکن اس میں ایک قباحت ہے..... کہیں دیکھنے والے یہ نہ کہیں کہ دیکھو دو اُلو سیر کو جا رہے ہیں۔

مُرغ مسٹر ٹوبی

اگلے روز کسی مُرغ یا مُرغی کی تلاش میں "پرندوں کے شہر" ٹولنٹن مارکیٹ میں جا نکلا۔

ہر سُو پرندے چہچہا رہے تھے۔ کبوتر غٹرغوں طوطے ٹیں ٹیں آسٹریلوی چڑیاں چُوں چُوں..... غرض کہ عجب دل بہار سماں تھا۔ ان مرغانِ چمن کی چہچہاہٹ میں اگر ایک خاص قسم کی بدبو نہ ہوتی تو گماں گذرتا کہ کسی ایرانی گلشن میں وارد ہو گئے ہیں۔ اس پُربہار منظر میں ایک مقتل بھی نظر آیا۔ جہاں مرغیاں "قتل" ہو رہی تھیں۔ کوئی صاحب بارات کے کھانے کے لئے گوشت خریدنے آئے تھے اور دو چار سو معصوم قسم کی مرغیوں کو ذبح کروا رہے تھے۔ ذبح کرنے والے حضرات کے ہاتھ میں ایک طویل چھری تھی۔ وہ مرغی کو دبوچتے، چھری اس کی گردن پر پھیرتے، کبھی چلاتے کبھی رکھتے، اور پھر خون آلود پرندے کو ایک ڈرم کی طرف اچھال دیتے کبھی نشانہ خطا جاتا کہ مرغی ڈرم میں گرنے کی بجائے فٹ پاتھ پر جا گرتی اور اکثر اوقات بقیہ ماندہ جان بچانے کے لئے بھاگ اٹھتی۔ اس ہنگامی صورت حال کے لئے ایک آٹھ سالہ بچہ ہمہ وقت چوکس رہتا۔ اور مرغی کا گرم تعاقب کر کے اسے پکڑ لیتا اور ڈرم میں پھینک دیتا۔ ذبح کرنے والے حضرت سگریٹ بھی پی رہے تھے۔ باتیں بھی کر رہے تھے اور فٹ پاتھ سے گزرنے والے حسین چہروں کو بھی دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ کئی مرتبہ مرغی کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیتے یا خفیف سا زخمی کر کے اچھال دیتے۔ ظاہر ہے یہ سارا کام تکبیر کے بغیر ہو رہا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ اس

طور ذبح" کی ہوئی مرغی حلال ہوتی ہے یا نہیں ۔۔۔۔۔ اتنے میں چھری والے صاحب نے
ایک مرغی کو بظاہر حلال کرکے ڈرم کی جانب پھینکا نشانہ چوک گیا، اور مرغی فٹ پاتھ
پر دوڑنے لگی معلوم ہوا کہ گردن بالکل سلامت ہے، اور چھری صرف پروں کو کاٹ
کر ہی اٹھ گئی تھی۔ چونکہ بالکل صحت مند اور نارمل مرغی تھی اس لئے بچہ اس کا
تعاقب نہ کر سکا اور وہ خوش قسمت مال روڈ عبور کرکے انارکلی کی جانب چمپت ہو
گئی وقتی طور پر اس کی گردن اور جان محفوظ تھیں لیکن مرغی بے چاری کو کیا پتہ کہ اس
کی جان تو جانی ہی جانی ہے، چھری اسے خود بخود ڈھونڈ لے گی ۔۔۔۔۔ اس عارضی
طور پر خوش قسمت مرغی کو دیکھ کر مجھے ایک سدا کا خوش نصیب مرغ مسٹر ٹوبی یاد آ گیا۔

زمانہ قدیم میں جب میں انگلستان میں، رہائش پذیر تھا۔ کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں
ہوئیں تو میں تبدیلی آب و ہوا کی خاطر لندن سے مانچسٹر چلا گیا جہاں دور کے ایک
عزیز عظمت صاحب ایک بورڈنگ ہاؤس چلاتے تھے۔ اس بوسیدہ وکٹورین
ہاؤس کو بورڈنگ ہاؤس ہی کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں رہائش پذیر پاکستانی
اجتماعی طور پر کھانے پکاتے اور گھر کے فرشوں، دالانوں اور سٹوروں میں رات کو سو جاتے
صبح ہوتی تو رات کی شفٹ پر کام کرنے والے واپس آتے اور انہیں بیدار کرکے
ان کے گرم بستروں میں گھس جاتے۔ یہ پاکستانی مذہب کے بارے میں بے حد حساس
تھے "بھول چوک" ہو جاتی تو فوراً کانوں کو ہاتھ لگا کر خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ میاں
سے معافی مانگ لیتے۔ البتہ ایک مسئلہ ایسا تھا کہ اس میں وہ کبھی بھول چوک نہ کرتے
اور وہ تھا حلال گوشت کا مسئلہ۔ سٹوروں میں بکنے والا گوشت ظاہر ہے جھٹکے کا
ہوتا ہے اور یہودیوں کی کوشر گوشت کی دکانیں ان دنوں بہت کم تھیں چنانچہ چھٹی
کے روز ان میں سے کوئی ایک وین پر سوار ہو کر شہر سے باہر کسی گاؤں میں جاتا اور
چار پانچ درجن زندہ مرغیاں خرید کر لے آتا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ان مرغیوں کو کہاں

چھپایا جائے کیونکہ برطانوی قانون کے مطابق آپ کوئی بھی جانور بغیر لائسنس کے
اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتے۔ اور اگر آپ اس کی جان لیتے ہیں تو آپ پر جانوروں کی
حفاظت کے قانون کے تحت مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ان مرغیوں کو گھر کے
تاریک تہہ خانے میں رکھا جاتا اور روزانہ ان میں سے چند ایک کو چوری چھپے
حلال کرکے ان کے بال و پر زمین میں دفن کر دیئے جاتے۔ اس دوران کسی انگریز
ہمسائے نے شکایت کر دی کہ ان ظالم پاکستانیوں نے اپنے تہہ خانے میں مرغیوں
کو قید کر رکھا ہے اور مزید یہ کہ ان بے چارے پرندوں کو قتل بھی کیا جاتا ہے۔
اس لئے تحقیق کی جائے۔

تحقیق کرنے کے لئے ایک نہایت نستعلیق قسم کے انگریز صاحب بہادر
تشریف لائے۔ سیاہ تھری پیس سوٹ، باؤلر ہیٹ اور ہاتھ میں چھتری۔ تمام پاکستانی
بھائیوں کی نظروں کے سامنے جیل کی سلاخیں گھوم گئیں۔ کیونکہ اگر الزام ثابت ہو
جاتا تو وہ سب کے سب گرفتار کیے جا سکتے تھے۔ چنانچہ جل تو جلال تو کا ورد شروع
ہو گیا۔ انگریز صاحب نے تہہ خانے کو اترتی ہوئی سیڑھیوں کا دروازہ کھولا اور تحقیق
کی خاطر نیچے اترنے لگے تہہ خانے میں ظاہر ہے مکمل تاریکی تھی۔ سب حضرات بے حد
پریشان تھے کہ صاحب ہماری مرغیاں ڈھونڈ لے گا اور ہمیں تھانے لے جائے گا
اتنے میں تہہ خانے میں سے ایک دلدوز چیخ سنائی دی جو حیوانی بھی تھی اور انسانی بھی
اور ساتھ ہی انگریز صاحب بہادر لرزتے اور مقدس دعاؤں کا ورد کرتے ہوئے
گرتے پڑتے باہر آ گئے ان کا رنگ اڑا ہوا تھا اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ گھر
سے باہر لڑکھڑاتے ہوئے نکلے اور صرف اتنا کہا کہ مقدس مریم کی قسم اس تہہ خانے میں
کوئی بھوت براجمان ہے اور پھر وہاں سے ایسے بھاگے کہ اپنا چھاتا بھی بھول گئے۔
حقیقت یہ تھی کہ تہہ خانے کی آخری سیڑھی پر ایک مرغ محو استراحت تھا۔ جونہی

صاحب بہادر اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے نیچے اُترے اور مرغ پر قدم رنجہ فرمایا تو حسب توقع مرغ صاحب نے ایک دردناک "کڑوں کُوں" کردی اور اس کے ساتھ ہی صاحب بہادر نے ایک "یا ہُو" کی چیخ ماری اور باہر آگئے۔ چونکہ اس مرغ نے گھر کے مکینوں کو جیل جانے سے بچایا تھا اس لئے طے یہ ہوا کہ اس کا احسان چکانے کی خاطر اسے کبھی ذبح نہ کیا جائے۔ اور اسے اسی صاحب بہادر کا نام دے دیا جائے جو اس کی "کڑوں کُوں" سے فوت ہونے لگا تھا یعنی مسٹر ٹوبی۔ مسٹر ٹوبی نے ایک طویل عمر پائی اور پھر انگلستان کی سرزمین میں ہی چھری کی دھار سے ناآشنا گردن کے ساتھ دفن ہوا اگر مرغوں کی جنت ہوتی ہے تو یقیناً وہ اس وقت جنت میں ہوگا........

ٹولنٹن مارکیٹ سے فرار ہوتی ہوئی مرغی کو دیکھ کر مجھے مسٹر ٹوبی یاد آگیا تھا اور میں نے اس کی یاد کے احترام میں اس روز مرغ یا مرغی کھانے کا فیصلہ ترک کر دیا اور خالی ہاتھ گھر واپس آگیا مجھے یقین ہے کہ مسٹر ٹوبی کی روح مجھ سے بہت خوش ہوگی۔

گلیو گلی

معراج پتھر گوالمنڈی کی ایک گلی میں سے نمودار ہوا، اپنے کھٹارا موٹر سائیکل کو روک کر بڑی احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر جلدی سے سڑک پار کر کے سامنے والی گلی میں گھس گیا۔ میرا وہ ہاتھ اٹھا کا اٹھا ہی رہ گیا جو میں نے اُسے "ہیلو" کہنے کے لئے فضا میں بلند کیا تھا۔

یہ معراج پتھر کو ہو کیا گیا ہے۔ میں نے سوچا۔ وہ کئی روز سے میری دکان کی طرف بھی نہیں آیا تھا۔ معراج پتھر پکّا "نسبت روڈیا" ہے۔ اپنا جگر تو نہیں البتہ جاننے والا ضرور ہے۔ جسم بہت پکا پیڈا اقد نکلتا نکلتا رہ گیا ہے پیراہن کرتا اور چست پاجامہ اور چہرے پر قرون وسطےٰ کے فرانسیسی بادشاہوں ایسی تراشی ہوئی داڑھی۔ آواز میں ایسی کھرج کہ اگر انگریزی بول سکتا تو مشہور شیکسپیرین اداکار جان گلگڈ کو مات کر دیتا۔ ملّاں معراج بھی کہلاتا ہے اور گلی محلے میں آشنا عجب ہے کہ گوالمنڈی کے آس پاس رہنے کے باوجود ابھی تک معراج ہے "ماجھا" نہیں بنا۔ پتھر کی ایسی پہچان رکھتا ہے کہ جوہری حضرات اس کے پاؤں چھوتے ہیں اور یہی اس کا پیشہ ہے۔ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ کسی میلے ٹھیلے میں جائے گا۔ ایک چکر لگائے گا اور وہاں پر لگی دکانوں میں سے نگ اور پتھر خریدتا جائے گا۔ دوسرا چکر لگائے گا اور وہی پتھر دگنے داموں پر انہی دکانداروں کے ہاتھ فروخت کر آئے گا۔ پہلے پھیرے پر وہ ایک اجڈ اور جاہل خریدار ہوگا اور دوسرے

پھیرے پر وہ انہی دکانداروں کو بتائے گا کہ میاں یہ پتھر فلاں ہے اور یہ نگ اتنی قیمت کا ہے جو تم نے پہچان نہ ہونے کی بنا پر ابھی ابھی میرے ہاتھوں فروخت کیا ہے، بتاؤ اب کیا دام دیتے ہو، چنانچہ معراج پتھر ایک ماہ میں صرف ایک مرتبہ باہر نکلتا ہے اور اپنی پتھر شناسی کی بدولت پورے مہینے کا خرچ جیب میں ڈال کر گھر واپس آجاتا ہے۔ باقی سارا مہینہ وہ دنیا کے ہر موضوع پر "گفتگومیں" کرتا ہے "مشرق" کے دفتر کے پہلو میں واقع ہوٹل میں چائے پیتا ہے اور آپ کسی بھی موضوع کو چھیڑ دیں وہ سینے پر مکا مار کر کہتا ہے " ایہہ سا ہوں پچھو" ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ معراج پتھر گوالمنڈی کی ایک گلی میں سے نمودار ہوا، اپنے کھٹارا موٹر سائیکل کو روک کر بڑی احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر جلدی سے سڑک پار کر کے سامنے والی گلی میں گھس گیا۔۔۔

یہ معراج پتھر کو ہو کیا گیا ہے، میں نے سوچا۔

ایک روز میں گوالمنڈی چوک میں سے گذر رہا تھا کہ معراج پتھر حسب معمول ایک گلی میں سے نکلا، لیکن سیدھا میرے پاس آیا۔ کہنے لگا " بادشاہو آج پیدل ہو" میں نے کہا " موٹر سائیکل پھر پنکچر ہو گیا ہے " کہنے لگا " بیٹھو فٹافٹ "، میں بیٹھ گیا میں نے لوہاری جانا تھا اس نے پہلے موٹر سائیکل کو کرشنا گلی کی بھول بھلیوں میں ڈالا اور پھر لمحہ بھر کے لئے بڑی سڑک پر آیا اور پھر ایک دم شڑاپ سے گوروارجن نگر کی ایک گلی میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم لوہاری چوک میں نکلتی ہوئی ایک گلی میں تھے اس نے مجھے اتارا اور نزدیک ترین گلی میں روپوش ہو گیا یہ معراج پتھر کو ہو کیا گیا ہے، میں نے سوچا۔

میرا موٹر سائیکل بدستور پنکچر تھا اور میں شہر آنے کے لئے بس سٹاپ پر کھڑا رہا تھا۔ اتنی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ معراج پتھر نہر کے کنارے ایک چھوٹے سے راستے میں سے نکلتا ہے اور میرے پاس آجاتا ہے " شہر جانا ہے تاڑ صاحب "۔۔۔

میں پھر اس کی پچھلی نشست پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اس نے موٹر سائیکل ظفر علی روڈ پر ڈالا، مال پر آنے کی بجائے ہوٹل انٹرنیشنل کے پہلو میں سے نکل کر جانے کون سی آبادی میں آ گیا۔ پھر وہی گلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جنہیں میں زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا، ایک طویل سفر کے بعد اس نے مجھے نسبت روڈ کے چوک میں لا اتارا۔۔۔

وہ حسب عادت موٹر سائیکل سے اتر کر مجھ سے بغل گیر ہوا تو میں اسے اسی عالم بغلگیری میں کھینچتا ہوا سامنے کے ہوٹل میں لے گیا " یار " " تاڑ صاحب جانے دو مجھے بہت ضروری کام ہیں " میں نے کہا " نہیں معراج آج نہیں جانے دوں گا۔ مجھے بتاؤ کہ تم اتنے مشکوک سے کیوں ہوئے جا رہے ہو، بڑی سڑکیں اور شاہراہیں چھوڑ کر گلیوں اور تنگ راستوں میں موٹر سائیکل کیوں چلاتے ہو؟"

معراج کھسیانہ سا ہو کر بولا، یار میں نے سیدھا راستہ چھوڑ دیا ہے۔

میں نے پوچھا کیوں؟

کہنے لگا " بھائی میرے ہر سیدھے راستے پر پولیس کھڑی ہے۔ ریڈیں لگی ہوئی ہیں چیکنگ ہو رہی ہے، میرے پاس کاغذات بھی مکمل ہیں لیکن اتنا وقت نہیں کہ ہر پانچ منٹ کے بعد پیشی بھگتتا پھروں اور خواہ مخواہ مجرم محسوس کروں۔۔۔؟"

میں نے اسے بہت لعن طعن کی کہ معراج پتھر یہ بہت غلط بات ہے۔ انسان کو ہمیشہ سیدھے راستے پر چلنا چاہیئے چاہے اسے کتنی ہی مشکلات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ کہنے لگا، تم پڑھے لکھے ادیب لوگ ہو تم چلو سیدھے راستے پر، میں تو گلیو گلی ہی چلوں گا، کاغذات مکمل ہوں تو بھی چیکنگ والے کوئی نہ کوئی دفع ڈور لگا دیتے ہیں، کوئی نہ کوئی غلطی نکال لیتے ہیں کہ نمبر پلیٹ ٹوٹی ہوئی ہے۔ انڈی کیٹر نہیں جل رہا وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔ معراج پتھر نے چائے ختم کی، موٹر سائیکل پر سوار ہوا، اور ایک گلی میں روپوش ہو گیا اس پر میرے لیکچر کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔۔۔۔ ہمارے معاشرے

ہیں صرف معراج پتھر ہی نہیں جس نے سیدھا راستہ چھوڑ دیا ہے اور "گلیو گلی" سفر کرتا ہے بلکہ اس فہرست میں تو افسر، ملازم، دکاندار، دانشور، ادیب اور دولت مند طبقہ بھی شامل ہے جو چیکنگ کے خوف سے بڑی شاہراہوں کو چھوڑ کر چھوٹے راستوں پر چل نکلا ہے۔ کچھ کے پاس تو پورے "کاغذات" ہیں لیکن بیشتر بغیر رجسٹریشن کے ہیں اور ڈرائیونگ لائسنس کی غیر موجودگی میں بھی اپنی اپنی سواریوں پر دندناتے پھرتے ہیں بہر حال میں چونکہ معراج پتھر کی طرح بزدل نہیں تھا اور سیدھے راستے پر چلنے کا خواہش مند تھا اس لئے جس روز میرا موٹر سائیکل ٹھیک ہوا میں اسے سٹارٹ کر کے بڑے اطمینان سے جیل روڈ پر جا رہا تھا کہ روک لیا گیا۔ ایک وہ ٹریفک سارجنٹ سپاہی اور بے شمار موٹر سائیکلیں، پریشان چہرے اور سیاہ ہوتی ہوئی چالان کاپیاں میرے کاغذات تقریباً مکمل تھے۔ البتہ سپاہی کو میرا نام لکھنے میں جو دشواری پیش آئی اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بہر حال بڑی مشکل سے جان چھوٹی اور جتنی دیر میں جان چھوٹی اتنی دیر میں میرے بچوں کو سکول سے چھٹی ہو چکی تھی اور وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں بھوکے پیاسے فٹ پاتھ پر بیٹھے میری راہ تک رہے تھے ...... شام کو شہر سے گھر کی جانب چلا تو جیل روڈ پر ہی ایک اور مورچے کا سامنا ہو گیا، عرض کیا کہ کاغذات چیک ہو چکے ہیں لیکن ..... جتنی دیر میں یہاں سے جان چھوٹی اتنی دیر میں وہ کباب ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ جو میں رات کے کھانے کے لئے گھر لے جا رہا تھا مجھے تو پھر بھی مختلف حوالوں سے لوگ پہچان جاتے ہیں ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہو گا جو بالکل بے نام ہیں، عام لوگ ہیں؟

اگلے روز میں اپنے موٹر سائیکل پر سوار ہوا اور جیل روڈ، مال روڈ کے سیدھے راستے چھوڑ کر معراج پتھر کے دریافت کردہ پوشیدہ راستوں پر چل نکلا اور "گلیو گلی" ہو گیا اللہ بھلا کرے معراج پتھر کا جس نے مجھے یہ "سیدھا راستہ" دکھایا۔

کالے کبوتر سفید کبوتر

جہاں میں بیٹھا ہوں۔ اس عمارت کی چھت کے شہتیروں میں کالے کبوتر رہتے ہیں اور کبوتر چاہے کالے ہوں یا سفید وہ بیٹ ضرور کرتے ہیں اور یہ بیٹ ہر آدھ پون گھنٹے کے بعد چپک سے میرے کوٹ یا سویٹر پر برس پڑتی ہے کبھی سر کے بالوں میں نمی کا احساس ہوتا ہے تو بالوں پر ہاتھ پھیرنے سے انکشاف ہوتا ہے کہ وہاں بھی کبوتر کریم کا ایک لیپ موجود ہے ہر حملے کے بعد میں اپنی پوزیشن بدل لیتا ہوں، لیکن معینہ وقفے کے بعد بیٹ مجھے تلاش کر کے میرے اوپر آن گرتی ہے ان کالے کبوتروں کی وجہ سے میری گھریلو زندگی بھی متاثر ہو رہی ہے۔ خاتون خانہ میرے کپڑوں کو برش کرتی ہے، پانی میں بھگو کر صاف کرنے کی کوشش کرتی ہے مگر تیزابی بیٹ کے اثرات نمایاں نظر آتے رہتے ہیں اور وہ تنگ آ کر کہتی ہے کہ تم خاص طور پر ایسی جگہ ہی کیوں بیٹھتے ہو جہاں تمہارے سر کے عین اوپر ایک عدد کبوتر اس لمحے میں معلق ہو جب اس نے ہر صورت بیٹ کرنی ہوتی ہے۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ اے نیک بخت میں جس جگہ بھی بیٹھتا ہوں وہاں پر یہی حشر ہوتا ہے لیکن اس کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ صرف میری نالائقی کی وجہ سے ہوتا ہے چنانچہ ایک روز وہ کافی دیر تک اس جگہ پر بیٹھی رہی، جہاں عام حالات میں مجھ پہ ہر بیس منٹ کے بعد ایک بیٹ وارد ہو جاتی ہے مگر اس روز میں نے اوپر دیکھا تو تمام شہتیر خالی تھے پتہ نہیں وہ کبوتر کہاں چلے گئے۔ بہر حال میری خاتون خانہ کا یہ واہمہ تقویت پکڑ

گیا ہے کہ یہ بیٹ بزنس صرف میری نالائقی کی وجہ سے مجھ پر برستا ہے۔ تب میں نے ان کبوتروں سے گلو خلاصی کروانے کے لئے چند ہنگامی نوعیت کی تدابیر سوچیں سب سے پہلے تو میں نے ردی کاغذ کے گیند بنا کر ان کی آماجگاہوں کی جانب پھینکے اور اس روز مجھے معلوم ہوا کہ پتھر پھینکنا کتنا آسان کام ہے اور کاغذی گیندیں پھینکنا کتنا مشکل شاید میں بوڑھا ہو رہا ہوں اور دیگر "زوروں" کے علاوہ میرا زورِ بازو بھی کم ہوتا جا رہا ہے کیونکہ بیشتر گیندیں "ہدف" پر پہنچنے کی بجائے میرے چہرے پر آ کر گریں تھوڑی دیر کی مشق کے بعد چند گیندیں کبوتروں کو لگیں لیکن وہ پر پھیلا کر پھڑپھڑائے اور وہیں بیٹھے رہے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ کسی بچے کی شاٹ گن مانگ کر ان بدبختوں کو ہلاک کر دیا جائے لیکن میں چونکہ ہر قسم کی خونریزی کے خلاف ہوں اس لئے اس مشورے پر عمل کرنے کی ہمت نہ کر سکا اب حالت یہ ہو گئی کہ میں ہمہ وقت ان کالے کبوتروں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بارے میں سوچتا رہتا۔ دوستوں کے ساتھ بھی کبوتروں کے بارے میں ہی گفتگو کرتا اور گھر میں تو ظاہر ہے یہی موضوع زیرِ بحث رہتا کیونکہ میرے کوٹ اور سویٹر اب باقاعدہ سفید ہوتے چلے جا رہے تھے ایک اور دوست نے کہا کہ وہ ان کالے کبوتروں کا قلع قمع کر دے گا میں نے پوچھا کہ آپ ایسا کیسے کریں گے؟ وہ کہنے لگا میں ان کو کھا جاؤں گا۔ میں نے کہا سو بسم اللہ کھا جائیے۔ اس نے کہا کھاؤں، کیسے؟ تم پکڑ کر دے دو میں کھا لوں گا..... بد بگلے کے سر پر موم رکھ کر اسے پکڑنے والی بات تھی۔ اس لئے اس پر بھی عمل نہ ہو سکا۔

انہی دنوں ایک شام نسبت روڈ کے چوک میں معراج پتھر سے ملاقات ہو گئی وہ صبح کی نہاری کو شام کے وقت کھا رہا تھا اور اس کا چہرہ مرچوں کی تیزی کے باعث سرخ مرچ ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا "تارڑ صاحب مزا آ گیا؟"

پچھلی شب میرا لکھا ہوا ایک ڈرامہ ٹیلی ویژن پر چلا تھا اس لئے میں نے سوچا کہ معراج پتھر اس کی تعریف کر رہا ہے۔ چنانچہ میں نے پوچھا "اچھا تھا؟"

کہنے لگا "اچھی ہے؟"

میں نے کہا "کون؟"

کہنے لگا "یہی نہاری جو میں کھا رہا ہوں صرف مرچیں کم ہیں"

اس کے بعد معراج پتھر نے ایک طویل لیکچر میں مجھے بتایا کہ نہاری کے اجزائے ترکیبی کیا ہوتے ہیں اسے کس طرح پکایا جاتا ہے اور اس کے کھانے کے بعد اگلی صبح کھانے والے کو کیا کیا "مشکلات" پیش آتی ہیں اور اگر دیگ میں ایک دو کبوتر بھی ڈال دیئے جائیں تو کتنی مزیدار ہو سکتی ہے کبوتروں کے نام پر میں چونکا اور معراج پتھر کا بازو پکڑ لیا "یار معراج ایک دو نہیں درجنوں کبوتر میرے پاس ہیں میرا مطلب ہے شہتیروں میں بیٹھے ہیں خدا کے لئے تم ان کو پکڑ کر ان کی نہاری پکا لو"

اس پر وہ قدرے حیران ہوا اور مجھ سے تفصیل اس اجمال کی پوچھی جو میں نے بیان کر دی۔ اس نے مجھے تسلی دی اور کہنے لگا کبوتر کالے ہیں ناں؟ میں نے کہا بالکل۔ تقریباً میرے رنگ کے"

وہ بولا "پھر تو باقاعدہ کالے سیاہ ہوئے۔ آپ جناب ایسا کریں کہ کہیں سے سفید کبوتروں کے انڈے حاصل کریں۔ انڈے صرف سفید کبوتروں کے ہونے چاہئیں پھر ان انڈوں کو ان شہتیروں کے درمیان رکھ دیں، جہاں یہ کالے کبوتر رہتے ہیں..... کبوتر ان انڈوں پر بیٹھ جائیں گے اور جب ان میں سے بچے نکلیں گے تو وہ سفید ہوں گے"

میں نے جھنجھلا کر کہا معراج پتھر میں ان کبوتروں کو ختم کرنا چاہتا ہوں اور تم ان کی افزائش نسل کی ترکیبیں بتا رہے ہو......

معراج پتھر بولا۔ بادشاہو سنتے جاؤ، جونہی انڈوں میں سے سفید بچے نکلیں گے کالے کبوتر ان کو دیکھ کر اتنے ہراساں ہوں گے کہ فوراً اس جگہ سے ہمیشہ کے لئے

چلے جائیں گے۔ ہمارے چچا کبوتر باز کا نسخہ ہے بے شک آزما لو۔

اب میں سوچ میں ہوں کہ سفید کبوتروں کے انڈے کہاں سے حاصل کروں۔ یہ نہ ہو کہ وہ کالے کبوتروں کے ہی ہوں انڈے کے اندر جھانک کر تو دیکھا نہیں جا سکتا۔ ویسے عجیب بات ہے کہ کالے کبوتر محنت کر کے وقت ضائع کرتے ہیں اور انڈوں پہ بیٹھتے ہیں اور اگر ان میں سے سفید بچے نکل آئیں تو انہیں دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں حالانکہ دنیا کی ترقی پذیر اقوام میں تو ایسے کالے کبوتر ہیں جو محنت کرتے ہیں، مشقت کرتے ہیں اور جب بچے نکلتے ہیں تو وہ سفید ہوتے ہیں اور انہیں ترقی یافتہ اقوام اپنے ہم نسل قرار دے کر لے جاتے ہیں۔ کالے کبوتروں کے لئے بہتر ہے کہ وہ اپنے انڈوں پر ہی بیٹھا کریں۔

بائی پاس کے آس پاس

"تمہارے دل کا کیا حال ہے؟"

"دھڑکتا ہے"

"کس کو دیکھ کر؟"

"ڈاکٹر کے بل کو دیکھ کر"

"یار فرقان امراض قلب کے اس ڈاکٹر کے بارے میں پڑھا ہے جو اپنی تمام آمدنی اپنے ہسپتال کے مریضوں پر خرچ کر دیتا ہے؟"

"اور پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ پاکستانی ڈاکٹر سکھی انسانیت کو دکھی بنا رہے ہیں"

"وہ ڈاکٹر پاکستانی نہیں ہے انگلستان کے ایک امراض قلب کے خصوصی ہسپتال کا ڈاکٹر ہے"

"گویا انگریز ہوا"

"ہاں"

"بس یہ کافر لوگ اسی قسم کی الٹی سیدھی حرکتیں کرتے رہتے ہیں..... پہلے بھی کرتے تھے، اب بھی کرتے ہیں"

"پہلے بھی کرتے تھے؟"

"اور کیا؟..... لاہور کے سارے بڑے ہسپتال دیکھ لو انہی کافر لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ گلاب دیوی، گنگا رام، جانکی دیوی، لیڈی ولنگڈن، میو ہسپتال وغیرہ"

”لیکن بھائی یرقان یہ ہم مسلمانوں کے لئے شرم کی بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر جو عنایات کر رکھی ہیں ہم شکر کے طور پر ان عنایات کا کچھ حصہ بیماروں اور لاچاروں کے لئے نہ وقف کر دیں“

”بھائی فرقان تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے کہ ہم لوگ ہسپتال نہیں بنواتے..... ذرا گلبرگ، شادمان اور جیل روڈ پر ابھرتے ہوئے جدید ترین کلنک بھی تو دیکھو کیا ایئر کنڈیشنگ ہے، کیا ساز و سامان ہے“

”بھائی یرقان وہاں مفت علاج ہوتا ہے؟“

”حماقت کی باتیں مت کیا کرو بھائی فرقان۔ ان کلینکوں میں تازہ ترین درآمدی مشینیں نصب ہوتی ہیں، سپیشلسٹ حضرات کی فوجیں ہوتی ہیں، نرسیں ہوتی ہیں اب جو شخص اتنی لمبی چوڑی انوسٹمنٹ کرے گا وہ کچھ کمائے گا بھی، خالی جیب تو گھر نہیں جائے گا“

”یعنی کلنک کھولنا بھی انڈسٹری لگانے کے مترادف ہے؟“

”اس سے کہیں زیادہ منافع بخش..... میرے ایک دوست کی انگلی پر چوٹ آ گئی وہ ایک ایسے ہی کلنک میں جا نکلا۔ انگلی کا بڑا تفصیلی معائنہ کیا گیا اور پھر پٹی باندھ دی گئی، اور تمہیں پتہ ہے بل کیا تھا؟ صرف ساڑھے چار سو روپے.....“

”ہاں زیادہ تو نہیں ہے۔ انگلی اگر سیپٹک ہو جاتی تو جان کا خطرہ تھا۔ یوں سمجھو کہ ساڑھے چار سو روپے میں جان بچ گئی۔ مہنگا سودا تو نہیں ہے“

”پھر بھی یرقان بھائی آپ جیسے لوگ جو ماشاءاللہ کروڑوں میں کھیلتے ہیں کیا کھیلتے ہیں، اس کا مجھے علم نہیں لیکن کھیلتے ہیں، آپ کو چاہئے کہ غریب غربا اور مڈل کلاس لوگوں کے لئے گنگا رام جتنا ہی ایک ہسپتال بنوا دیں“

”بھئی یہ حکومتوں کا کام ہے ہم اس میں دخل اندازی نہیں کرتے.....“

”کیوں حکومتوں کا کیوں کام ہے؟“

”ہم انہیں ٹیکس جو دیتے ہیں، بنواتی پھریں ہسپتال وغیرہ.....؟“

”ہاں“

”ایمان سے کہتے ہو“

”یار فرقان اتنی چھوٹی سی بات کے لئے ایمان کو بیچ میں مت لاؤ..... اور پھر ہم لوگوں کے خرچے بھی تو بہت ہیں.....؟“

”کم کر دو خرچے“

”جاپان والے کم نہیں کرنے دیتے“

”جاپان والے؟“

”ہاں کم بخت ہر دوسرے روز ایسا ایسا شاندار ماڈل بنا کر بھیج دیتے ہیں کہ پہلی کاریں چھوڑ کر نئے ماڈل والی خریدنا پڑتی ہیں۔ خرچ کیسے کم ہوں اور پھر ہمارے علاج معالجے کا خرچ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے اور امریکہ جا کر ایک بائی پاس آپریشن کرواؤ تو پانچ چھ لاکھ نکل جاتے ہیں“

”بھائی یرقان اگر عام آدمی یعنی کسی چھوٹے موٹے افسر، ادیب، صحافی یا کم آمدن والے شخص کو اس قسم کی خطرناک بیماری لگ جائے تو وہ کیا کرتا ہے؟“

”انہیں ایسی بیماری لگتی ہی نہیں“

”کیوں؟“

”بھئی نہ وہ سپیشلسٹ کے پاس جاتے ہیں، کیونکہ جیب میں رقم نہیں ہوتی، نہ ہی ٹیسٹ وغیرہ کروا سکتے ہیں اس لئے انہیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان کو کیا بیماری ہے چنانچہ مزے سے آرام سے فوت ہو جاتے ہیں..... میں بھی اگلے ماہ امریکہ جا رہا ہوں“

"کیا کرنے؟"

بائی پاس سرجری کروانے"

"لیکن بھائی یرقان آپ تو ماشاء اللہ بالکل صحت مند ہیں ...... آپ دل کے مریض تو نہیں؟"

"اگر میں دل کا مریض نہیں ہوں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں بائی پاس سرجری کے لئے امریکہ نہ جاؤں ..... بھائی میرے ان دنوں جو شخص بھی امریکہ یا یورپ جا کر بائی پاس سرجری نہیں کرواتا اسے ککڑا اور چیچڑ کنا تیا سمجھا جاتا ہے میرے تقریباً سبھی جاننے والے یہ آپریشن کروا چکے ہیں اور بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ ہم بائی پاس کروا کے آئے ہیں سچ پوچھو تو مجھے بڑی شرمندگی ہوتی ہے چنانچہ اب میں نے اعلان کر دیا ہے کہ صاحبو میں بھی بائی پاس کروانے جا رہا ہوں وہاں جا کر کسی پرائیویٹ کلنک میں داخل ہو کر چند ہفتے آرام کریں گے۔ دو چار لاکھ کی کیا بات ہے۔ ذرا شغل رہے گا۔"

گلیشیئر پگھلانے کا صحیح طریقہ

ہمارے بیشتر گلوکار بے حد "بھیبے" اور سادہ دل ہوتے ہیں انہیں پوچھئے کہ آپ نے گلوکاری کب شروع کی تو جواب ملے گا۔ جی بچپن سے ہی شوق تھا گھر میں بھی ماحول تھا والد اور والدہ صاحبہ نے حوصلہ افزائی کی اور پھر جی پبلک نے پسند کیا تو اللہ کے فضل سے یہ مقام مل گیا ..... البتہ ہمارے کچھ گلوکار ایسے ہیں جو گانے کے علاوہ گفتگو بھی اچھی کرتے ہیں اور ان میں ریشماں، عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، مہدی حسن، نورجہاں وغیرہ شامل ہیں۔

ٹیلی ویژن پر موسیقی کے ایک پروگرام کی میزبانی کے دوران جب میں نے مہدی حسن صاحب سے ان کے "گلاس توڑ" بیان کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے وہ بیان سینے پر ہاتھ رکھ کر دہرایا ان کا کہنا تھا کہ اگر آواز ایک خاص فریکوئنسی پر لگائی جائے تو ہوا میں ارتعاش کی وجہ سے گلاس ٹوٹ جاتا ہے میں نے عرض کیا کہ پھر یہ کمال تو کوئی بھی کر سکتا ہے اس میں گلوکار یا اعلیٰ درجہ کا گلوکار ہونا تو شرط نہیں اس پر انہوں نے فرمایا کہ آواز اگر سر میں نہیں ہوگی تو ہوا میں ارتعاش پیدا نہیں ہوگا حالانکہ کئی عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ سلطان راہی کی بڑھک اور مصطفیٰ قریشی کی گرج سے سینما گھروں کے شیشے ٹوٹتے انہوں نے خود دیکھے ہیں مہدی حسن صاحب نے کچھ ایسے واقعات بھی سنائے کہ بارش نہیں ہو رہی تھی اور کسی استاد نے تان لگا کر رم جھم رم جھم پڑے پھوار کر دی اسی پروگرام کے دوران ثریا ملتانیکر نے بتایا کہ ان کے ایک بزرگ جو ماہی بادل کے نام سے بھی پکارے جاتے تھے ایسے گنی تھے کہ جب

کبھی ملتان میں بارش نہیں ہوتی تھی تو پبلک ان کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کرتی تھی کچھ کیجئے۔ اور جب وہ گاتے تھے تو بادل آجاتے تھے ظاہر ہے موصوف کو ملتان میں رہتے ہوئے تو دن رات گانا پڑتا ہو گا......

ہمارے گلوکار ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ جی پبلک کی مہربانی سے.... جی پبلک نے پسند کیا تو..... جی ہم تو پبلک کے خادم ہیں.... تو جناب اب پبلک نے انہیں ایک چھوٹی سی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ ایک اخباری اطلاع کے مطابق پبلک نے گلوکاروں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ بارش کے لئے پکے راگ گائیں تاکہ دریاؤں میں پانی کی قلت دور ہو اور لوڈ شیڈنگ سے نجات ملے اور اس کے علاوہ یہ پہاڑوں پر جا کر دیپک راگ گائیں تاکہ حرارت سے گلیشیئر پگھل جائیں چنانچہ اب یہ ہمارے گلوکاروں کا فرض ہے کہ وہ طبلے سارنگیاں اٹھائیں اور پہاڑوں پر چڑھ کر دیپک راگ کا الاپ شروع کر دیں۔ درست راگ کے چناؤ کے لئے وہ بے شک اپنے ایوب رومانی صاحب کو بھی ساتھ لے جائیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ تمغۂ حسن کارکردگی حاصل کرنے والے گلوکاروں کو اس معاملے میں پہل کرنی چاہیئے۔ شنید ہے کہ پکے راگ سن کر گلیشیئر پاش پاش ہو جاتے ہیں گلیشیئر کیا ہم نے ایک محفل میں پکا راگ سن کر ایک صاحب کو دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور بعد ازاں بے ہوش ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے بھلا گلیشیئر کی کیا مجال کہ نہ پگھلے۔

امید ہے کہ ہمارے گلوکار اس قومی فریضے سے پہلو تہی نہیں کریں گے بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ پاکستان کے تمام "فنکاروں" کو یہ موقع ملنا چاہیئے اور پاکستان میں بڑا بڑا "فنکار" پڑا ہے۔ گلیشیئر پگھلانے کا صحیح طریقہ صرف یہی نہیں ہے کہ پکے راگ گانے والوں کو ہمیشہ کے لئے پہاڑوں پہ بھیج دیا جائے بلکہ کچھ اور لوگ

بھی یہی کام بطریق احسن کر سکتے ہیں...... مثلاً۔

ہمارے ہاں شعلہ بیاں مقررین کی بہتات ہے چند ایک کو کسی گلیشیئر پر کھڑا کر کے کہہ دیا جائے کہ بھائی صاحب ایک دو تین..... شروع ہو جائیے۔ کچھ شاعر ہوتے ہیں جو شاعری سے قوم میں ایک نئی روح پھونک دیتے ہیں اور کچھ آگ لگا دیتے ہیں بس یہ آگ لگانے والے کچھ حضرات کو بھی پہاڑوں پر بھیج دیا جائے روحی بانو اور عظمیٰ گیلانی سے درخواست کی جائے کہ وہ کسی گلیشیئر کو سٹیج سمجھ کر اس پر المیہ اداکاری شروع کر دیں تاکہ گلیشیئر آبدیدہ ہو جائے اور ہر جانب آب ہی آب ہو جائے۔

ادیب حضرات وہاں جا کر چند ایک انشائیے اور جدید افسانے گلیشیئروں کو سنائیں ان کی مجال ہے نہ پگھلیں۔

سلطان راہی لاچا باندھ کر وہاں کھڑے ہو جائیں اور ایک زوردار "اوئے میں آگیا آں" کا نعرہ لگائیں اور مصطفیٰ قریشی آرام سے گلیشیئر کے کان میں جا کر کہیں "نواں آیاں ایں سوہنیا"..... گلیشیئر تھر تھر کانپنے لگے گا اور پگھل جائے گا۔

تو یہ ہیں گلیشیئر کو پگھلانے کے صحیح طریقے۔

یہ گدھوں کے میلے کم نہ ہوں گے

میں بہت شرمندہ ہوں، بے حد نادم ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔ اپنے دوستوں سے پڑھنے والوں سے کہ میں ایک مرتبہ پھر انسانوں کی بجائے جانوروں پر کالم باندھ رہا ہوں مثل ایک رسی کے۔ دراصل میں بہت مجبور ہوں۔ کالم کی رسی دراز ہوتی ہے: جب آپ کے آس پاس کوئی "وقوعہ" ہو اخبار میں کوئی ذائقے دار خبر ہو یا آپ کے اندر سے کوئی شعلہ اُٹھے۔ اب میرے آس پاس سوائے ٹریفک کے حادثوں کے اور کچھ نہیں ہو رہا اندر کے شعلے بھی سرد پڑے ہیں اور اخباروں میں بھی انسانوں سے زیادہ جانوروں کے بارے میں خبریں چھپ رہی ہیں جی نہیں میں صرف جانوروں پر لکھنے کے لئے یہ بہانہ نہیں بنا رہا۔۔۔۔ مثلاً یہ کہ فلپائن میں ایک کسان کی بھینس باقاعدہ گفتگو کرنے لگی ہے اور خبردار کرتی ہے کہ جانوروں سے اچھا سلوک کرو ورنہ تم پر عذاب نازل ہوگا اور اگر تم ایسا کرو گے تو بارش ہو گی اور تمہاری فصلیں بہت ہری بھری ہو جائیں گی۔۔۔ "براہ راست" کے راستے یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ حکومت پاکستان دو سو مگرمچھ درآمد کر رہی ہے تاکہ مگرمچھوں کی کمی پر قابو پایا جائے۔۔۔۔۔ اور یہ کہ بھارت کے کسی شہر میں گدھوں کا میلہ منعقد ہوا ہے اور یہ میلہ "پچھلے بارہ سو برس سے بڑی باقاعدی سے منعقد ہوتا چلا آیا ہے۔۔۔۔ یعنی ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔ آپ خود ہی اخبار دیکھ لیجئے اسی قسم کی خبریں آ رہی ہیں۔ فلپائن کی بولنے والی بھینس کو تو فی الفور

اپنے "کارپوریشن" والوں کو امپورٹ کر لینا چاہئے۔ مسئلہ صرف یہ ہوگا کہ ایک عدد بھینس کو کس "کیٹاگری" کے تحت درآمد کیا جائے تو اس کا آسان حل یہ ہے کہ اسے ان مگرمچھوں کے ساتھ ہی امپورٹ کر لیا جائے جن کا آرڈر بھجوایا جا چکا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لاہور شہر کے گلی کوچوں میں محوِ خرام اور محو بربادی ہزاروں بھینسوں کی موجودگی میں ایک اور بھینس کا کارپوریشن کیا کرے گی؛ اس کا جواب بھی بہت آسان ہے کہ جناب یہ بھینس کارپوریشن کی پیاری اور چہیتی بھینسوں سے بہت مختلف ہے یعنی بولتی ہے، گفتگو کرتی ہے اس جواب سے ایک اور سوال پیدا ہوگا کہ آخر کارپوریشن ایک چرب زبان بھینس کا کرے گی کیا۔ میں عرض کرتا ہوں دیکھئے اس وقت شہر میں مقیم بھینسوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے اور انہیں سوائے لوگوں کو زخمی کرنے کے اسکوٹر اور ریڑھیاں الٹانے کے سڑکوں پہ گندگی پھیلانے کے اور کوئی حقوق حاصل نہیں۔ آخر تو وہ بھی لاہور شہر کی "باشندیاں" ہیں انہیں بھی کچھ شہری حقوق ملنے چاہئیں۔ ان کی بھی کوئی آواز ہونی چاہیے اور یہ "آواز" اس فلپائن سے درآمد شدہ بھینس کی ہوگی جو نہ صرف یہ کہ منہ میں زبان رکھتی ہے بلکہ اس زبان کو چلا بھی سکتی ہے۔ چنانچہ کارپوریشن اس بھینس کو لاہور شہر میں دندناتی بھینسوں کی نمائندہ کے طور پہ نامزد کر دے (کیونکہ بھینسیں ووٹ نہیں ڈال سکتیں) اور اسے اپنے ایوان میں جگہ دے کر یہ ثابت کر دے کہ لاہور میں مقیم تمام انسانوں اور جانوروں کی نمائندگی کی جا رہی ہے۔۔۔۔۔ بھینسوں سے ہم گدھوں کے میلے تک آتے ہیں جو بھارت میں بڑی دھوم دھام سے لگایا گیا گدھوں سے بات کنواروں تک پہنچتی ہے جن کا ایک میلہ آئرلینڈ میں منعقد کیا گیا یعنی جس ملک میں جس چیز کی بہتات ہوتی ہے اسی کے میلے لگتے ہیں۔ ٹھیک ہے بھارت میں ہماری نسبت گدھوں کی افراط ہوگی لیکن ہم اتنے گئے گزرے بھی نہیں گدھوں کے سلسلے میں بھارت سے کمپیٹ

نہ کر سکیں۔ ویسے بھی گدھوں پر جو زیادتیاں ہوتی ہیں یعنی اپنا سارا بوجھ ان پر لاد دیا، کھانے کو سوائے ڈنڈوں کے کچھ نہ دیا اور کھونٹے سے باندھے رکھا تو اس کا مداوا یہی ہے کہ ہر برس ان کا ایک میلہ لگا کر ان کو خوش رکھا جائے۔ فرض کیجئے اگر گدھے بوجھ اٹھانے سے اور ڈنڈے کھانے سے انکار کر دیں تو آپ ان کا کیا کریں گے؟ مار مار کر ان کو گدھا تو بنا نہیں سکتے کیونکہ وہ تو ہیں ہی گدھے۔ چنانچہ ہمارے ہاں بھی گدھوں کا میلہ ضرور لگنا چاہیئے۔ اس کے انتظامات کسی سرکاری محکمے کے سپرد کئے جا سکتے ہیں جو پہلے تو اس موضوع پر ایک گدھا سیمنار کروائے گا پھر اپنے کسی اہلکار کو غیر ممالک میں گدھا ٹریننگ کے لئے بھجوائے گا اور بالآخر جب میلے کے انتظامات کو آخری شکل دی جا رہی ہوگی تو کوئی ایکسپرٹ یہ سوال اٹھائے گا کہ پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ گدھے کی ڈیفی نیشن کیا ہے۔ یعنی فائل میں کیا لکھا جائے کہ گدھا کس کو کہتے ہیں۔ اس پر مختلف ڈیفی نیشنز سامنے آئیں گی مثلاً۔۔۔۔ گدھا وہی ہوتا ہے جو گدھا ہوتا ہے وہ جو گدھا نہیں ہوتا، وہ نہیں ہوتا۔۔۔۔ گدھا، گدھا دکھائی دیتا ہے۔۔۔۔ گدھا بیوقوف ہوتا ہے۔ گدھے کے کان لمبے ہوتے ہیں۔ وہ اگر کان نیچے کر دے تو موسم کا حال بتایا جا سکتا ہے۔۔۔۔ گدھا تب تک کام نہیں کرتا جب تک اسے ڈنڈے نہ مارے جائیں۔ ہر گدھا اپنے آپ کو گدھا نہیں سمجھتا بلکہ دوسروں کو گدھا سمجھتا ہے۔ اس پر فیصلہ یہ کیا جائے گا کہ فی الحال گدھوں کا میلہ ملتوی کر دیا جائے۔ کیونکہ گدھے کی ان تعریفوں پر یا ڈیفی نیشنز پر معاشرے کے مختلف طبقوں کو شدید اعتراض ہوگا کہ جناب زبان سنبھال کر بات کیجئے آپ تو ذاتیات پر اتر آئے ہیں۔

تم نور جہاں ہو؟

شاہراہ قائداعظم سے جب میں نہر کنارے ہوا تو موڑ پر ایک بزرگ نے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ "وہی" باباجی ہیں اس لئے نظر سڑک پر جمائے سیدھا چلتا گیا۔ اگرچہ یہ حرکت کچھ کچھ مجرمانہ تھی کہ ایک ادھیڑ عمر انسان آپ سے لفٹ کا سوال کرے اور آپ رکے بغیر قریب سے گزر جائیں لیکن میں "ان" باباجی سے چھپتا پھرتا تھا۔

لاہور میں اب لفٹ لینے کا رواج ہے، اور یہ ایک خوشگوار تبدیلی ہے۔ اگر آپ خالی کار یا ویگن میں جا رہے ہیں تو چند مسافروں کو بٹھا لینے میں آپ کا کوئی اضافی خرچہ تو نہیں ہوگا۔ البتہ وہ لوگ رکشوں اور ویگنوں کے پیچھے دھکے کھانے سے بچ جاتے ہیں اور آپ کو ان کی دعائیں بونس میں مل جاتی ہیں۔ آپ اپنی خوش نصیبی میں ان لوگوں کو حصہ دار بنا لیتے ہیں جو بالکل آپ ہی کی طرح کے لوگ ہیں، اور ابھی اتنے خوش نصیب نہیں ہوئے کہ ذاتی سواری خرید سکیں۔ اس کے علاوہ تمام راستوں پر بسوں کے روٹ بھی نہیں ہوتے، اور یہاں پر لفٹ دینے سے خلق خدا کو سکھ دیا جا سکتا ہے۔ یہ رواج آج اتنا مقبول ہو چکا ہے کہ کاریں رکھنے والے حضرات کو بھی لفٹ لیتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ پٹرول کے لئے جیب میں پیسے نہ ہوئے تو اس روز کسی اور کی کار میں بیٹھ کر سفر کر لیا۔ لفٹ لینے والے حضرات بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض تو صرف اپنی من پسند سواری میں سفر کرتے ہیں۔ اگر کوئی موٹر سائیکل والا انہیں دیکھ کر رک گیا تو بے حد ناراض ہوں گے کہ کیا ہم اسی قابل ہیں میاں جاؤ"

اپنا راستہ لو۔ ہم کسی ہونڈا کار میں سفر کریں گے۔ اور بعض مساکین تو سائیکل سواروں کی پیشکش بھی قبول کر لیتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ میں بھی اکثر اوقات رک جاتا ہوں اور سواریاں بٹھا لیتا ہوں۔ لیکن "ان" باباجی سے خائف رہتا ہوں کہ کہیں وہ نہ مل جائیں۔ وہ باباجی پہلی مرتبہ فیصل چوک کے قریب ملے۔ انہوں نے اشارہ دیا، میں رکا۔ اور انہیں بٹھا لیا۔ خاصے ضعیف تھے۔ ہاتھ میں چھڑی اور بڑی بڑی سفید مونچھیں تھیں۔ بیٹھتے ہی کہنے لگے "برخوردار موٹر سائیکل زیادہ تیز نہ چلانا۔"

میں نے عرض کیا "آپ فکر نہ کریں۔ صرف چیونٹیاں پیچھے رہ جائیں گی، باقی ہر شے ہم سے آگے نکل جائے گی۔"

تھوڑی دیر کے بعد بولے "تم جا کہاں رہے ہو؟" میں نے بتایا کہ گلبرگ میں گھر ہے، ادھر جا رہا ہوں۔

ناراض ہو گئے" اور چھڑی کو میری پسلیوں پر بجاتے ہوئے کہنے لگے "لیکن ابھی تو مجھے دوائی خریدنی ہے میو ہسپتال چوک سے؟۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت ہم گورنمنٹ ہاؤس سے آگے جا چکے تھے۔ میں نے کہا "بزرگو! پہلے بتایا ہوتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں بس سٹاپ پر اتار دوں؟"

وہ تو جلال میں آ گئے "بٹھایا کیوں تھا۔ بوڑھے آدمی کو خوار کرتے ہو؟ اتنا نہیں کر سکتے کہ پانچ منٹ کے لئے میو ہسپتال چلے چلو۔" مجبوراً میں نے اپنا رُخ بدلا اور واپس شہر کی طرف آیا اور میو ہسپتال کے پاس انہیں دوائیوں کی دکان کے باہر اتار دیا۔ میرا خیال یہ تھا کہ میں چپکے سے کھسک جاؤں گا کیونکہ میرے ہاں اس شام مہمان آ رہے تھے۔ لیکن دوائی خریدتے ہوئے انہوں نے مجھ پر کڑی نظر رکھی اور بار بار پیچھے دیکھ کر اطمینان کر لیتے کہ میں بھاگ تو نہیں گیا۔ دوائی خریدنے کے بعد ہم ایک مرتبہ پھر شاہراہ قائداعظم پر آ گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ باباجی مجھے پیچھے بیٹھے

ہدایات دیتے رہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھ کر چلاؤ۔ ۔ ۔ ۔ آہستہ چلاؤ، مجھے مارنا ہے۔ ۔ ۔ ۔ سگنل کا خیال رکھو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہاری پچھلی نشست کچھ اتنی آرام دہ نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ کیوں نہیں ہے؟ جیل روڈ پر پہنچ کر یک دم کہنے لگے "کدھر جا رہے ہو؟"

میں نے عرض کیا کہ گلبرگ مارکیٹ کی طرف" تو مجھے گلبرگ لے جا رہے ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے تو ٹاؤن شپ جانا ہے۔"

مختصر یہ کہ میں تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ باباجی کا ڈرائیور بنا رہا۔ اور انہیں ٹاؤن شپ چھوڑ کر آیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسری مرتبہ بھی خیال نہ رہا اور انہیں نہر کے پل پر سے اٹھا لیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ان کی شکل بھول چکا تھا۔ اس لئے پوچھ بیٹھا کہ بزرگو کہاں جانا ہے؟ چہک کر کہنے لگے "بھول گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ ٹاؤن شپ جانا ہے اور کہاں جانا ہے؟ چلو!" اس مرتبہ انہوں نے کرم کیا اور دوائی نہیں خریدی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بعد میں چوکنا ہو گیا۔ لیکن کبھی کبھار پکڑا جاتا۔ ان کی لعن طعن بھی سنتا اور ٹاؤن شپ چھوڑنے بھی جاتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یک دم مجھے خیال آیا کہ نہر کے کنارے کھڑے یہ بزرگ "وہ" والے باباجی نہیں ہیں۔ کوئی اور ہیں۔ چنانچہ میں نے بریک پر پاؤں رکھا اور موٹر سائیکل موڑ کر واپس لے آیا۔ ان کے قریب جا کھڑا ہوا تو نہ انہوں نے لفٹ لی اور نہ مجھے کسی قسم کی لفٹ دی۔ بس منہ اٹھائے شاہراہ قائداعظم کی طرف دیکھتے رہے۔

میں نے پوچھا "بزرگو چلنا ہے؟"

انہوں نے مجھ پر صرف ایک نگاہ ڈالی اور خاموش کھڑے رہے۔ میں نے سوچا موصوف بہرے ہیں اس لئے مزید قریب ہو کر زور سے کہا "بزرگو چلنا ہے؟"

تب بزرگوں نے مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگے "تم نور جہاں ہو؟" موصوف نہ صرف بہرے تھے بلکہ کچھ ڈھیلے بھی تھے" میں نور جہاں کیسے ہو

سکتا ہوں بزرگو؟

وہ مسکرائے "تو پھر جاؤ......... میں تو نور جہاں کی کار کا انتظار کر رہا ہوں .... اخبار میں نہیں پڑھا کہ وہ نیک دل بی بی جہاں کہیں مجھ ایسے بھولے بھٹکے مسافر نظر آئیں" انہیں اپنی کار پر گھر چھوڑ آتی ہے۔"



یہ کیا ہے؟ کتنے کا ہے؟

ان دنوں لاہور آنے والے مسافر جب راے ونڈ یا کالا شاہ کاکو کے قریب پہنچتے ہیں تو انہیں اس شہر کے اوپر گرد و غبار کا ایک بادل سا نظر آتا ہے تب وہ جان جاتے ہیں کہ یہ فورٹریس سٹیڈیم کے پہلو میں ایستادہ صنعتی نمائش میں بھٹکنے والے لاکھوں کے افراد کے پاؤں کی دھول ہے جو کسی ایٹمی دھماکے کے بعد ظہور میں آنے والے مشروم نما بادل کی طرح شہر پر معلق ہے پچھلی شب چند دوستوں کے ہمراہ میں بھی اس کوچہ گرد میں خاک چھاننے کو داخل ہوا۔

نمائش کے دروازے پر "خوراکوں" کے شال اور تنبو تنا تیں نصب تھیں، مرغ چھولے، مرغ حلیم، مرغ روسٹ اور مرغ بریانی کو اہلِ لاہور اپنے شکموں میں اس بیدردی سے اتار رہے تھے جیسے آج کی شام کے بعد مرغ کی نسل ختم ہونے والی ہے۔ یہاں روایتی خوش دلی کے ساتھ ساتھ روایتی خوش خوراکی کا بھی مظاہرہ ہو رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہر مرغ کے ہمراہ اتنے ہی وزن کی مکھیاں بھی زندہ دلوں کے پیٹوں میں اتر رہی تھیں لیکن زندگی تو زندہ دلی کا نام ہے، اندر داخل ہوتے ہی پانچ سجے سجائے ہاتھ روم نظر آئے۔ نظامی صاحب جو ایک مقامی کالج میں لیکچرر ہیں اور جنہیں نامعلوم وجوہات کی بنا پر "گرو" کہا جاتا ہے اپنے مخصوص جھلی انداز میں بولے "یہ کیا ہے، نہانے کا کمرہ ہے؟ کتنے کا ہے؟" وہاں سے جواب ملا "تیس ہزار کا" میں نے کہا "یہ تو بہت سستا ہے..... کیا ٹائلیں ہیں، کیا نفاست ہے، جی چاہتا ہے انسان ساری عمر نہاتا ہی رہے"..... پھر ترکیبوں کا ایک

سٹال تھا جس میں ہم دلچسپی نہیں رکھتے تھے چنانچہ آگے بڑھ گئے۔ ایک جگہ بجلی کی بریکٹیں اور فانوس روشن تھے۔ "واہ واہ کیا عمدہ فانوس ہیں" میں نے کہا مسرور جو دماغ کے اعتبار سے ہوٹل والا اور ذوق کے اعتبار سے دل پھینک ہے کہیں اور دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا "یقیناً نہایت ہی عمدہ فانوس ہیں" نظامی صاحب نے ایک لمبی ڈکار لی اور بولے "یہ کیا ہے؟ بجلی کے بلب ہیں؟ کتنے کے ہیں؟"... وہاں سے جواب آیا" جی پاکستان میں پہلی مرتبہ ہم پیش کر رہے ہیں، ایک فانوس صرف دس ہزار کا"...

"بہت مناسب قیمت ہے۔ واپسی پر میں اپنے باتھ روم کے لئے ایک خرید لوں گا" میں نے کہا اور ہم آگے بڑھ گئے ——!

ہالی وڈ میں ایک ریستوران ہے جس کے فٹ پاتھ پر ان فلمی ستاروں کے پاؤں اور ہاتھوں کے نشان ثبت ہیں جنہوں نے وہاں قدم رنجہ فرمایا۔ صنعتی نمائش کے منتظمین کا بھی یہی ارادہ ہے کہ وہاں جانے والے تمام افراد کے پاؤں کے نشانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا جائے اور اسی نیک مقصد کے لئے انہوں نے تمام راستے کچے رکھے ہیں جن پر آپ دھول اڑاتے ہوئے چلتے ہیں، چنانچہ ہم بھی دھول اڑاتے ہوئے چلتے رہے ایڈن راک کے سٹال سے خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں اور ایک باریش بزرگ نہایت خوش اخلاقی سے گاہکوں کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ ہجوم اتنا تھا کہ نظامی صاحب کہنے لگے "یہ سرخی پوڈر ہے... مفت ہے؟" جواب ملا" نہیں... آپ مال خریدیں ہم آپ کو تحائف دیں گے"...... پرویز نے پوچھا "صرف تحائف نہیں مل سکتے؟" انہوں نے صرف گھورنے پر اکتفا کیا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ مطیع الرحمن جو ایک ہمہ وقت انشورنس سیلز مین ہے نہایت آزردگی سے بولا یار ان لوگوں کو سمجھانا چاہیئے کہ جتنی رقم یہ پاؤڈروں اور گلاسوں پر برباد

کر رہے ہیں اس سے ایک عدد انشورنس پالیسی خریدی جا سکتی ہے اور ان کی ناگہانی وفات کی صورت میں ان کے بال بچے عیش کر سکتے ہیں"... نظامی صاحب مسکرائے "کیا کر سکتے ہیں؟ عیش؟ وہ خود کر رہے ہیں عیش"!

نمائش میں صرف چند سٹال ایسے تھے جنہیں دیکھ کر عام آدمی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوتا تھا۔ ان میں مختلف قسم کی مشینری کے سٹالوں کے علاوہ ہینڈی کرافٹ کے سٹال شامل ہیں۔ سندھ کی اجرکیں، سرحد کا فرنیچر، چولستان کے اونی کھیس اور پنجاب کے ایسے قالین جن کے ڈیزائن لاہور اور ملتان کی تاریخی عمارتوں سے نقل کیے گئے ہیں البتہ سندھ کے سٹال پر ایک ڈائننگ ٹیبل دیکھنے میں آئی اور یہاں بھی نظامی صاحب حسب معمول نہایت بے تکلفی سے کہنے لگے "یہ کیا ہے؟ روٹی ٹکر کھانے کے لیے سامان ہے؟ کتنے کا ہے؟" سیلز مین کہنے لگا "جناب قیمت اوپر لکھی ہوئی ہے۔ انیس ہزار کا ہے" سب نے میری طرف دیکھا کہ اب بتاؤ اور میں نے نہایت آرام سے فیصلہ دے دیا کہ "بھئی اتنی زبردستی نقاشی ہے میز پر انیس ہزار میں سستا ہے"۔

گرمی اور دھول کی وجہ سے ہم ہانپ رہے تھے مگر کوئی بھی اپنی پیاس کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس طرح اسے پانچ عدد ٹھنڈی بوتلوں کا خرچ برداشت کرنا پڑتا۔ تب میر صاحب نے تنگ آ کر تجویز پیش کی کہ یار پیاس کو یوں چھپانا نہیں چاہیئے آؤ اپنی اپنی بوتل پی لیتے ہیں...... بوتلیں پینے کے بعد ہم تھوڑی دیر مزید گھومے اور پھر ہم سب پر وہ کیفیت وارد ہوئی جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایک عدد باتھ روم ضروری ہوتا ہے۔ پوری نمائش گاہ چھان ماری لیکن انتظامات کرنے والوں کے وارے جایئے انہیں اس انسانی ضرورت کے بارے میں خبر ہی نہ تھی، صرف سجے سجائے باتھ روم تھے ۲۵ ہزار والے اور انہیں استعمال کرنا قدرے دشوار تھا چنانچہ ہم اپنی اشد ضرورتوں کے آگے ارادے کے کچے بند باندھے گھومتے رہے۔

ایک مقام پر گھریلو دروازوں کے علاوہ پورا کا پورا باورچی خانہ ایستادہ تھا۔

"یہ کیا ہے ؟ روٹی مکر پکانے والی جگہ ہے ؟ کتنے کی ہے ؟..... مطیع الرحمن تنگ آکر بولا "نظامی صاحب آپ نے کچھ لینا تو ہے نہیں خوامخواہ قیمتیں پوچھ رہے ہیں" "نظامی صاحب اطمینان سے کہنے لگے "تو کیا حرج ہے ؟ انہوں نے نمائش کس لیے لگائی ہے..... ہاں بھئی کتنے کا ہے یہ باورچی خانے کا سامان ؟ معلوم ہوا کہ صرف پچیس ہزار کا ہے اس پر بھی میرا یہی ردعمل تھا کہ یار دو پلائی ووڈ اور فارمیکا کا بنا ہوا یہ کچن تمام گھروں کے لئے بہت ضروری ہے۔ ہمارے ہاں جو باورچی خانے ہوتے ہیں ان میں دال چاول، مکی کی روٹی اور گوبھی گوشت تو پک سکتے ہیں لیکن سٹیک چاپ سوئی اور فرنچ فرائی تو نہیں پک سکتے، چنانچہ تہذیب یافتہ خوراک پکانے کے لئے یہ کچن بہت ضروری ہے اور ۲۵ ہزار میں کوڑیوں کے مول ہے"..... رات بھیگنے لگی تو ہمیں اپنے کچن اور خاص طور پر باتھ روم یاد آئے اور ہم واپسی کے لئے پر تولنے لگے..... باہر آتے ہوئے ایک قالین دیکھا جو بیس ہزار کا تھا اور جونہی میں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ بھی سستا ہے تو تمام حضرات مجھ پر برس پڑے "ٹھیک ہے تمہارے پاس ڈھیروں دولت ہے، نوٹ ہی نوٹ ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ تم ہمیں متاثر کرنے کے لئے ہر شے کو سستی قرار دیتے رہو"..... اس پر میں نے اپنی جیب ٹٹولی اور پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال کر ہوا میں لہرایا "حضرات دراصل آج شام جب میں نمائش پر آنے کے لئے گھر سے نکلا تو میری بیوی نے مجھے یہ خطیر رقم اس لئے عطا کی تھی کہ میں یہاں سے گھریلو ضرورت کے لئے کوئی مناسب چیز خرید لوں۔ اب پچاس اور پچیس ہزار میں بہت فرق ہے چنانچہ جو شے میں کبھی خرید ہی نہیں سکتا وہ تو میرے لئے سستی ہو گی مجھے اس کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہو گی"

نظامی صاحب سوچ میں ڈوب گئے اور پھر خاصی دیر کے بعد سر اٹھا کر کہنے لگے

"یہ سب کیا ہے ؟

نمائش...... نمائش کا مطلب ہے دکھاوے کی چیز ہم سب نے اسے دیکھ لیا، آؤ اب گھر چلیں"....

میں واپس گھر آیا تو میرے پاس نمائش سے حاصل کردہ وہ دھول تھی جو میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔

مینڈک خوری اور بیگ صاحب

میرے ایک عزیز دوست ہیں جنہیں ہم پوشیدہ رکھنے کے لئے بیگ صاحب کہہ سکتے ہیں۔ بیگ صاحب فلسفہ کے آدمی ہیں اور دیگر علوم کو محض فضولیات سمجھتے ہیں شکل سے فلسفی کی بجائے لائٹ مڈل ویٹ باکسر دکھائی دیتے ہیں اور ماشاء اللہ خوش خوراکی میں اپنی مثال آپ ہیں ملازمت کے سلسلہ میں روزانہ لاہور آتے ہیں اور اشیائے خوردنی سے لدے پھندے اپنے قصبہ کو لوٹ جاتے ہیں لاہور میں مرغ کس کا خستہ ہوتا ہے۔ گوشت کون اچھا بناتا ہے کباب کون سی گلی میں ایسے ملتے ہیں کہ منہ میں رکھتے ہی گھل جائیں اور کس حلوائی کی رس ملائی میں رس بھی ہوتا ہے اور ملائی بھی؛ یہ سب آپ بیگ صاحب سے پوچھئے ان کی زندگی کی دو ہی خوشیاں ہیں فلسفے کی کتاب اور مزیدار خوراک۔

ایک روز میرے پاس تشریف رکھتے تھے کہ ایک اور جاننے والے آئے بیگ صاحب کو دیکھ کر چونکے قدرے خوفزدہ ہوئے اور "ابھی آیا" کہہ کر غائب ہو گئے دو تین ماہ بعد ان غائب ہو جانے والے حضرت سے مال روڈ پر ملاقات ہو گئی میں نے شکایت کی کہ آپ پہلے تو آتے جاتے رہتے تھے اب اتنے دنوں سے کیوں غائب ہیں۔

کہنے لگے وہ بیگ صاحب آپ کے دوست ہیں؟ میں نے کہا ہاں بہت ہی قریبی دوست۔

وہ بولے بس میں ان سے خوفزدہ ہوں اس لئے آپ کی طرف نہیں آیا۔

بیگ صاحب اپنے دوستوں میں ایک اور خصوصیت کی بنا پر جانے جاتے ہیں اور وہ ہے ان کی پیش گوئی کی صلاحیت اور پیش گوئی بھی ہمیشہ سبز قدم ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کسی ہوٹل والے نے ان کی بریانی میں مرغ کی مناسب بوٹی نہیں ڈالی تو سمجھ لیجئے کہ اس کی دکان کی خیر نہیں اگر کسی شخص کی صحت کے بارے میں تشویش کا اظہار کریں تو چند دنوں بعد اس کی فوتیدگی کی خبر آجائے گی بہرحال میں نے ان خوفزدہ صاحب کو تسلی دی کہ بیگ صاحب دوستوں کا خیال رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں کبھی کوئی الٹی سیدھی پیش گوئی نہیں کرتے وہ صاحب حیران ہو کر کہنے لگے جناب تارڑ صاحب آپ کو بالکل نہیں پتہ کہ بیگ صاحب دراصل کیا ہیں؟

میں نے پوچھا کیا ہیں؟

انہوں نے ادھر اُدھر دیکھ کر میرے کان میں آہستہ سے کہا وہ مینڈک کھاتے ہیں.....

میں اچھل پڑا مینڈک! آپ یقیناً مذاق کرتے ہیں بیگ صاحب یقیناً خوش خوراک ہیں لیکن مینڈک؛ لاحول ولا.... نہیں صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

وہ صاحب مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہنے لگے بیگ صاحب اور میں ایک ہی قصبے کے رہنے والے ہیں اور تمام اہالیان قصبہ جانتے ہیں کہ وہ مینڈک خور ہیں اس روز آپ کے ہاں انہیں دیکھ کر میں بھی سوچ میں پڑ گیا تھا تارڑ صاحب کہیں آپ بھی تو شوق نہیں کرتے؟

میں نے ایک مرتبہ پھر لاحول پڑھی اور انہیں یقین دلایا کہ میں نے زندگی میں بہت سارے شوق پورے کیے ہیں لیکن مینڈک خوری سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگلی مرتبہ جب بیگ صاحب میرے ہاں تشریف لائے تو مجھے وہ کچھ بدلے

بدلے دکھائی دے رہے تھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی جیب میں سے دوست مینڈک کی ایک ٹانگ نکالیں گے اور چٹخارے لے کر کھانے لگیں گے تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے بھوک لگی ہے کچھ کھانے کے لئے منگایئے۔

میں نے کہا کیا کھائیں گے؟ کباب پکوڑے یا میں ۔۔۔۔ میں مینڈک کہتے کہتے رک گیا بیگ صاحب فلسفے کے ساتھ ساتھ علم نفسیات کو بھی کھنگالتے ہیں تاڑ گئے کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے کھانس کر پوچھنے لگے آج آپ کچھ اکھڑے اکھڑے نظر آرہے ہیں کیا بات ہے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا بیگ صاحب آپ مینڈک کھاتے ہیں؟

بیگ صاحب میرا سوال سن کر بے حد رنجیدہ ہوئے کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے اور پھر انتہائی گلوگیر آواز میں کہنے لگے آپ کو بھی معلوم ہو گیا!

"تو آپ کھاتے ہیں؟" میں گھبرا گیا۔

تب بیگ صاحب نے اپنی مینڈک خوری کا جو قصہ بیان کیا، وہ کچھ یوں ہے۔۔۔۔۔۔"ہم سکول میں پڑھتے تھے اور اس عمر میں انسان کو جو شرارتیں کرنی چاہئیں وہ کرتے تھے، جتنی مار کھانی چاہیئے وہ بھی کھاتے تھے۔ مار کے علاوہ ویسے بھی کھانے پینے کا شوق تھا۔ چھٹی کا دن تھا۔ میں نے اپنے جگری دوست عارف وقار سے کہا یار آج تو مرغ کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ عارف نے میری بات سنی اور چٹکی بجا کر غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد نمودار ہوا تو اس کی بغل میں ایک صحت مند لیکن قدرے پریشان مرغ تھا۔ میں نے پوچھا، کہاں سے لائے ہو؟ کہنے لگا بس آوارہ گھوم رہا تھا میں نے ادھر اُدھر دیکھ کر آہستہ آہستہ آوازیں دیں کہ بھئی کس کا ہے؟ کس کا ہے؟ جب کوئی جواب نہ ملا تو میں اٹھا لایا۔ میں نے کہا، چوری کر کے لائے ہو کہنے لگا، نہیں کسی کے گھر سے تھوڑا لایا ہوں، گلی میں لاوارث گھوم رہا تھا۔۔۔۔

چنانچہ ہم نے ایک توے اور نمک مرچ کا انتظام کیا اور قصبے سے کچھ دور درختوں کے ایک جھنڈ میں چلے گئے لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی اور مرغ حلال کر کے توے پر رکھ دیا۔۔۔۔۔ ہم اپنے تئیں اس کی بوٹیاں روسٹ کر رہے تھے کہ ہمارا ایک محلے دار چاچا محکم دین اُدھر آنکلا، اسے دیکھ کر عارف کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں محکم دین نے دور سے ہی پوچھا، اوئے کہیں میرا مرغ دیکھا ہے؟ اس نے قریب آکر توے پر روسٹ ہوتے گوشت کو سونگھا اور غصے سے بولا، یہ کیا ہے؟ عارف نے سنبھلتے ہوئے کہا، چاچا اب تم نے دیکھ ہی لیا ہے تو تم سے کیا چھپانا ہم دراصل مینڈک کھانے کے بے حد شوقین ہیں اسی لئے یہاں درختوں میں چھپ کر مینڈک بھون رہے ہیں، قسم سے بڑے مزیدار ہوتے ہیں، کھاؤ گے؟۔۔۔۔ یہ سن کر چاچا محکم دین ابکائیاں لیتا ہوا قصبے کی جانب بھاگ گیا۔۔۔۔ بعد میں پورے قصبے میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ بیگ اور عارف مینڈک کھاتے ہیں۔ ہم یہ تو کہہ نہیں سکتے تھے کہ اس روز ہم چوری کا مرغ روسٹ کر رہے تھے اس لئے خاموش ہو گئے اور آج تک ہمیں مینڈک خوری کا طعنہ دیا جاتا ہے"۔

بیگ صاحب کی مینڈک خوری کی داستان یوں یاد آ گئیں کہ انہی دنوں پاکستانی مینڈک فرانس برآمد کیے جا رہے ہیں اور ایک مرتبہ پھر بیگ صاحب کے قصبے میں یہ خبر مشہور ہو گئی ہے کہ دراصل بیگ صاحب ہی ان مینڈکوں کو ایکسپورٹ کر رہے ہیں۔

بکرا بخار

عیدسے تقریباً دو ہفتے پیشتر یہ سلسلہ شروع ہوا تھا کہ جونہی میں شہر آنے کے لئے گھر سے باہر قدم رکھتا بچہ لوگ پیچھے سے نعرہ لگاتے کہ "ابو بکرا" میرے بچے ماشاء اللہ بے حد سمجھدار اور ماں باپ کی عزت کرنے والے ہیں اس لئے جب وہ "ابو بکرا" کا نعرہ بلند کرتے تھے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ خدانخواستہ ابو جو ہیں وہ بکرا ہیں بلکہ وہ تو مختصراً یہ کہنا چاہتے تھے کہ ابو ایک عدد بکرا خرید لایئے گا چنانچہ ایک روز ابو نے اپنے تئیں خاصی بھاری رقم جیب میں ڈال کر ان مقامات کا رخ کیا، جہاں ان دنوں ڈرائیو ان قسم کی بکر منڈیاں وجود میں آ چکی تھیں بیشتر بکروں کی صحت کا معیار خاصا رقت انگیز تھا۔ بعضے اتنے ناتواں اور مختصر تھے کہ اگر بھونکتے تو یقیناً کتے ہوتے۔ بہر حال ان کی توانائی دیکھ کر مجھے توانائی حاصل ہوئی کیونکہ میری جیب میں اتنی رقم تھی جس سے میں اس قسم کے تین چار "بھیڈو" بآسانی خرید سکتا تھا چنانچہ میں نے ان میں سے ایک بکرا فروش کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کر دیا جس کے گلے میں چھ بکرے تھے۔ قیمت دریافت کی تو وہ بھلا مانس عاجزی سے بولا، صاحب جو مرضی میں آئے دے دیں۔ میں نے کہا کہ بھائی میرے آپ قیمت بتائیں گے تو میں فیصلہ کر سکوں گا کہ مجھے کتنے بکرے خریدنے ہیں کہنے لگا، صاحب جی دو ہزار دے دیجئے گا۔ میں نے کہا کہ نہیں بھائی میں چھ بکروں کا کیا کروں گا، زیادہ سے زیادہ دو خرید لوں گا۔ اس پر اس بھلے مانس کی تمام تر عاجزی

کافور ہوئی اور اس کی جگہ خشونت نے لے لی۔ اور انتہائی درشتگی سے بولا صاحب جی گندم خریدنے آئے ہو یا بکرے.... دو ہزار ایک بکرے کی قیمت ہے۔"

میں نے جانا کہ یہ بندۂ خدا فاتر العقل ہے کہ ایک حالیہ سروے کے مطابق پاکستان کی تقریباً دس فیصد آبادی ذہنی امراض کا شکار ہے یعنی عام لفظوں میں پاگل ہے اس لئے ایک اور بکرا فروش سے رجوع کیا۔ وہ بے چارہ بھی اسی دس فیصد آبادی کا ایک فرد نکلا اس کے بعد ایک اور بکرا فروش سے رجوع کیا...... اور شام تک "رجوع" ہی کرتا رہا اور بالآخر یہ عقدہ کھلا کہ تمام بکرا فروش حضرات بالکل نارمل اور صحیح العقل ہیں اور صرف میں اس دس فیصدی آبادی کا ایک فرد ہوں جو پاگل ہے چنانچہ شام کو ہم بے بکرا بے مراد گھر واپس آگئے.... میری طرح اور لوگ بھی اپنی جیب میں "بھاری رقوم" ڈال کر ان بکر منڈیوں میں سرگرداں تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کو جب ایک بکرے کی قیمت تین ہزار بتائی گئی تو کہنے لگے، کیوں اس میں موٹر لگی ہوئی ہے؟ چونکہ بکرا فروش اس قسم کے فقرے کھانے کا عادی تھا اس لئے فوراً بولا، "وہ برانڈرتھ روڈ سے لگوا لیجئے گا، پونے چار سو روپے کی۔" ان صاحب نے پھر پوچھا کہ اچھا بھائی جان یہ تین ہزار کا جو بکرا ہے تو کیا صرف اس عید پہ کام آئے گا یا اسے اگلے برس بھی ذبح کیا جا سکتا ہے؟ جواب ملا کہ اگلی عید پہ بھی کام آجائے گا اگر اس عید پر آپ اسے ذبح نہ کریں تو، وہ صاحب کچھ اور کہنے کے لئے ابھی پر تول رہے تھے کہ بکرا فروش بولا، صاحب جی گھوم پھر کے تماشہ دیکھو جاؤ اللہ بھلا کرے۔

بکرا خریدنے سے ہی آپ کی آزمائش ختم نہیں ہوتی۔ عید کے روز عمران خان سے ہاتھ ملانا یا روحی بانو کو ہیپی عید مبارک کہنا زیادہ آسان ہے اور قصائی کا حصول زیادہ مشکل، پچھلے عید پر میں نے قصائیوں کے ناز نخرے برداشت کرنے کی بجائے اپنے ایک ماماجی کی مدد سے خود ہی بکرا ذبح کر ڈالا۔ اگرچہ سنا ہے کہ درست محاورہ بکرا کاٹنا

ہے لیکن اس طرح یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کسی تلوار سے بکرے کا جھٹکا کر رہے
ہوں)، یہاں تک تو کام آسان تھا لیکن جب اسے کُنڈے سے لٹکا کر کھال اتارنے
کی کوشش کی تو پسینے آ گئے، یہاں تک کہ تمام بچہ لوگ کو بھی اس کام میں مدد
دینے کے لئے اکٹھا کر لیا گیا۔ اب تقریباً پورا خاندان کھال کے ساتھ لٹکا ہوا ہے
اور کھال ہے کہ اترتی ہی نہیں۔ تھک ہار کر پھر قصائی کو بلایا گیا جس نے پہلے
سے بھی زیادہ رقم کا مطالبہ کیا کیونکہ بقول اس کے ہم نے بکرے کا ناس مار دیا تھا۔ البتہ
ہمارے ایک عزیز اس کام میں بہت ماہر ہیں۔ وہ لیبیا سے واپسی پر جانوروں کو
حلال کرنے اور ان کے ٹکڑے کرنے کے لئے چھریوں اور کلہاڑیوں کا ایک پورا
سیٹ خرید لائے تھے اس سیٹ میں تقریباً پچاس سے زائد مختلف سائزوں کی
چھریاں اور کلہاڑیاں شامل ہیں۔ چنانچہ وہ بکرا ذبح کرنے سے پہلے اس "اسلحے" کی
باقاعدہ نمائش کرتے ہیں اور پھر گردن پر چھری رکھتے ہیں شنید ہے کہ اس نمائش
کی وجہ سے ان کے محلے میں آج تک کوئی چوری نہیں ہوئی۔ کوئی بھی چور بکرا بننا
پسند نہیں کرتا۔

بہرحال قصائی تو بکرے سے بعد کی بات ہے فی الحال تو یہ ہے کہ روزانہ
"ابو بکرا" کے نعرے سننے پڑتے ہیں اور حالات بے حد تشویشناک ہیں۔ کوشش تو یہی ہے
کہ جونہی یہ "بکرا بخار" اترے تو ہم مناسب قیمت کا کسی بھی سائز کا (صرف اس کی
گردن نظر آنی چاہیئے) ایک عدد بکرا خرید لیں ورنہ ہم الف نے ابو کے ساتھ ساتھ
بے سے بکرا ہو جائیں گے میں تمام بکروں ..... میرا مطلب ہے ابوؤں کی جانب
سے آپ سب کو عید مبارک کہتا ہوں۔ با آ۔ با آ۔ با آ۔

لاہور کے شہری کیا کھاتے ہیں؟

میں جب بھی کسی شادی میں شمولیت کی خاطر گھر سے نکلتا ہوں تو گھر والی
سے یہ کہہ کر نکلتا ہوں کہ نیک بخت آج کھانے میں جو کچھ بچے گا وہ وفادار جانور کو
کھلانے کی بجائے اپنے وفا شعار خاوند کے لئے سنبھال رکھنا، ہو سکتا ہے، بھوکے
پیٹ واپسی ہو، کیونکہ شادی کی اکثر دعوتوں میں جو دھما چوکڑی مچتی ہے اور جس
طرح "شرفا" زورِ بازو سے اپنی پلیٹوں پر مرغوں اور چاولوں کے اہرام تعمیر کر کے
شوربے کے چھینٹے اڑاتے ہیں وہاں ہم جیسے غیر شرفا دامن بچاتے رہتے ہیں اور ہاتھ
میں فقیروں کی طرح پلیٹ پکڑے کھڑے رہتے ہیں، اور بالآخر کھیر کھا کر گھر لوٹ جاتے
اور پھر چپکے چپکے باورچی خانے میں گھس کر بچی کھچی خوراک کی تلاش میں ہنڈیاں دیگچے
کھڑکاتے ہیں، تو خاتون خانہ آنکھیں ملتی ہوئی نمودار ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ
کھانے کے لئے تو کچھ نہیں بڑا شوق ہے شادیوں میں جانے کا۔ میں پوچھتی ہوں،
ساری دنیا وہاں جاتی ہے، کھانا کھاتی ہے، سیون اپ پیتی ہے، اور تم بدھوؤں
کی طرح ایک طرف کھڑے رہتے ہو۔ ڈبل روٹی پر مکھن لگا دوں؟ شادی کی دعوتوں
سے نامراد لوٹنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ جب سے "کھڑے کھانے" کا رواج
ہوا ہے، یعنی کھڑے ہو کر کھانے کا رواج ہوا ہے میں کوئی ناتواں قسم کی بوٹی حاصل
کرنے میں کامیاب ہو بھی جاؤں تو بھی اسے مکمل طور پر کھا نہیں سکتا کیونکہ کھانے
کے لئے بوٹی کا حلق تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے اور اسے وہاں تک پہنچانے کے

لئے بندے کی حالت کچھ یوں ہوتی ہے کہ ایک ہاتھ میں پلیٹ کو چینی بازی گروں
کی طرح معلق کیا ہوتا ہے، دوسرے ہاتھ میں چمچہ یا کانٹا۔ اب اس حالت میں
آپ چاول تو کسی نہ کسی طرح چمچے پر سمیٹ کر حلق میں اتار لیتے ہیں، لیکن جب
بوٹی کی باری آتی ہے تو وہ چمچے کے نیچے سے بدکنے لگتی ہے بلکہ پھسلنے لگتی ہے۔
آپ کو ان دھکوں کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے جو بارات میں شریف شرفا کی تلاش مرغ
کے دوران پڑتے رہتے ہیں، پلیٹ کو بدستور ہتھیلی پر جمائے رکھنا ہوتا ہے
اور چمچے کے ساتھ ہڈی سے گوشت الگ کرنا بھی ہوتا ہے۔ اب آپ کسی سکھ
کی طرح اس بوٹی کے پیچھے چمچہ لگا دیتے ہیں تاکہ وہ بالآخر "حف" جائے اور آپ
اسے یوں تھکا کر قابو کر لیں۔ میں ایسے موقعوں پر کسی میز یا کرسی کا سہارا ڈھونڈنے
کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن توبہ کریں، بھلا ماڈرن دعوتوں میں میز کرسی کہاں سے
آئے گی چنانچہ آپ صرف چاول کھا کر لوٹ آتے ہیں۔

پچھلے دنوں ایک گرینڈ قسم کی شادی میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ یہاں خوراک
تو گرینڈ قسم کی تھی لیکن آداب خوراک وہی تھے جو ہمارے گلی محلے کی شادیوں میں ہوا
کرتے ہیں۔ چونکہ اس شادی میں آنے سے پیشتر بیگم نے وارننگ دے رکھی تھی کہ اگر
وہاں جانا ہے تو کچھ کھا کر آنا واپسی میں گھر میں کچھ نہیں ملے گا۔ چنانچہ میں نے نشست گاہ
میں داخل ہوتے ہی ایک ایکسپرٹ کھانے والے کی طرح ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا
جس کے عین سامنے اس دروازے کو کھلنا تھا جس کے پیچھے میں نے پھر کہا "شاہ"

وہ اسی طرح جھکے رہے اور بڑبڑائے "ہاں؟"

"اوئے اصغر ندیم شاہ تو بولتا کیوں نہیں" میں نے تنگ آ کر کہا۔

اس پر سید بادشاہ چونکے اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے۔

"کھاؤ کھاؤ"

میں نے کہا "کیسے کھاؤں اور کیا کھاؤں؟"

شاہ جی کہنے لگے "بٹیرے"

"بٹیرے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا "وہ بھی ہیں؟"

"یہ جو تمہاری پلیٹ میں پڑا ایک روسٹ پرندہ سوکھ رہا ہے یہ بٹیرہ ہی
تو ہے"

"اچھا میں بھی کہوں یہ مرغ اتنا منحنی سا کیوں ہے۔ شاید شاعر ہے اس لئے؟"

"شاعر منحنی ہوتے ہیں" شاہ صاحب غصے میں آگئے "کیا میں شاعر نہیں ہوں؟"

اب میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اصغر ندیم شاہ بہت اچھا
شاعر ہے۔ لیکن اس کے باوجود تن و توش مناسب رکھتا ہے۔ اس دوران شاہ جی
پھر غائب ہوئے اور فوراً ہی نمودار ہو گئے۔ ان کی پلیٹ میں بٹیرے ہی بٹیرے تھے
یوں لگتا تھا جیسے وہ جال پھینک کر انہیں پکڑ لائے ہیں۔ انہوں نے چند بٹیرے
میری پلیٹ میں لڑھکا دیئے "کھاؤ"

میں نے حسب معمول ان بٹیروں کے پیچھے اپنا چمچہ لگانے کی کوشش کی تو
شاہ جی نے وہ آلہ خوراک میرے ہاتھ سے چھین لیا اور کہنے لگے "تارڑ ہو کر چمچہ
استعمال کرتے ہو۔ بھائی جان بٹیرے ہاتھ سے کھائے جاتے ہیں" اور انہوں
نے عملی مظاہرے کے طور پر ایک بٹیرے کو قابو کیا منہ میں ڈالا اور چبا گئے۔ میں
نے کہا "شاہ جی یہ ہڈیاں اس کی کچھ گڑبڑ نہیں کریں گی پیٹ میں؟"

شاہ جی زیر مونچھ مسکرائے اور کہنے لگے "سائیں شاید آپ نے کبھی بٹیرے
نہیں کھائے، انہیں ہڈیوں سمیت کھایا جاتا ہے؟"

میں نے شاہ جی کے مشورہ پر عمل کیا اور جوں توں کر کے ایک چھوٹا سا بٹیر

منہ میں ڈال لیا۔ اب میں نے اسے منہ میں تو ڈال لیا لیکن چونکہ منہ میں مکمل طور پر بٹیرہ داخل ہو چکا تھا اس لئے اسے چبا نہ سکا۔ بہت کوشش کی مگر کچھ نہ ہوا تھوڑی دیر بعد شاہ جی پھر میری طرف آئے اور کہنے لگے "کیا منہ کھولے کھڑے ہو کھاتے کیوں نہیں!"

میں نے اشارے سے بتایا کہ جناب کھا ہی نہیں سکتا۔ جبڑا بٹیرے سے مقفل ہو چکا ہے۔ تب انہوں نے میرے گالوں کو ہلکے ہلکے تھپکا اور تھوڑی سی جگہ پیدا کی اور میں نے بمشکل منہ چلا کر اس عظیم بٹیر کو نوش کر لیا۔ اگلے دو روز مجھے یہی احساس ہوتا رہا کہ وہ بٹیر میرے پیٹ میں پھڑ پھڑا رہا ہے۔

پلیٹوں کے کھڑکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جونہی "حضرات کھانے کے لئے تشریف لائیے" کا بگل بجا میں ایک ندیدے بچے کی طرح لوگوں کو دھکے دیتا کرسیاں پھلانگتا طعام گاہ کے اندر جا پہنچا اور ایک پلیٹ اور چمچہ قابو کر کے خوراک کے ڈھیروں کی جانب لپکا۔ اب چونکہ شادی گرینڈ قسم کی تھی اس لئے خوراک بھی ذرا مختلف تھی۔ اور کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ جو ڈش ہے یہ دال کی ہے یا کوئی غیر ملکی طرز کی سویٹ ہے۔ بہر حال میں نے بھی جلدی جلدی اپنی پلیٹ پر ایک چھوٹا موٹا اہرام تعمیر کر لیا۔ اتنی دیر میں بقیہ پبلک بھی پہنچ گئی اور مجھے وہ مقام چھوڑنا پڑا۔ چاول کھانے کے بعد میں نے اس چھوٹے سے مرغ کی طرف دھیان کیا جو میں لوٹ کر لایا تھا۔ بہر حال میں اس کے ایک دو ٹکڑے علیحدہ کر کے کھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دوران کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب اپنی پلیٹ پر اس سنجیدگی اور دانش ورانہ انداز میں جھکے ہوئے ہیں جیسے ٹیلی ویژن کا کوئی سکرپٹ لکھ رہے ہوں۔ کافی دیر بعد انہوں نے سر اٹھایا۔ اس سے پیشتر کہ میں ان سے بات کرتا، وہ غائب ہوئے اور چند سیکنڈوں میں واپس آ کر پھر پلیٹ پر جھک گئے جو اس مرتبہ پھر بھری ہوئی تھی۔ میں نے ان کے

کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "شاہ جی!"

"ہاں جی" وہ پلیٹ سے مخاطب ہو کر بولے۔

آج کے کالم میں خوراک کے تذکرے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پچھلوں دنوں اخبار میں ایک خبر تھی کہ پتہ نہیں کونسا محکمہ ایک سروے کر رہا ہے کہ لاہور کے شہری کیا کھاتے ہیں۔ اس سروے کے بعد پتہ نہیں کیا ہو گا تب میں نے سوچا کہ ابھی وہ محکمہ اس منصوبے کی فائل بنائے گا۔ پھر ٹیموں کا انتخاب ہو گا۔ پھر یہ ٹیمیں لاہور شہر میں گھوم پھر کر سروے کریں گی۔ پھر سروے رپورٹ تیار کی جائے گی، تو کیوں نہ اس محکمے کی مشکل آسان کر دی جائے۔ اور میں ہی ایک مختصر سا سروے کر لوں کہ لاہور کے شہری کیا کھاتے ہیں۔ باراتوں میں لاہور کے شہری کیا کھاتے ہیں اور کیسے کھاتے ہیں۔ اس کی تفصیل تو میں نے عرض کر دی سب سے پہلے میں نے اس سلسلے میں پپی پانفروش سے رابطہ قائم کیا اور پوچھا کہ بھئی لاہور کے شہری کیا کھاتے ہیں؟ پپی نے فوراً کہا "لاہور کے شہری جناب عالی! پان کھاتے ہیں"

"اس کے علاوہ؟"

"اس کے علاوہ کتھا کھاتے ہیں"

"بس اور کچھ نہیں کھاتے؟"

"جناب عالی! میرے پاس تو بس پان کھانے ہی آتے ہیں یا پھر منت کی لاچیاں"

"لیکن پپی! تم خود کیا کھاتے ہو؟"

"میں جی؟ کبھی نان چھولے، کبھی پکوڑے"

"یعنی تمہیں معلوم ہی نہیں کہ بہتر صحت کے لئے متوازن غذا کیا ہوتی ہے پروٹین کسے کہتے ہیں اور دودھ انڈہ سلاد سبزیاں چینی کھانے وغیرہ"

پچی نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا" میں تو جی نان چھولے ہی کھاتا ہوں"

اتنی دیر میں بابا پہلوان پان کھانے آگیا اور اس سے بھی میں نے یہی سوال کیا کہ آپ کیا کھاتے ہیں؟

بابا پہلوان نے ایک زوردار ڈکار مارا اور کہنے لگا" باؤجی لوگ جو بھی کھلادیں کھا لیتے ہیں۔ پٹھورے، دہی بھلے، نہاری ......"

میں نے کہا" بابا! ...... وہ باداموں والے شربت، کھوئے کی لسی اور کچا دودھ وغیرہ کیا ہوئے؟

" بزرگ کھاتے تھے باؤجی۔ اب تو ہم پٹھورے وغیرہ کھا کر گزارہ کرتے ہیں"

تب میں میکلوڈ روڈ کی جانب گیا جہاں لاہور کے شہری "تکہ کباب، مرغ چھولے، مرغ روسٹ، چانپیں اور گردے کلیجی کھانے میں مشغول تھے۔ لیکن یہاں پر معلوم ہوا کہ یہ لاہور کے شہری نہیں ہیں بلکہ مختلف محکموں کے افسر اور ٹھیکیدار وغیرہ ہیں کیونکہ عام شہری ان خوراکوں کو افورڈ نہیں کر سکتے۔

ایک جدید خاتون سے پوچھا کہ آپ محترمہ کیا کھاتی ہیں؟ انہوں نے ناک سکیڑ کر کہا" میں کچھ نہیں کھاتی ...... میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں"

میں سارا دن ان کوائف کو جمع کرنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ تب میں نے بھولے ریڑھی والے کو بلایا اور کہا" یار بھولے! تو پھلوں کی ریڑھی لگاتا ہے تو ہی بتادے کہ لاہور کے شہری کیا کھاتے ہیں؟" بھولے نے ناک پونچھ کر کہا" باؤجی! کچھ لوگ تو پھل فروٹ کھاتے ہیں اور جن کی جیب میں مال ہے وہ تلی ہوئی مچھلی اور مرغے کھاتے ہیں"

میں نے کہا" اور باقی لوگ کیا کھاتے ہیں؟

" باقی لوگ باؤجی! ...... وہ سب کھیہہ کھاتے ہیں"

"کھیہہ؟ یعنی مٹی یا دھول؟"

" نہیں باؤجی! مٹی اور دھول اور چیز ہوتی ہے۔ کھیہہ اور چیز ہوتی ہے۔ اس میں مٹی اور دھول بھی ہے۔ کوڑے کے ڈھیروں کی بو بھی ہے۔ اور گھوڑوں کی لید بھی ہے۔ لاہور کے شہری زیادہ تر یہی کھاتے ہیں"

مجھے امید ہے کہ" لاہور کے شہری کیا کھاتے ہیں" کا سروے کرنے والا محکمہ ان حقائق کو مدنظر رکھے گا اور اس کا کام آسان ہو جائے گا۔ یعنی لاہور کے شہری شادیوں میں مرغ اور بٹیر کھاتے ہیں اور عام زندگی میں عام طور پر صرف" کھیہہ" کھاتے ہیں۔

انجمن کیلا فروشاں کی حلف برداری

پچھلے دنوں مجھے ایک عجیب و غریب محفل میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔۔۔۔اور آج بھولے نے کہا کہ جی ہماری دستار واپس کر دو۔

دراصل ہوا یہ کہ بھولا جو گوالمنڈی بازار میں ریڑھی لگا کر پھل فروٹ بیچتا ہے، میرے پاس آیا۔۔۔۔ وہ روزانہ میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے "باؤجی لے لو۔۔۔۔ آج سستے ہیں۔۔۔۔۔ باؤجی آج میں نے کیلے لگائے ہیں۔ دو درجن بھیج دوں۔۔۔۔۔ سیب بڑے سرخ لایا ہوں منڈی سے۔۔۔" اور میں اس روز کی اپنی مالی پوزیشن کے مطابق کبھی کچھ خرید لیتا ہوں اور اکثر اوقات "بھولے آج نہیں" کہہ کر اسے ٹال دیتا ہوں۔۔۔۔ لیکن اس روز جب بھولا میرے پاس آیا تو کہنے لگا "باؤجی حلف لے لو"۔۔۔۔

میں نے پوچھا "سستے ہیں؟"

کہنے لگا "باؤجی میں پھل فروٹ کی بات نہیں کر رہا۔۔۔۔ حلف کی بات کرتا ہوں"

"حلف؟ میں نے پریشان ہو کر کہا "کس قسم کا حلف؟"

"او جی آپ اخباروں میں نہیں دیکھتے۔۔۔۔ تصویریں چھپتی ہیں کہ فلاں انجمن کے عہدیداروں سے فلاں باؤجی حلف لے رہے ہیں اور ان باؤجی کی دستاربندی ہو رہی ہے۔۔۔۔"

مجھے معلوم نہیں تھا کہ بھولا حالات حاضرہ پر اتنی گہری نظر رکھتا ہے۔ اس قسم کی دو چار تصویریں تقریباً ہر روز اخباروں میں چھپتی تھیں۔ میں نے بھولے سے ذرا وضاحت طلب کی تو کہنے لگا "باؤجی ہم نے ایک "انجمن کیلا فروشاں" بنائی ہے کل اس کی حلف برداری

ہو رہی ہے آپ آؤ اور ہم سے حلف لے لو" یہ شہرت حاصل کرنے کا ایک نادر موقع تھا اور میں اسے ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا چنانچہ فوراً حامی بھر لی۔

اگلے روز میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس تقریب میں شرکت کے لئے پہنچا جو بھولے کے گھر میں منعقد ہو رہی تھی وہاں "انجمن کیلا فروشاں" کے دیگر عہدیدار بھی موجود تھے جنہوں نے مجھے گیندے کے ہار پہنائے اور ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ ان عہدیداروں میں شیدا، باؤ ٹوٹی، مولوی، اچھا وغیرہ شامل تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک لڑکا لڈوؤں کا ایک ڈبہ اٹھائے اندر آیا بھولے نے ڈبہ لیا اور کہا "پیسے باؤجی سے لے لو" خوش قسمتی سے کچھ رقم جیب میں موجود تھی اس لئے ادائیگی کر دی پھر ایک صاحب "دہی بھلے" لے کر آ گئے۔ بھولے نے دہی بھلے تھا کر کے کہا "باؤجی اسے بھی فارغ کر دو" مجھے فوراً اسے بھی فارغ کرنا پڑا۔۔۔۔ پھر باؤ ٹوٹی نے کہا "درجن گجرے کے ہار جو لائے ہیں لوہاری سے تو باؤجی ان کی پے منٹ بھی کر دو۔۔۔۔" اس پر میں نے دبے دبے لفظوں میں احتجاج کیا تو بھولا کہنے لگا "باؤجی یہ تو رواج ہے جی۔۔۔ جو بھی حلف لینے آتا ہے خرچہ اسی کا ہوتا ہے"۔۔۔۔ میں شہرت کی حرص میں پھنس چکا تھا اس لئے ہاروں کے پیسے بھی ادا کر دیئے۔۔۔۔ پھر سب حضرات میرے گرد کھڑے ہو گئے ان کے ہاتھوں میں ایک ایک سادہ ورق تھا۔ ایک ورق انہوں نے مجھے بھی تھما دیا اور کہا "لو جی بسم اللہ کرو، حلف لو" مقامی فوٹوگرافر اپنا کیمرہ تان کر ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"بھولے اس کاغذ پر تو کچھ لکھا ہی نہیں ہوا۔۔۔۔ میں کیا حلف لوں؟"

"بس جی تم لے لو"

"لیکن کیسے لے لوں؟"

"آپ بھی بھولے بادشاہ ہو۔ آپ کاغذ کو دیکھو، اور ہم سب کیمرے کو دیکھتے ہیں

اس طرح حلف لے لو" چنانچہ میں نے اس کی ہدایات پر عمل کیا اور تصویر اتر گئی۔

پھر میری دستار بندی کی تقریب ہوئی۔ میو ہسپتال کے باہر فروخت ہونے والے پرانے پردے کے ٹکڑے کو میرے سر پر باندھ دیا گیا اور تصویریں اتاری گئیں۔ پھر لڈوؤں اور دیسی پھلوں کی دعوت ہوئی۔

اگلے روز بھولا میرے پاس آیا اور تقریب کی تصاویر میرے سامنے رکھ دیں" لو باؤجی انہیں اخبار میں چھپوا دو۔"

"بھئی یہ میرا کام تو نہیں۔ میں کیسے چھپوا دوں؟"

"باؤجی یہ کام بھی حلف لینے والے کا ہوتا ہے...... ہم نے تو پہلے پوچھ لیا تھا "انجمن جاکڑ چھولے فروشاں" اور "انجمن لڈو پٹھیاں فروشاں" والوں سے..... نہ ہم نے آپ کی دستار بندی نہیں کی؟ اب فوٹو چھپواؤ"

"اب فوٹو چھپواؤ" اس نے خاصے دھمکی آمیز لہجے میں کہا..... اور جاتے جاتے اس نے فوٹوگرافر کا بل بھی وصول کر لیا۔

اب میں یہ چاہتا تو تھا کہ اخباروں میں تصویر چھپے اور میری شہرت کل عالم میں پھیل جائے لیکن چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا..... اور اسی لئے بھولا آج میرے پاس آیا تھا اور وہ بے حد غصے میں تھا" باؤجی اگر ہماری تصویریں نہیں چھپوا سکتے تو ہماری دستار واپس کر دو۔"

اب یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔ میں اپنی دستار واپس کر دوں؟..... اور اگر واپس کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر سکتا کیونکہ پرانے پردے کا وہ ٹکڑا اب گھر کے جھاڑ پونچھ کے کام آتا ہے...... اب آپ ہی بتایئے کہ میں کیا کروں؟ دستار واپس کر دوں؟

اونٹ بھائی جان کا چالان ہوگا

کاروان سرائے میں آج اونٹ آ گئے ہیں۔

ایک خبر کے مطابق سعودی عرب میں عنقریب اونٹوں کو ریفلیکٹر پہنائے جائیں گے۔ تاکہ ڈرائیور انہیں اس وقت دیکھ سکیں جب وہ راہ بھٹک کر سڑک پر نکل آتے ہیں۔ اس سلسلے میں تیار کیے جانے والے ریفلیکٹر کی آزمائش جاری ہے کہا جاتا ہے کہ یہ بھولے بھالے اونٹ رات کے وقت کاروں کی زد میں آ کر ہلاک ہو جاتے ہیں اور ریفلیکٹر انہیں بچانے کے لئے پہنائے جائیں گے...

ابھی تک شاید یہ طے نہیں ہوا کہ ریفلیکٹر اونٹ کو کس طرح پہنائے جائیں گے۔ اور اس کے جسم کے کونسے حصے پر لگائے جائیں گے۔

ہمارے بچپن میں ریفلیکٹر کو سرخ بتی کہا جاتا تھا اور یہ سائیکلوں کے پچھلے مڈگارڈ پر لگے ہوتے تھے۔

گرمیوں کی تپتی دوپہریں تھیں مال روڈ سنسان پڑی تھی اور میں اپنے کلاس فیلو جمال کو اپنے سائیکل کے کیریئر پر بٹھائے سکول سے واپس آ رہا تھا جی پی او کے چوک میں ایک جمائیاں لیتا ہوا ٹریفک کانسٹیبل کھڑا تھا جسے دیکھ کر ہم فوری طور پر سائیکل سے اتر گئے کیونکہ ان دنوں "ڈبلنگ" سے چالان ہو جایا کرتا تھا جب ہم کانسٹیبل کے قریب سے گزرنے لگے تو اس نے ہمیں روک لیا" اوئے ڈبلنگ کرتے ہو منڈیو" اس نے پوچھا۔

"نہیں جی" میں نے ہکلا کر کہا" ہم تو سکول ہی سے واپس آ رہے ہیں۔"

سنتری بادشاہ صبح سے "فارغ" تھے اور کسی آسامی کی تلاش میں بیٹھے تھے اس لئے جب انہیں اونٹ نظر آگئے تو انہوں نے ہم لومڑیوں کو ہی پکڑ لیا کہ ایں ہمہ بچہ شتر است..... انہوں نے ہماری سائیکل کو بغور دیکھا اور پھر گرجتے ہوئے کہنے لگے "اوئے تمہاری تو سرخ بتی ہی نہیں ہے"..... اور واقعی سائیکل کا ریفلیکٹر یعنی سرخ بتی نہیں تھی۔

جمال نے ہمت کی اور کہنے لگا "جناب سُرخ بتی تو رات کے وقت ہونی چاہیئے اب تو دوپہر ہے"۔

سنتری بادشاہ کو یہ تکنیکی اعتراض بے حد ناگوار گذرا اور انہوں نے جیب میں سے کاپی نکالتے ہوئے کہا "یہ ہونی تو چاہیئے ناں..... اگر تمہیں یہاں سے گھر پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے تو پھر.....؟"

میں نے عرض کیا ہم اگلے چوک میں رہتے ہیں اور اس وقت ڈیڑھ بجا ہے اور ہم اگلے پانچ منٹ میں گھر پہنچ جائیں گے اور پانچ منٹ تک سورج غروب ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے.....

"تمہارا تو ہو گا چالان منڈیو اور ساتھ میں تمہیں لے جاؤں گا تھانے..... تم بھی حوالات میں اور تمہاری سائیکل بھی"۔

یہ خوفناک دھمکی سن کر ٹانگیں لرزنے لگیں حلق خشک ہو گیا اور ہم دونوں کو اپنی اپنی امی جان یاد آنے لگیں کیونکہ ہم چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے اور اس زمانے میں چھٹی جماعت میں پڑھنے والے بچے اتنے "ہوشیار" نہیں ہوتے تھے خاصے بزدل اور مسکین ہوتے تھے ہماری جیب بھی بالکل خالی تھی کیونکہ ہم اپنے جیب خرچ کو آلو چھولوں پر خرچ کر چکے تھے ایک آنے کا نان اور ایک آنے کے چھولے..... سنتری بادشاہ کی "خدمت" بھی نہیں ہو سکتی تھی اور وہ بڑی سنجیدگی سے کاپی پر کچھ لکھ رہا تھا..... تب میں نے جمال کو اپنا

کمال دکھانے کا اشارہ کیا اور اس نے ایک طویل ہچکی بھری آنکھوں کو ملا اور پورا منہ کھول کر ایک دلدوز "ہا آ آ" کیا اور پھر چھاچھم رونے لگا اس کا گریہ اتنا یکلخت اور اندوہناک تھا کہ سنتری بادشاہ بھی بھونچکا رہ گیا کہ اس لڑکے کو کیا ہوا ہے..... اور یہی جمال کا کمال تھا تمام ماسٹر اور سکول کے بچے اس کی اس خود کار رونے کی عادت سے واقف تھے اور اس سے دور ہی رہتے تھے کیونکہ وہ اتنی شدت اور بے چارگی سے روتا چلا جاتا تھا کہ اسے چپ کرانا مشکل ہو جاتا تھا اور جمال اس خداداد صلاحیت کا پورا پورا فائدہ اٹھاتا تھا۔ چنانچہ یہاں مال روڈ کے چوک میں سنسان دوپہر میں جمال اپنے کمال کا پورا پورا مظاہرہ کر رہا تھا رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا اور دور نزدیک سے راہگیر بھاگے چلے آ رہے تھے کہ اس چھوٹے بچے پر نجانے کیا ظلم ڈھایا جا رہا ہے لوگوں کو جمع ہوتے دیکھ کر جمال نے ہچکیاں لیتے ہوئے "امی امی" بھی پکارنا شروع کر دیا..... یہ صورت حال سنتری بادشاہ کے لئے انتہائی تشویشناک تھی اور وہ لوگوں کو یقین دلا رہا تھا کہ میں نے ہرگز ہرگز اس بچے کو کچھ نہیں کہا اور عوام یہ کہہ رہے تھے کہ تم نے ضرور کچھ کہا ہو گا ورنہ اس بچے کا اتنا برا حال نہ ہوتا..... قصہ مختصر ہم دونوں اس چوک میں سے فتح مند نکلے اور ہمیں دو معزز راہگیر گھر تک چھوڑنے آئے۔ ..... اس کے بعد جب بھی سکول سے واپسی ہوتی ہم "ڈبلنگ" کرتے اور سیٹیاں بجاتے ہوئے سنتری بادشاہ کے قریب سے گزر جاتے اور وہ ہماری جانب دیکھنے کی بجائے جی پی او کی گھڑی کی طرف منہ اٹھائے ٹائم دیکھتا رہتا۔

سوال یہ ہے کہ اگر اونٹوں کو بھی ریفلیکٹر لگا دیئے گئے تو ان کی بھی تو چیکنگ ہوا کرے گی کہ کونسا اونٹ ریفلیکٹر پہنے ہوئے ہے اور کونسا اس کے بغیر قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہے انہیں چیک کرنے کے لئے اونٹ تو بھرتی نہیں کیے جائیں گے، سنتری بادشاہ ہی ہوں گے چنانچہ اکثر اوقات اس قسم کی صورت حال ظہور پذیر

ہوگی کہ ایک اونٹ چلا جا رہا ہے اور سنتری بادشاہ نے اسے روک لیا ہے اور ان کی گفتگو کچھ اس طرح کی ہوگی۔

"اونٹ بھائی جان"

اونٹ بھائی جان کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"آپ کا ریفلیکٹر نہیں ہے..... چالان ہوگا..... تمہارا نام کیا ہے؟"

"لیکن جناب عالی اس وقت تو صحرا کی تپتی ہوئی دوپہر ہے میرے پاس ذاتی ریفلیکٹر موجود ہے جو میں رات کے وقت پہن کر نکلتا ہوں..... اس وقت اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں کہتا ہوں نام بتاؤ اپنا"

"شتر بے مہار" جواب ملتا ہے "لیکن سنتری بادشاہ ٹھہریئے میں آپ کو چند ایک شتر غمزے دکھاتا ہوں"

اونٹ نہایت عمدہ قسم کے شتر غمزے پیش کرتا ہے لیکن سپاہی پر کچھ اثر نہیں ہوتا اور وہ چالان کرنے پر مصر ہے...... تب اونٹ اپنی تھوتھنی اس کے قریب لاتا ہے اور کہتا ہے "اگر تم میرے شتر غمزے نہیں دیکھتے تو میں تمہیں شتر کینہ دکھاتا ہوں"

اونٹ اپنے دانت نکالتا ہے منہ کھولتا ہے سپاہی کو دبوچ کر زمین سے اٹھاتا ہے اسے چند ایک جھٹکے دیتا ہے سنتری بادشاہ بے ہوش ہو جاتا ہے اور اونٹ لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا جاتا ہے۔

بچہ گٹر میں

ادارہ "تخلیق" کی جانب سے صحافی خاتون سلمٰی جبیں حال مقیم برمنی کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا تھا اور میں اس میں شامل ہونے کے لئے دکان سے باہر آ کر اپنے بوسیدہ موٹر سائیکل کو ککیں لگا رہا تھا کہ معراج پتھر وارد ہو گیا۔ اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔"

"کہاں جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں" میں نے کہا میں اور کیا کہہ سکتا تھا۔

"یہ بچہ کیسا ہے؟" اس نے بچے کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

"اچھا ہے" میں نے جواب دیا۔

"تمہارا بھتیجا ہے" اس نے فخر سے کہا۔

میں نے بچے کو شتابی سے پیار کیا۔ شتابی سے اس لئے کہ مجھے پورے پانچ بجے اس محفل میں پہنچنا تھا اور محفل انٹرکان ہوٹل میں تھی اور میں نے دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا کہ گوالمنڈی میں لنچ کرنے کی بجائے بہتر ہے کہ شام کا انتظار کیا جائے اور انٹرکان کے خنک ہال میں کافی کے ہمراہ پیٹیز، سینڈوچ اور پیسٹریاں نوش کی جائیں۔ چنانچہ میں چاہتا تھا کہ معراج پتھر جلد از جلد رخصت ہو جائے لیکن معراج پتھر چپل اتار کر پاؤں کرسی کے اوپر رکھے بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا وہ جلدی میں نہیں تھا۔

"اچھا تو یہ تمہارا بیٹا ہے؟" میں نے ایک مرتبہ پھر بچے کو قدرے اطمینان سے

پیار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں" وہ کہنے لگا۔ پچھلے ہفتے پتہ ہے کیا ہوا۔ میں جناب اسے سکول سے واپس لا رہا تھا سکوٹر پہ یہ پیچھے بیٹھا کھیرے کھا رہا تھا گوروا رجن نگر نہیں، یہ موڑ پہ...۔ وہاں پر جناب "تارڑ صاحب ایک گٹر تھا سکوٹر اچھلا، پیچھے سے یہ اچھلا سیدھا جناب عالی کھلے گٹر میں۔

"نہیں ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "بچہ گٹر میں؟"

"ہاں جی پورا کا پورا بچہ گٹر میں...... کیوں اوئے چپ کیوں بیٹھا ہے چاچے کو بتا ناں کہ گٹر میں چھلانگ کس طرح ماری تھی؟" بچہ قدرے شرمندہ ہو کر کہنے لگا "آہو جی میں گٹر میں جا پڑا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔ دراصل معراج پتھر جس پُرمسرت اور پُرلطف انداز میں یہ کتھا بیان کر رہا تھا اس سے لگتا یوں تھا کہ بچہ گٹر میں نہیں بلکہ انٹرکان کے سوئمنگ پول میں جا گرا تھا۔ بہرحال اب تو گرنے والے نے بھی تصدیق کر دی تھی۔ معراج پتھر نے ایک طویل سُوٹا لگایا اور کہنے لگا "ہونا کیا تھا؟...... مجھے تو جناب پتہ تھا کہ بندہ ڈوبنے سے پہلے دو مرتبہ پانی کے اوپر ضرور بر ضرور آتا ہے، میں سکوٹر چھوڑ کر گٹر کے عین اوپر...... تیار، یہ پہلے تو گیا ہی گیا پھر ایک دم جو اس کا سر اوپر آیا تو میں نے بالوں سے پکڑا اور باہر گھر جا کر دیگ چڑھائی شکرانے کی...... کیوں اوئے پھر تو نہیں گرے گا گٹر میں؟"

بچہ مسکرانے لگا۔

معراج پتھر خاصے دنوں کے بعد میری طرف آیا تھا اور میں اسے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میاں مجھے انٹرکان کی کافی اور سینڈوچ بلا رہے ہیں تم جاؤ...... چنانچہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا تھوڑی دیر کے بعد میں نے پوچھا "معراج اور کیا حال ہے؟"

معراج پتھر نے سگریٹ پھینک کر نیا سگریٹ سلگایا اور کہنے لگا "ٹھیک ہے۔"

"اس کے علاوہ اور کیا حال ہے؟" میں نے دریافت کیا...۔

وہ اطمینان سے بیٹھا رہا اور کہنے لگا "اس کے علاوہ بھی ٹھیک ہے"...۔

یوں لگتا تھا جیسے انٹرکان کا لنچ بستہ ہال اور کافی میری قسمت میں نہیں تھے تھوڑی دیر کے بعد معراج پتھر تیوری چڑھا کر بولا "آپ نے آج کا اخبار پڑھا ہے؟..."

میں نے اقرار میں سر ہلایا تو میز پر مکّہ مار کر کہنے لگا "وہ خانہ خراب بچوں کے چالان کر رہے ہیں" میں نے پوچھا "کون؟" معراج نے ناراض ہو کر میری طرف دیکھا اور بے حد اداس ہو کر بولا "تم نے نہیں پڑھا اخبار...... کراچی کی پولیس ان تمام لوگوں کا چالان کر رہی ہے جو بچوں کو سکوٹر اور موٹر سائیکلوں پر بٹھاتے ہیں ناں تارڑ صاحب آپ بتاؤ...... ہم جیسے غریب غربا اپنے بچوں کو گھر چھوڑ جائیں؟...... ہماراجی نہیں چاہتا بال بچے ساتھ لے کر آئس کریمیں کھانے کو...... اور جناب کراچی پولیس ذرا یہ بتائے کہ بچے جناب سکول کس طرح پہنچیں گے وہ واپس کیسے آئیں گے ہم سب کے پاس تو کاریں نہیں ہوتیں...... بسوں اور ویگنوں کا جو حال ہے تم کو معلوم ہے ویگنوں والے تو بچوں کو بٹھاتے ہی نہیں کہ پیسے کم ملیں گے اور بس سٹاپوں پہ جو حال ہوتا ہے گرمی میں۔ ناں تم بتاؤ کہ ہم لوگ اپنے بچوں کے خلاف ہیں؟...... ناں کس پر جائیں یہ سکول؟" معراج پتھر قدرے غصے میں تھا اور میں جلد از جلد انٹرکان پہنچنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے سمجھایا کہ بھئی کراچی کی پولیس چالان کر رہی ہے ناں، لاہور میں تو ایسا نہیں ہوا۔ اس نے سگریٹ فرش پر پھینکا اور بازو لہرا کر کہنے لگا "ہو جائے گا لاہور میں بھی ایسا۔ ٹریفک پولیس کا اور کام کیا ہے۔ ہم جیسے غریب غربا کو تنگ کرنا اور پھر میں نے تمہیں بتایا ہے ناں کہ ہم پاکستانی اپنے بچوں کے سخت خلاف ہیں پرائیویٹ سکولوں نے لوٹ مچائی ہوئی ہے اس کو دیکھو...... چھٹی کے وقت جس طرح ننھے منے

بچے ویگنوں اور بسوں کے پیچھے بھاگتے ہیں کبھی جا کر دیکھو...... کوئی گھسنے نہیں دیتا ان کو بسوں میں......؟

"تو میں کیا کروں؟"

"آپ! آپ نے کیا کرنا ہے میں تو ویسے ہی دل کی بھڑاس نکال رہا تھا لیکن تارڑ صاحب یہاں لاہور میں اگر پولیس نے بچوں کے چالان کیے ناں تو بہت برا ہو گا. لڑائی ہو جائے گی چل اوئے گھر چلئے تیری بے بے انتظار کر رہی ہو گی، سامانیکم معراج پتھر نے اپنے بچے کو اٹھایا اور سکوٹر پہ بٹھایا اور ہارن بجاتا ہوا چلا گیا. میں بھی اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھا اور ہارن بجاتا انٹر کان پہنچ گیا ہال میں پہنچا تو نشست کا آغاز ہو چکا تھا اور شہر کے ادیب سلمیٰ جبیں سے ان کے قیام جرمنی کے بارے میں مختلف سوالات پوچھ رہے تھے میں گرمی سے بولایا ہوا تھا اور ایئر کنڈیشنگ کی یخ بستہ ہوا کو اپنے بدن پر پھیلتے ہوئے راحت محسوس کر رہا تھا کہ یکدم عذرا اصغر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "آپ بھی سلمیٰ جبیں سے کوئی سوال پوچھیں گے؟"

"جی ہاں" میں نے ہڑبڑا کر کہا "یہ فرمائیے کہ کیا جرمن قوم بھی اپنے بچوں کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو ہم کرتے ہیں؟"

سلمیٰ جبیں مسکرائیں اور کہنے لگیں "میرا خیال ہے آپ پر گرمی کا اثر ہو گیا ہے پہلے کچھ سینڈوچز لیجیے کافی پیجیے پھر اطمینان سے پوچھیے گا."

"میں بالکل ٹھیک ہوں" میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا جرمنی میں بچے گٹروں میں گر جاتے ہیں؟ کیا ان کے چالان کیے جاتے ہیں؟"

"آپ پہلے ٹھنڈا پانی پیجیے" ویٹر نے میرے سامنے پانی کا گلاس رکھ دیا اور میں سر جھکا کر شرمندہ ہو کر بیٹھ گیا.

کُتّا اخلاقیات

میرے ایک پڑوسی خان صاحب کا کہنا ہے کہ ایک کتے میں چاہے وہ اعلیٰ نسل کا السیشن ہو یا بازاری قسم کا ڈگ کتا سات ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اگر انسان اپنے اندر پیدا کر لے تو باقاعدہ ولی اللہ ہو جائے اور پہنچ جائے" "پہنچ جانے" سے ان کی مراد فوت ہو جانا نہیں بلکہ مالک حقیقی کا قرب ہے. پہلے پہل تو میں نے اس بیان کو ان کی کتا پسندی پر محمول کیا اور بعید از حقیقت جانا مگر کچھ عرصہ بعد جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس میں کچھ سچائی بھی پائی جاتی ہے...... مثلاً مالک سے وفاداری... چاہے وہ کھانے کو دے یا نہ دے، بھوکا رکھے پیاسا رکھے مگر وہ اس کا در نہیں چھوڑے گا. پھر مالک کے گھر کی پاسبانی.... تاکہ کوئی چور اچکا اندر نہ داخل ہو اور راتوں کو جاگنا ...... تاکہ مالک کے آرام میں خلل نہ واقع ہو.... اور صبر.... جو مل گیا کھا لیا اور ہمیشہ دم ہلا کر تشکر کا اظہار کیا..... ہمارے صوفیائے کرام نے بھی اپنے مالک کے بارے میں یہی طریقہ کار اختیار کیا انہوں نے اپنے آپ کو اس کے در کی کُتی کہا...... بابا بلھے شاہ نے صرف راتوں کو جاگنے کو ہی افضل قرار نہیں دیا. ع

راتیں جاگن کُتے، تیتھوں اُتے

میرے ایک دوست نے گھر کی رکھوالی کے لئے کہیں سے ایک عدد "کتورا" حاصل کیا اور اس کا نام فلسطینیوں کے قاتل اسرائیلی شیرون پر رکھا. کچھ عرصے بعد اس نے نہایت شرمندگی سے اعلان کیا کہ بھئی میں نے اپنے کتے کا نام بدل دیا ہے اور ٹومی وغیرہ رکھ لیا ہے کیونکہ جانور تو اتنا پیار کرنے والا اور وفادار ہے کہ اس کا نام شیرون

رکھنا بہت ہی زیادتی ہے آج مجھے کتے اس لیے یاد نہیں آ رہے کہ میں خواجہ سگ پرست قسم کی کوئی چیز ہو گیا ہوں بلکہ اخبار میں ایک خبر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ پیرس میں کتوں کے لئے ایک خصوصی ہوٹل کھولا گیا جس میں کتوں کے طعام و قیام کا مناسب بندوبست ہو گا۔ حسب پسند موسیقی سنوائی جائے گی اور کرسمس کے موقع پر اونی جرابوں کا تحفہ بھی دیا جائے گا۔ اہل مغرب کی "کتا پسندی" تو میرے علم میں تھی یہاں تک کہ امریکہ میں اب کتوں کی نفسیات کے ماہر باقاعدہ پریکٹس کرتے ہیں، یعنی اگر آپ کا کتا بے حد اداس اور رنجور بیٹھا رہتا ہے آپ کو دیکھ کر دم نہیں ہلاتا تو ماہر نفسیات باقاعدہ اس کا نفسیاتی تجزیہ کر کے اس کا علاج کر دے گا۔ مگر ایک باقاعدہ "کتا ہوٹل" کا قیام میرے لئے بھی باعث حیرت تھا کیونکہ کچھ سوال ہیں جو ذہن میں آتے ہیں مثلاً..... کیا اس ہوٹل میں ہر قسم اور ہر نسل کا کتا قیام کر سکتا ہے؟ کیا کتے ریلوے اسٹیشن سے اپنا سوٹ کیس اٹھا کر خود ہی اس ہوٹل میں پہنچ جائیں گے یا انہیں وہاں پہنچایا جائے گا؟ اور ہوٹل پہنچنے پر وہاں کا منیجر کتا ان کے ساتھ کس قسم کی گفتگو کرے گا۔

شاید صورت حال کچھ اس قسم کا ہو کہ ایک بھاری بل ڈاگ ہانپتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوتا ہے اور ریسپشن ڈیسک پر جا کر ایک زوردار "بھوؤ بھوؤ" کرتا ہے۔

منیجر جو ایک خوبصورت اور نازک سا فرانسیسی پوڈل ہے قدرے ناگواری سے کہتا ہے "جناب بدتمیزی کا مظاہرہ مت کیجئے"۔

بل ڈاگ دانت نکوس کر غراتا ہے کہ کیا مطلب! یہ کوئی انسانوں کا ہوٹل تو نہیں، جہاں میں بھونک بھی نہیں سکتا..... پوڈل شرمندہ ہو کر سر جھکا لیتا ہے "نہیں جناب میرا یہ مطلب نہیں تھا، ہمارے کمرے ساؤنڈ پروف ہیں وہاں جی بھر کر بھونک لیجئے گا۔ اس کے بعد کچھ اس قسم کا مکالمہ ہوتا ہے۔

"یہ فرمائیے کہ آپ کے ہوٹل کی کیا کیا خصوصیات ہیں۔"

"جی یہاں آپ کو گھر کا آرام ملے گا۔"

"وہ نہیں چاہیئے۔"

"تو پھر گھاٹ کا آرام ملے گا۔"

"یہ بھی نہیں چاہیئے کیونکہ میں دھوبی کا کتا نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ؟"

"اس کے علاوہ آپ کو ایک لوہے کی نلکی دی جائے گی تاکہ آپ دُم سیدھی کر سکیں۔"

"وہ بھی نہیں چاہیئے..... میں دُم کٹا ہوں..... اور کچھ؟"

"ناشتے میں آپ کو ایک خشک ہڈی دی جائے گی تاکہ آپ اسے چبا چبا کر اپنے تالو کو زخمی کر لیں اور اپنے ہی خون کے ذائقے کا لطف لیتے رہیں..."

"یہ بھی نہیں چاہیئے کیونکہ میرے دانت نہیں ہیں اور میں نقلی بتیسی پہنتا ہوں۔ اس کے علاوہ؟"

"اس کے علاوہ ناشتے کے بعد ڈرائنگ روم میں ایک بلی چھوڑ دی جائے گی تاکہ اس کے پیچھے بھاگ کر آپ اپنا نظام ہاضمہ درست رکھ سکیں۔"

"کونسی نسل کی بلی؟"

"کوئی بھی بلی۔"

"کوئی بھی بلی..... نہیں صاحب مجھے تو سیامی نسل کی بلی چاہیئے....."

"وہ ہم نے رکھی تھی پچھلے دنوں مگر کتا حضرات اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے کی بجائے اسے دیکھ کر دم ہلانے لگتے تھے اور ملاقات کا وقت مانگنے لگتے تھے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں اس قسم کے ہوٹل میں قیام نہیں کر سکتا جہاں سیامی بلی نہ ہو۔"

بل ڈاگ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر چلا جاتا ہے۔

ایک نہایت متکبر بل ٹیریر اندر داخل ہوتا ہے اور پوڈل سے پوچھتا ہے۔

"کیوں صاحب اس ہوٹل میں انسانوں کو ساتھ رکھنے کا بھی کوئی انتظام ہے؟"

"توبہ توبہ۔ یہاں انسانوں کا داخلہ ممنوع ہے جناب"

اچھا...... بل ٹیریر مایوس ہو کر کہتا ہے مجھے کوئی اور ہوٹل تلاش کرنا ہوگا میرا مالک میرا سوٹ کیس اٹھائے باہر کھڑا ہے اور باہر بارش ہو رہی ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں مزے سے یہاں سو جاؤں اور وہ باہر کھڑا بھیگتا رہے...... کتا اخلاقیات بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے اور بل ٹیریر باہر چلا جاتا ہے۔

اب ایک مہین سا نحیف و نزار ہڈیوں کا ڈھانچہ کتا آتا ہے۔ بڑی لجاجت سے کمرے کے بارے میں پوچھتا ہے پوڈل اسے ایک کمرے کی چابی دیتا ہے تب وہ مہین کتا ایک سیٹی بجاتا ہے اور ہوٹل کے صدر دروازے کے پیچھے روپوش کوئی درجن بھر کتورے دُمیں ہلاتے ہوئے اندر آتے ہیں اور اپنے والد کی معیت میں سیڑھیاں چڑھ جاتے ہیں۔ پوڈل آوازیں دیتا رہتا ہے کہ جناب ایک کمرے میں اتنے بچے سلانے کی اجازت نہیں مگر مہین کتا دم دبائے ہوئے اوپر جا چکا ہے۔

اس کے بعد ایک نہایت ہینڈسم اور پر اعتماد کتا اندر آتا ہے اور کمرے کے بارے میں دریافت کرتا ہے پوڈل اس کی چال ڈھال اور شکل و صورت کا جائزہ لیتا اور پوچھتا ہے۔

"آپ فرانسیسی تو نہیں؟" ———— "نہیں"

"تو کیا آپ یورپین ہیں؟" ———— "نہیں"

"ایشیا یا افریقہ سے آئے ہیں؟" ———— "جی ہاں"

"تو پھر آپ کے لئے اس ہوٹل میں کوئی جگہ نہیں ہے آپ نے داخلے پر بورڈ نہیں پڑھا

RIGHTS OF ADMISSION RESERVED.

خوشگوار، شادی شدہ زندگی اور تاریخی بیویاں

عیدالفطر کے موقع پر مجھے بھی عزیزوں دوستوں آشناؤں اور نادیدہ چاہنے والوں نے رنگا رنگ قسم کے عید کارڈ روانہ کیے ہیں، اور مجھے شرمندہ کیا ہے کیونکہ میں نے حسب معمول اس مرتبہ بھی کارڈ بھیجنے سے پرہیز کی تھی۔ ان عید کارڈوں میں اسلامی نیم اسلامی پھول پتیوں سے مزین ہلال عید اور اونٹ والے کارڈ بھی تھے اور اشفاق احمد بانو قدسیہ کا عید کارڈ بھی تھا۔ جس کے بارے میں منو بھائی نے پبلک سے درخواست کی ہے کہ اگر کوئی اس کارڈ کو سمجھ سکا ہو تو براہ کرم فوراً رابطہ قائم کرے اب یہ ضروری تو نہیں کہ ہر بات سمجھ میں آ جائے کل کلاں منو بھائی "توتا کہانی" کے بارے میں بھی یہی درخواست شائع کریں گے...... ویسے عید کارڈ بالکل سادہ ہے اس میں کوئی پیچ یا گنجل نہیں ہے پیٹرو ڈالر کے بارے میں کچھ بیان کرنے کی کوشش ہے......

بہرحال مجھے عید کے موقع پر جو سندیسے پہنچے ان میں سے ایک نہایت قیمتی اور مفید دستاویز برآمد ہوئی ہے۔ یہ سائیکلو سٹائل کیا ہوا ایک پیغام عید ہے۔ جو سعید احمد فارانی اسپرانتو سنٹر مجیدیہ مکتب جہلم کی جانب سے روانہ کیا گیا ہے اس پیغام کے مندرجات پڑھ کر یکدم میری زندگی کے خوشگوار ہونے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں ویسے میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ برخوردار سعید احمد فارانی نے اس قسم کا پیغام مجھے ہی کیوں روانہ کیا ہے حالانکہ میں اور میری بیگم یا کم از کم میں تو بے حد مدھم آواز میں اپنا نکتہ نظر بیان کیا کرتا ہوں۔ اب آپ بھی اس پیغام کی تفصیل پڑھ لیجیے ہو سکتا ہے آپ کی زندگی بھی سنور جائے فارانی صاحب لکھتے ہیں۔

محترم جناب تارڑ صاحب!

میں آپ کی خدمت میں چند گذارشات عید الفطر کے موقع پر پیش کر رہا ہوں اگر آپ ان پر عمل کریں گے تو ایک طویل اور خوشگوار زندگی آپ کو حاصل ہو جائے گی۔ مندرجہ ذیل دس اصولوں پر چلنے سے آپ کی شادی شدہ زندگی بے حد پرسکون اور مسرت سے لبریز ہو جائے گی۔

۱۔ کبھی بھی دونوں ایک ہی وقت میں غصے میں نہ آئیں۔
۲۔ ہمیشہ آہستگی سے بات کریں۔ اور صرف اس وقت چلائیں جب گھر کو آگ لگ جائے۔
۳۔ اگر جھگڑا ہو جائے تو دوسرے فریق کو جیت جانے دیں۔
۴۔ اگر تنقید کرنی ہے تو پیار سے کریں۔
۵۔ ماضی کی غلطیوں کو تازہ جھگڑے میں دہرانے سے گریز کریں۔
۶۔ ساری دنیا کو بھول جاؤ مگر ایک دوسرے کو مت بھولو۔
۷۔ اگر کسی مسئلہ پر اختلاف ہو جائے تو سونے سے پیشتر اس اختلاف کو ختم کر دیں تاکہ اگلی صبح کا آغاز لڑائی جھگڑے سے نہ ہو۔
۸۔ دن میں کم از کم ایک مرتبہ اپنی زندگی کے ساتھی کی تعریف ضرور کریں۔
۹۔ اگر غلطی آپ کی ہے تو فوراً اس کا اقرار کریں اور معافی مانگ لیں۔
۱۰۔ جھگڑا ہمیشہ دونوں فریق ہی کرتے ہیں یعنی تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی اور جونسا فریق غلطی پر ہو وہی سب سے زیادہ باتیں کرتا ہے۔

اس عید الفطر کے موقع پر میں آپ کو اور آپ کے اہل خانہ کو مبارک باد کہتا ہوں۔ آپ کا سعید احمد فارانی (اسپرانتو ایکسپرٹ جہلم)

پورا پیغام پڑھ کر میری آنکھیں کھل گئیں کمال ہے خوشگوار شادی شدہ زندگی اگر

ان اصولوں پر کاربند رہنے سے حاصل ہو سکتی ہے تو میں اب تک ان سے کیوں محروم ہوں تب مجھے وہ "تاریخی بیویاں" یاد آ گئیں۔ جن نیک بختوں نے اپنے خاوندوں کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ اور ہماری بیویوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئی تھیں، مثلاً ٹالسٹائی کی بیوی، جس نے اس بوڑھے ادیب کو گھر سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ غریب کسی ریلوے سٹیشن پر بیٹھا بیٹھا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ (اگر روسی اللہ کو پیارے ہو سکتے ہیں تو)، مثلاً ابراہام لنکن کی پیاری بیوی جو ہمیشہ اس کی شکل کے بارے میں اعتراض کرتی رہتی کہ تمہارے کندھے جھکے ہوئے ہیں تمہاری چال بے ڈھنگی ہے، تمہاری ناک ٹیڑھی ہے...... لنکن صاحب اس لئے کامیاب صدر ثابت ہوئے کہ دفتر سے اٹھ کر واپس گھر نہیں جاتے تھے۔ مرزا غالب کی بیوی نے جو ان کا حشر کیا وہ سب جانتے ہیں سقراط پر ان کی بیگم صاحبہ از راہ پیار پانی کا گھڑا ڈال دیا کرتی تھیں یا پھر شیخ سعدی کی بیوی جس نے کھانے میں نمک کی زیادتی کی شکایت پر ہنڈیا اٹھا کر شیخ صاحب کے سر پر دے ماری تھی اور ہنڈیا کا منہ ان کے گلے کا طوق بن گیا جب گھر سے باہر آئے تو پوچھا گیا کہ یا شیخ یہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ یہ شادی کا طوق ہے...... یا پھر مثلاً "میری بیوی" ولاحول ولا...... توبہ توبہ میں کدھر سے کدھر نکل گیا......

بہر حال افسوس بہت ہوا کہ اگر یہ دس اصول سقراط سعدی غالب وغیرہ کے زمانے میں دستیاب ہو جاتے تو وہ غریب بھی سکھ کا سانس لیتے چنانچہ ان مشہور عالم ہستیوں سے زیادہ خوش قسمت ہوں کہ میرے پاس ایسے دس اصول تھے جن کی مدد سے میں اپنی زندگی رشک گلزار وغیرہ بنا سکتا تھا۔ میں نے فوراً اپنی بیگم کو بلایا اور یہ ہدایت نامہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا...... اس نے چندھیائی آنکھوں سے اس کا معائنہ کیا اور کہنے لگی کہ میں اپنی عینک باورچی خانے میں چھوڑ آئی ہوں تم پڑھ کر سنا دو......

میں نے اسے بتایا کہ بیگم اس پیغام میں دس ایسی ہدایات ہیں کہ ان پر عمل کرنے سے ہم ایک خوش گوار زندگی گزار سکتے ہیں۔

بیگم نے ناک چڑھا کر کہا کیوں اب تمہیں کیا تکلیف ہے؟

میں نے جھینپ کر کہا کہ بھئی تکلیف تو بالکل کوئی نہیں لیکن یہ جو کبھی کبھار ہفتے میں صرف سات آٹھ بار ہمارا خفیف سا جھگڑا ہو جاتا ہے۔ یا تم میرا روٹی پانی بند کر دیتی ہو۔ یا دیر سے آنے پر گیٹ نہیں کھولتیں وغیرہ وغیرہ تو یہ والی صورتحال بہتر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میں ایک ایک کر کے مندرجہ بالا اصول پڑھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی بیگم کا موڈ بہتر ہونے لگا۔ اور آخر میں وہ باقاعدہ مسکرانے لگی۔ کہنے لگی "اللہ بھلا کرے اس لافانی کا اس نے بہت اچھی باتیں لکھی ہیں۔ تم فوراً ان پر عمل کرنا شروع کر دو۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا "میں عمل کرنا شروع کر دوں؟"

"تو اور کیا..... یہ اصول تمہارے لئے ہی تو لکھے گئے ہیں۔"

"لیکن بھئی اس میں کہیں یہ نہیں لکھا گیا کہ یہ ہدایت نامہ خاوندوں کے لئے ہے۔ اس میں تو دوسرے فریق یا شریک زندگی کے حوالے سے بات کی گئی ہے؟"

"تو کیا تم میرے شریک زندگی نہیں ہو؟"

"کہہ سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب کہہ سکتے ہیں..... ہو یا نہیں۔"

"ہوں۔" میں نے اقرار کیا۔

"تو پھر!"

"تو پھر کیا؟"

"تو پھر یہ اصول تمہارے لئے ہیں..... خط کے اوپر محترم جناب تارڑ صاحب

لکھا ہے محترمہ بیگم تارڑ تو نہیں لکھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پوری دنیا کو علم ہے کہ تم کیسے خاوند ہو..... چنانچہ اس ہدایت نامے پر عمل شروع کر دو تاکہ عید اچھی گزر جائے۔" یہ کہہ کر محترمہ واپس باورچی خانے میں چلی گئی۔

ہدایت نامہ چونکہ سائیکلو سٹائل کیا ہوا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ یہ بے شمار خاوندوں کو پوسٹ کیا گیا ہے۔ اور مجھے شک ہے کہ یہ خاوندوں کے خلاف ایک گہری سازش ہے۔ اور اس کے پیچھے بھی کسی بیگم کا ہاتھ ہو گا۔ شاید بیگم سعید احمد فارانی کا..... یعنی فارانی صاحب نے سوچا کہ اپنی زندگی تو جیسے کیسے گزر رہی ہے۔ عید کے موقع پر دیگر پاکستانی خاوندوں کی زندگی بھی اجیرن کیوں نہ کی جائے حالانکہ میں تو ان بہادر خاوندوں میں سے ہوں جو بیویوں کا کہنا بالکل نہیں مانتے یعنی اگر میں اس بی بی سے خوفزدہ ہو کر پلنگ کے نیچے گھس جاؤں تو بے شک وہ لاکھ منتیں کریں لیکن میں کبھی باہر نہیں نکلتا..... اپنے فیصلے ہمیشہ میں خود کرتا ہوں ——

لمپک کھیلیں

"اوئے بھولے، آج گاہکی کا کیا حال ہے ؟"

"یار پوچھ آج تو صبح سے گاہک تو کیا مکھی تک نہیں آئی ریڑھی پر، تم سناؤ"

"میرا بھی یہی حال ہے ___ لگتا ہے لاہوریوں نے پان کھانے چھوڑ دیئے ہیں...... کوئی بندہ سپاری بھی نہیں مانگنے آیا مفت میں"

"بھولے یہ ہاکی میچ جیتنے کا بڑا نقصان ہوا ہے ہمیں چار ماشے سونے کے تمغے کے لئے سارے پاکستان نے نیند حرام کرلی...... ساری رات جاگتے رہے"

"یار شکر کرو کہ ہم جیت گئے، ورنہ وہ جرمن بھی بڑی جیبر جنگ ٹیم تھی بس قسمت نے ان کا ساتھ نہ دیا"

"بھئی قسمت نے ایک کا ساتھ ہی دینا تھا...... ویسے واقعی بڑی جیبر جنگ ٹیم تھی خون تھکوا دیا ہمیں"

"ہم نے نہیں خون تھکوایا انہیں؟ ہماری ٹیم بھی تو برابر کی تھی...... پر جیتنے سے مجھے بڑا نقصان ہوا"

"تمہارا کیا نقصان ہوا بھولے ؟"

"بھئی میں نے ہار لے کر جانا تھا۔ ہاکی ٹیم کے لئے ان کی واپسی پر"

"تو اب تمہیں کون روکتا ہے ؟"

"اب تو وہ جیت کر واپس آرہے ہیں ساری دنیا پہنچی ہوگی۔ ان کو کندھوں

پر اٹھائیں گے کہیں گے کہ ہمیں پہلے ہی پتہ تھا کہ یہ جیتیں گے، پوری قوم کی دعاؤں کی وجہ سے جیتے ہیں...... ذرا یہ تو بتاؤ کہ اگر ہار جاتے تو کیا ہماری بددعاؤں سے ہار جاتے ؟"

"لیکن تم کو کیا اعتراض ہے ان کے جیتنے پر ؟"

"یہی کہ میں اب ہوائی اڈے پر نہیں جاؤں گا، ان کو ہار ڈالنے کے لئے...... میں نے سوچا ہوا تھا کہ اگر یہ ہار گئے تو پھر جاؤں گا تاکہ ان کو پتہ لگے کہ ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے ہم اپنے کھلاڑیوں سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں اگر وہ کوشش کے باوجود ہار جائیں...... اب تو لوگ ان کے استقبال کو جائیں گے ہی"

"بس یہی نقصان ہوا ہے ؟"

"نہیں ایک اور بھی ہوا ہے...... حرام ہے صبح کا ایک گاہک بھی آیا ہو، پورا لاہور رات بھر میچ دیکھتا رہا ہے۔ اور اب سب لوگ گھروں میں پڑے سو رہے ہیں...... میں نے تو میچ دیکھا اور منڈی چلا گیا۔ وہاں سے آموں کی دس پیٹیاں خریدیں جو ابھی تک بند پڑی ہیں بازار جو سوئے پڑے ہیں ___"

"یار ہاکی ٹیم تو جیت گئی۔ باقی کھلاڑیوں نے کیا کیا ؟"

"باقیوں نے عیش کیا، سیر سپاٹا کیا، امریکہ کی سیر کی اور کیا کیا ___ ؟"

"میں نے ایک پاکستانی کو دیکھا تھا باکسنگ لڑتے ہوئے ؟"

"وہی موٹا سا بندہ جو پہلوانوں کی طرح باکسنگ لڑ رہا تھا ؟"

"آہو...... اس نے تو بے عزتی خراب کردی...... ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے میرا جی چاہتا تھا کہ میں اڑ کر لمپک میں چلا جاؤں اور دوسرے باکسر کو جا کر گھسن پھیر دوں......"

اس کے بارے میں تو اخبار میں آگیا تھا، باکسنگ ٹیم کے مینجر نے کہا ہے کہ

"ہمارے باکسر اس لئے ہار گئے کہ ان کے قد چھوٹے تھے اور وزن کم تھا۔"

"تو بڑے قد کے لے جاتے جن کا وزن زیادہ ہوتا۔"

"اگلی مرتبہ لے جائیں گے۔ یہ تو ابھی پتہ چلا ہے ناں کہ چھوٹے قد کے اور کم وزن کے باکسروں کو نہیں لے جانا چاہیے تھا"

"پہلے نہیں پتہ تھا۔؟"

"نہیں۔"

"یار تمغہ تو ہاکی ٹیم نے ہی جیتنا ہوتا ہے تو پھر یہ ساتھ میں دوسرے بے شمار بندوں کو کیوں لے جاتے ہیں۔؟"

"تجربہ حاصل کرنے کے لئے۔"

"ہر مرتبہ یہی کہتے ہیں تجربہ ابھی حاصل نہیں ہوا؟ ہوتا یہ ہے کہ ہمیں بے عزتی حاصل ہو جاتی ہے اور دوسرے تجربہ لے جاتے ہیں ہم سے تو مراکو والے ہی اچھے رہے دو دوڑیں جیت کر سونے کے تمغے لے گئے۔"

"پر ایک تو لڑکی کو دوڑا کر انہوں نے لیا۔۔۔۔۔۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں حرام تمغہ ہوا۔۔۔۔۔ دوسرا ٹھیک ہے۔۔۔۔"

"ویسے سنا ہے امریکہ والوں نے بے ایمانی بہت کی ہے۔۔۔؟"

"نہ کرتے؟۔۔۔۔۔ انہوں نے مال خرچہ ہوا تھا۔۔۔۔۔ ہم اگر کسی پہلوان کو اپنے ملک میں بلائیں تو جیتنے دیتے ہیں اسے ——؟"

"یار سنا ہے کہ روس والے ادھر اپنی کھیلیں شروع کر رہے ہیں اس بنتے لمپک کے مقابلے میں۔"

"آہو۔۔۔۔۔ جس طرح امریکہ والوں نے صرف خود تمغے حاصل کرنے کے لئے ہم جیسے غریب غربا کو بلایا ہوا تھا اسی طرح روس والے بھی کریں گے۔"

"یار یہ روس اور امریکہ کوئی ایسی لمپک کیوں نہیں کرتے جس میں اور کوئی نہ ہو وہ صرف یہ دونوں ہوں اور خود ہی آپس میں فیصلہ کر لیں۔"

"نہ نہ وہ کوئی بے وقوف ہیں۔۔۔۔۔۔ جس طرح لیڈر لوگ مروا دیتے ہیں ناں عام لوگوں کو اور خود میٹھے رہتے ہیں ایک طرف اسی طرح یہ بھی کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ پہلے ویت نام میں امریکہ نے لمپک کھیلی اور اب روس کھیل رہا ہے افغانستان میں۔"

"یار اس لمپک میں لڑکیوں کا ہاکی کا میچ بھی پڑا تھا؟"

"ہاں پڑا تھا ہالینڈ نے جیت لیا۔"

"تو پھر یہاں ٹیلی ویژن پر کیوں نہیں دکھایا گیا۔؟"

"وہ نیکریں پہن کر جو کھیل رہی تھیں بے شرمی کے ساتھ۔"

"نیکریں تو والی بال کھیلنے والیوں نے بھی پہن رکھی تھیں باسکٹ بال میں بھی یہی لباس تھا۔ دوڑنے والیوں نے بھی نیکریں ہی پہن رکھی تھیں بلکہ کینوں نے تو لگتا تھا کہ نیکریں بھی نہیں پہنی ہوئیں۔۔۔۔۔ اور وہ نہانے والیاں جو تھیں انہوں نے تو حد مکائی ہوئی تھی —— پھر ہاکی کیوں نہیں دکھائی؟"

"یار مجھ سے کیا پوچھتا ہے مجھ سے تو پوچھ کہ بھائی پکی ہندوستان سے سمگل شدہ پان کہاں سے ملتے ہیں۔؟"

"ہندوستان سے!۔۔۔۔۔ کیوں خریدتے ہو سمگل شدہ پان؟"

"وہاں ٹیشن پر کھلے عام بکتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور گاہک بھی یہی مانگتے ہیں۔۔۔۔ پر آج تو صبح سے گاہک کی شکل ہی نہیں دیکھی، ہاکی میچ دیکھنے کے بعد ابھی تک پورا لاہور سویا ہوا ہے۔"

"ہم جب بھی کسی میدان میں جیتتے ہیں اس کے بعد سو جاتے ہیں۔"

اور اگلی مرتبہ ہار جاتے ہیں:"

"کیا — ؛ ہم اگلے لمپک میں ہاکی پیچ ہار جائیں گے ؟"

"تجھے کیا پتہ۔ مجھے تو یہ معلوم ہے کہ ہاکی ٹیم واپس آئے گی، تو ان کی تعریفیں کر کر کے ان کا دماغ خراب کر دیں گے عمران خاں کی تعریفیں کر کر کے اس کی ٹانگ نہیں خراب کر دی ؟ کندھوں پر اٹھائے پھریں گے۔ اگلے چار سال ان کی دعوتیں کرتے رہیں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بس وہ بھی پھنے خاں ہو جائیں گے، کرکٹ والوں کی طرح"

"نہ تو ان کو شاباش نہ دیں واپسی پر۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"شاباش تو دیں پر ان کا دماغ نہ خراب کر دیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ویسے آپس کی بات ہے ہاکی میچ ہمارے کھلاڑیوں نے تو جیتا ہی نہیں یہ تو برگیڈیر عاطف کی مہربانی ہے کہ ہم جیت گئے —"

"وہ بھی کھیل رہے تھے ؟"

"بھئی جب پاکستان ایک گول سے جیت رہا تھا اگر عین اس وقت عاطف صاحب اپنا بیگ اٹھا لیتے تو جرمنی والے بھی گول کر دیتے ان کی مہربانی کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا اور ہم جیت گئے"

"یار بھولے یہ لمپک کبھی پاکستان میں بھی ہو سکتی ہیں ؟"

"نہ"

"نہ کیا ؛ سیدھی طرح جواب دو"

"کبھی نہیں ہو سکتیں"

"کیوں ؟"

"لے ہم پوری لمپک کھیڈیں ٹیلی ویژن پر تو دکھا نہیں سکتے تو پیچ میچ زندہ کیسے دکھا سکتے ہیں اور پھر اس کے لئے لمبے مال کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم

تو غریب ملک ہوئے"

"غریب ملک میں اتنی ٹیوٹا، اتنی ہونڈا ہوتی ہیں ؟"

بحث نہ کیا کر میرے ساتھ جا اپنے پان بیچ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آ گیا لمپک پر بحث کرنے والا"

"اور تو۔ ۔ ۔ ۔ تو اپنے کھٹے آم بیچ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھ کو کیا پڑی ہے امریکہ اور روس کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"آٹھ بہشت دس روپے، دس روپے۔ ۔ ۔ ثمر بہشت۔

"سانچی کا پان کھاؤ گے باؤ جی ؟"

ازن اٹ لولی

کہا جاتا ہے کہ ہر ملک کا موسم وہاں کے باشندوں کے مزاج، عادات اور زندگی کرنے کے دیگر عوامل پر اثر انداز ہوتا ہے سرد اور برفیلے موسم مزاج کو بھی برف کر دیتے ہیں، انسانوں کی رگوں میں خون کی بجائے برف دوڑتی ہے اور وہ ٹھنڈے ٹھنڈے ہنستے کھیلتے زندگی گزار دیتے ہیں، جہاں بارشیں زیادہ ہوں وہاں ''ان ڈورز سرگرمیاں زیادہ ہوتی ہیں. گرم ممالک میں صحت اور عشق میں گرمی ملتی ہے...... دنیا کے بیشتر ممالک کے موسم گرم، سرد یا بھیگے ہوئے ہوتے ہیں پاکستان کی طرح نہیں ہوتے کہ گرمی آئے تو بھون جائے، سردی آئے تو برف بنائے اور بارشیں آئیں تو بہا کر لے جائیں..
یہاں ایک نہیں کئی موسم ہیں اور اسی طور ایک نہیں کئی مزاج ہیں..... لیکن اس کے باوجود ہم عام طور پر موسم کے بارے میں گفتگو نہیں کرتے. اس کا حوالہ ضرور دیتے ہیں کہ بھئی آج تو بہت گرمی ہے. لیکن اسے ایک روگ نہیں بنا لیتے اہل انگلستان ہم سے قدرے مختلف ہیں. انگلستان میں آمد کے پہلے چند روز میرے لئے انتہائی تکلیف دہ تھے...... جو وکٹورین گرامر کی رو سے اپنے تئیں درست انگریزی میں بولتا تھا وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، جو خوراک ملتی تھی اسے دیکھ کر ہی ابکائیاں آتی تھیں اور سب سے بڑی مصیبت موسم تھا...... سردی بہت لگتی تھی اور میں کمبل میں منہ چھپائے لیٹا رہتا جب ہمت کر کے انگلستان کے کوچہ بازار میں نکلا تو وہاں ایک اور پرابلم ہو گئی...... اگر بس کنڈکٹر سے بات ہوئی ہے کسی دکاندار سے کچھ پوچھا ہے کوئی کلاس فیلو یا ٹیچر مل گیا ہے تو اس کا فقرہ ''ازن اٹ لولی''

ہوتا اور یا پھر ''اوہ اٹس آفل'' کہہ کر بات شروع کرتا. اب میں نے ذرا ٹھہر ٹھہر کر ''ازن اٹ لولی'' کا ترجمہ اردو میں کیا تو معلوم ہوا کہ ''کیا یہ خوبصورت نہیں؟'' کہا جا رہا ہے اور دوسرے فقرے کا مطلب ''اوہ یہ خوفناک ہے'' قسم کا بنتا ہے. اب میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کونسی چیز ہے جس کے بارے میں ایک انگریز بار بار مجھے کیا یہ خوبصورت نہیں؟'' کہہ رہا ہے. اور تھوڑی دیر بعد ایک ویٹرس ''اوہ یہ خوفناک ہے'' بتا رہی ہے.
پہلے تو میں نے جانا کہ شاید میری شکل کے بارے میں اہل انگلستان میں بھی اختلاف رائے ہے لیکن دو تین روز کے بعد معلوم ہوا کہ نہیں یہ تو موسم کے بارے میں رائے دی جا رہی ہے چنانچہ ایک ہی وقت میں ایک انگریز موسم کو گالی دے گا اور دوسرا تعریف کرے گا البتہ یہ ہے کہ ذرا سی دھوپ نے اگر بادلوں اور بارش میں سے جھانک لیا تو پوری انگریز قوم ''ازن اٹ لولی'' گانے لگتی ہے. مجھے ایک اور دشواری یہ پیش آئی کہ اوورکوٹ چڑھا رکھے ہیں اور سرد برفیلی ہوائیں چہرے کو یخ کر رہی ہیں اور شاید بارش بھی ہے اور انگریز پھر بھی بڑے اعتماد سے ''ازن اٹ لولی'' کہتے جاتے ہیں.
ان دنوں تو برطانیہ کے لارڈ میئر بھی پاکستانی ہونے لگے ہیں لیکن ان دنوں برطانوی عوام پاکستان کے بارے میں قدرے غافل تھے، مثلاً پاکستان کے موسم کے بارے میں کچھ اس قسم کی گفتگو ہوتی.
''سنا ہے تمہارا ملک بہت گرم ہے اور خوب دھوپ چمکتی ہے''
''جی ہاں''
''پھر تو سب مزے سے دریا اور سمندروں کے کنارے بیٹھ کر دھوپ سینکتے ہوں گے؟''
''گرمی کچھ زیادہ ہوتی ہے''......

یعنی سوٹ نہ پہنیں تو بھی گذارہ ہو جاتا ہے؟

"جی ہاں..... لیکن گرمی اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے"

"اچھا اچھا یعنی شام کے وقت ایک ہلکے پھلکے سویٹر سے کام چل جاتا ہوگا؟"

ان لوگوں کے ذہن میں اس گرمی کا تصور آ ہی نہیں سکتا جو بھونتی ہے اور جلاتی ہے۔ برطانوی موسم گرما کا آغاز مئی میں ہو جانا چاہیے لیکن ہوتا جون جولائی میں ہے اور کئی مرتبہ بالکل نہیں ہوتا، سردیوں کے بعد سردیاں ہی شروع ہو جاتی ہیں بہرحال انہی دنوں میں ایک مرتبہ میرے کچھ کلاس فیلوز نے مجھے سمندر کے کنارے "گرمیوں کی شب" کی سومنگ پارٹی پر مدعو کیا جس کے لئے مجھے ایک سومنگ کاسٹیوم خریدنا پڑا۔ رات نو بجے سب لوگ ساحل پر جمع ہوئے۔ کپڑے بدلے اور سمندر میں چھلانگیں لگانے لگے ہیں جب کیبن میں سے کاسٹیوم پہن کر باہر نکلا اور ہوا کی وجہ سے میرے گھٹنے بجنے لگے اور بتیسی میرے اختیار سے باہر ہو کر جلترنگ بجانے لگی میں نے ڈبکیاں لگاتی ایک خاتون سے پوچھا کہ بی بی پانی کیسا ہے؟..... وہ کہنے لگی "اواٹس لولی" میں نے غضب کیا اور خاتون کے کہنے پر اعتبار کرتے ہوئے سمندر میں چھلانگ لگا دی..... اس کے بعد ہر قسم کے چراغوں، بلبوں، ٹیوبوں وغیرہ میں روشنی نہ رہی اور میں اگلے تین روز کمبل لپیٹے شوں شوں کرتا رہا اور کانپتا رہا.....

دراصل موسم بھی ذہنی حالت اور خواہش کے اظہار کے طور پر سامنے آتے ہیں کیا ہوا اگر موسم بے حد سرد ہے۔ آپ "اِز اِٹ لولی" کہہ کر اپنے آپ کو خوش تو کر سکتے ہیں۔ اگر پانی بےحد ٹھنڈا ہے تو آپ اسے گرم خیال کیجیے کچھ فرق تو پڑے گا۔ صرف تاریک پہلو دیکھیں گے تو بالآخر کچھ نظر نہیں آئے گا..... ہم ہمیشہ شکایتیں ہی کرتے رہتے ہیں" اواٹس اوفل" سے بات شروع ہوتی ہے۔ کبھی کبھار تو "اِز اِٹ لولی" بھی کہنا چاہیے..... اِز اِٹ لولی؟.....

سانپوں کا ادبی حل

ایک محفل میں ڈر، خوف، دہشت اور خوفناک چیزوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی، جب یہ طے پا چکا کہ حاضرین محفل سب سے زیادہ اپنی بیویوں سے ڈرتے ہیں تو پھر دیگر اشیا اور واقعات بھی زیر بحث آنے لگے۔

کسی نے کہا کہ جناب آپ نے کبھی شیر دیکھا ہے؟ میں نے بھی نہیں دیکھا لیکن سنا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ دہشت ناک جانور ایک شیر ہے۔ اور اس سے زیادہ دہشت ناک دو شیر ہو سکتے ہیں۔

ایک صاحب نے بھوت پریت کے بارے میں چند چشم دید واقعات بیان کئے، اور اپنے سفید بالوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے، حضرات میں جب بھی کسی بھوت وغیرہ کو بچشم خود دیکھتا ہوں تو میرا ایک بال سفید ہو جاتا ہے اب آپ اندازہ کر لیجیے کہ ان بھوتوں کی تعداد کتنی ہو گی جو میں نے ان گنہ گار آنکھوں سے ملاحظہ کیے۔

ایک بزرگ نے بیان دیا کہ جناب! مجھے تو سب سے زیادہ خوف لاش سے محسوس ہوتا ہے۔ کسی نے پوچھا کس کی لاش سے! کہنے لگے کوئی بھی مردہ ہو اسے دیکھتے ہی میری کپکپی بندھ جاتی ہے۔

کسی اہل زبان نے اعتراض کیا کہ بزرگو! وہ گھگھی ہوتی ہے جو بندھ جاتی ہے، کپکپی نہیں۔ بزرگ نے فرمایا کہ یہی تو مزے دار بات ہے کہ مردے کو دیکھ کر

گھگھی تو کھل جاتی ہے لیکن کپکپی بندھ جاتی ہے۔

اس پر حاضرین محفل میں سے کسی ایک نے ایک "مردہ" لطیفہ سنایا۔ ان کا کہنا تھا کہ آزادی سے پیشتر میڈیکل کالج کے چند طالب علم اس موضوع پر بحث کر رہے تھے کہ مردہ جسم سے خوف زدہ ہونا چاہیئے یا نہیں۔ بیشتر افراد نے یہ کہا کہ جناب ہم علم بدن کے طالب علم ہیں اور جانتے ہیں کہ موت کے بعد انسانی جسم میں کچھ نہیں ہوتا۔ وہ چار روز میں خاک ہو جاتا ہے۔ اگر آپ ذبح شدہ بکرے سے خوف نہیں کھاتے تو ایک مردے سے خوف زدہ ہونا چہ معنی؟ لیکن وہاں کچھ نوجوان ایسے بھی تھے جو کہتے تھے کہ جناب سب کچھ ٹھیک ہے، لیکن مردہ پھر بھی مردہ ہوتا ہے، خوف تو آتا ہے؟ جب بحث تیز ہوئی تو کسی صاحب نے تجویز پیش کی کہ جو صاحب مردوں سے بالکل نہیں ڈرتے وہ آج رات مردہ خانے میں جا کر مُردہ نمبر چھ کے اوپر ایک عدد لڈو رکھ کر واپس آ جائیں۔ دوسری صبح ہم جا کر چیک کر لیں گے۔ ایک نوجوان نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں۔ وہ اسی شب ہاتھ میں ایک عدد لڈو پکڑے مردہ خانے میں داخل ہوا۔ وہاں مکمل اندھیرا تھا۔ چنانچہ اس نے ان کے قریب جا کر ان کے بستر نمبر پڑھے اور پھر بستر نمبر چھ پر پڑے ہوئے مردے کے سینے پر لڈو رکھ دیا۔ اسی لمحے چادر ہٹا کر مردہ اٹھ بیٹھا اور بڑے مزے سے لڈو کھانے لگا۔ نوجوان موصوف نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے دوستوں میں سے کوئی ایک اس کے آنے سے پیشتر مردے کی جگہ چادر اوڑھ کر لیٹ گیا تھا۔ ایک اطلاع کے مطابق اس نے لڈو کھاتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ آہا جی! آج تو مُردوں کی عیش ہو گئی۔

اس "مُردہ لطیفے" پر بہت کم لوگ ہنسے اور اس خدشے کا بھی اظہار کیا گیا کہ دراصل وہ سچ مچ کا مردہ ہی تھا جس نے لڈو کھانا شروع کر دیا۔ اور یہ صرف

داستان ہے کہ وہاں کوئی اور لیٹا تھا وغیرہ وغیرہ۔ اور مزید یہ کہ اس لطیفے سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ مردے لڈو شوق سے کھاتے ہیں۔ اس محفل میں چونکہ میں بھی شریک تھا، اس لئے مجھ سے پوچھا گیا کہ تارڑ صاحب آپ تو بقول آپ کے جنگلوں اور صحراؤں میں تن تنہا گھومے ہوئے ہیں، آپ کو سب سے زیادہ کس چیز سے خوف آتا ہے۔ میں نے کہا، سانپ سے۔ اور پھر موقع غنیمت جان کر انہیں اپنے بچپن کا ایک واقعہ سنایا...... میں شاید دوسری یا تیسری جماعت میں تھا ہم لوگ گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران گاؤں چلے گئے۔ اور چونکہ مجھے شروع سے ہی سومنگ وغیرہ کا بہت شوق تھا اس لئے وہاں پہنچتے ہی میں نے مقامی چھپڑ میں نہانا شروع کر دیا۔ اس پر والد صاحب قبلہ نے ہلکی سی مرمت کر دی کہ نالائق گندے پانی میں نہاتا ہے۔ خارش ہو جائے گی۔ اگر اتنا ہی شوق ہے تو جا ادھر کھیتوں میں وہاں کپاس کو پانی لگا رکھا ہے، وہاں نہا لے۔ چنانچہ میں چھپڑ سے نکل کر اسی قدرتی حالت میں کپاس کے کھیت میں چلا گیا۔

اب وہاں یہ پرابلم تھی کہ پانی میرے گھٹنوں تک بھی نہیں آتا تھا۔ اس لئے ڈبکی تو لگ نہیں سکتی تھی، میں نے چلو سے اپنے آپ کو گیلا کرنے یا ڈبونے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ جوں جوں پانی خشک کھیت میں پھیلتا جاتا ہے توں توں اس کھیت میں کچھ ہلچل سی مچی جاتی ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ پانی آہستہ آہستہ جنگلی چوہوں کے بلوں میں داخل ہوتا جاتا تھا اور چوہے ہراساں ہو کر باہر نکلتے اور دوڑ لگا دیتے۔ اب مجھے بھی ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ میں کسی سوراخ میں پانی ڈالتا جاتا اور پھر یکدم کوئی موٹا سا چوہا اس میں سے پھدک کر باہر نکلتا اور ہوا ہو جاتا۔ چند چوہوں کو ان کے آرام وہ گھروں سے نکال کر میں ایک اور سوراخ میں پانی ڈال رہا تھا کہ اس میں سے ایک ایسا چوہا نکلا جو

نکلتا ہی چلا گیا۔ قابل فہم طور پر یہ ایک سانپ تھا اور چوہا نہیں تھا۔ میں نے بڑی مردانگی سے اسے گردن سے پکڑ لیا اور پھر بڑے آرام سے ایک پتھر کی مدد سے اسے کچل دیا۔ اور اس کے بعد اس کی دہشت سے مجھے بخار ہو گیا...... حاضرین محفل اس خوفناک قصے کو سن کر بے حد خوف زدہ ہوئے اور ان سب نے اقرار کیا کہ واقعی دنیا کی سب سے دہشت ناک شے سانپ ہے...... ویسے تو یہ قصہ سو فی صد سچ ہے لیکن آپ کے سامنے یہ اقرار کرتا ہوں کہ فرط جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے تھوڑی سی گپ لگائی تھی' اور وہ بھی قصے کے آخر میں۔ یعنی میں ایک سوراخ میں پانی ڈال رہا تھا کہ اس میں سے کوئی شے باہر آنے لگی۔ میں نے سمجھا کہ سانپ ہے۔ چنانچہ یہ بندہ حقیر اسی حالت میں ننگ بہ ننگا گاؤں کی طرف بھاگ گیا' اور اسی خوف کی شدت سے بخار ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ادھر سانپ وغیرہ بالکل نہیں ہوتے اور جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ ایک مونچھوں والا عام سا چوہا تھا۔ آج بارے سانپوں کے جو کچھ بیان ہو رہا ہے اس کا بھی ایک ہلکا سا پس منظر ہے۔ ایک تو امریکہ کے ایک چڑیا گھر کی خبر بھی جس میں آنے والے ایک تماشائی نے شکایت کی کہ چڑیا گھر کی انتظامیہ اس کے ساتھ دھوکہ کرتی رہی ہے۔ کیونکہ جس سانپ کو سانپ بنا کر بٹھایا گیا ہے وہ ہے تو سانپ لیکن ربڑ کا بنا ہوا ہے انتظامیہ کا کہنا ہے کہ اس آب و ہوا میں سانپ زیادہ دیر زندہ نہیں رہتے اس لئے ہم نے پبلک کو مایوس کرنے کی بجائے یہ مناسب جانا کہ سچ مچ کے سانپ کی جگہ وہاں ربڑ کا سانپ رکھ دیا جائے... دراصل چڑیا گھر کی انتظامیہ کو یہ اُمید نہ تھی کہ کوئی تماشائی باقاعدہ ان کے سانپ کو ٹٹولے گا اور جان جائے گا کہ یہ تو ربڑ ہے کیونکہ اس میں جان بھی جا سکتی تھی۔ اگر سانپ سچ مچ کا ہوتا تو پھر وہ صاحب اسے ٹٹولتے تو ان کی قبر پر کچھ اس قسم کا کتبہ تحریر ہوتا "ان صاحب کا خیال تھا کہ سانپ ربڑ کا ہے۔"

بہر حال یہ تذکرہ تو امریکی سانپوں کا ہے جو بہت اعلیٰ نسل کے ہوتے ہوں گے۔ لیکن ہمارے پاس حوالے کے لئے خالص پاکستانی بلکہ لاہوری سانپ بھی موجود ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے بابے نذیر کو اپنے آس پاس پایا ہے۔ بابے نذیر کے بارے میں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اگر کل کلاں، خدانخواستہ کل کائنات کسی عالمی جنگ کی حماقت سے نیست و نابود ہو جائے اور صرف بابا نذیر زندہ بچ جائے تو ان تمام اشیاء کو پھر سے "ایجاد" کرے گا جو اس زمین میں زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ ایک گھر بنا سکتا ہے، کیونکہ وہ راج گیری میں شدھ بدھ رکھتا ہے۔ پھر زمین میں فصل اگا سکتا ہے کیونکہ کھیتی باڑی بھی اس کا پیشہ رہا ہے۔ کھیتی باڑی کے لئے اوزار بنا سکتا ہے۔ اگر کہیں سے دو پہیے مل جائیں تو سائیکل بنا سکتا ہے...... کھانا پکا سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ...... بہر حال یہی بابا نذیر جو ہمہ وقت مسکراتا رہتا ہے اور اسے زندگی سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی' چند روز پیشتر یک دم سنجیدہ موڈ میں پایا گیا تو میں نے پوچھا" بابیو! کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں" بابے نے سر جھکا کر کہا۔

"کچھ تو ہے۔"

"کچھ بھی نہیں"

"یار، بتا دو کیا بات ہے؟ ہو سکتا ہے میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔"

"تم نہیں کر سکتے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا...... تم بتاؤ تو سہی!"

"بتا دوں؟"

"ہاں! بتا دو"

"میرے گھر کی چھت سے سانپ لٹکتے ہیں۔"

"سانپ؟"

"ہاں...... موٹے موٹے بھورے رنگ کے...... چھت کے شہتیروں کے اندر رہتے ہیں اور صبح صبح شہتیروں کے ساتھ لٹکنے لگتے ہیں۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ سانپ ہی ہیں؟ میرا مطلب ہے سفید رنگ کے پرانے رسّے وغیرہ تو نہیں؟"

"تم خود آکر دیکھ لو کسی وقت۔"

اب ظاہر ہے مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں کہ میں اس کے گھر جا کر ان سانپوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھوں کہ سچ مچ کے ہیں یا نہیں لیکن بابا ان کے جھولنے سے بے حد اپ سیٹ ہے۔ اس کا بیٹا اور بہو اسی روز مکان چھوڑ کر چلے گئے جس روز سانپوں کی جوڑی نے اپنا پہلا درشن کروایا تھا۔ بابا اس مکان کو چھوڑنا نہیں چاہتا اور اس میں رہتے ہوئے اسے خوف بھی محسوس ہوتا ہے۔

"اب بتاؤ تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

بابے کے اس سوال پر میں خاموش ہو گیا۔ اب آپ ہی بتایئے کہ اگر کسی شخص کے گھر میں سانپ جھولتے ہوں، اس کی آپ کیا مدد کر سکتے ہیں۔ اس دوران ذوالفقار احمد تابش ادھر آ گیا۔ اس سے پوچھا کہ بھئی تم بابے کے لئے کچھ کر سکتے ہو؟ اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ تب بابے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ تابش صاحب جب آتے ہو، چائے پلاتا ہوں، پکوڑے لا کر دیتا ہوں، تمہاری ہومیوپیتھک دوائیاں لا کر دیتا ہوں۔ میرا یہ کام ضرور کر دو۔ "تابش نے پوچھا، مثلاً میں کیا کر سکتا ہوں؟" بابا کہنے لگا تم میرے گھر جا کر ان سے بات تو کرو۔ ہو سکتا ہے تمہیں دیکھ کر وہاں سے چلے جائیں۔ تابش کو یہ تجویز پسند نہ آئی۔ البتہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "تارڑ! ہمیں

اس مسئلے کا ادبی حل ڈھونڈنا ہو گا۔

"ادبی حل؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ہاں" تابش اپنے ادھ رنگے بالوں میں اُنگلی چلاتے ہوئے بولا "سانپوں کو بھگانے کے لئے ہم مختلف قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر سکتے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ تم جا کر انہیں اپنا کوئی سفرنامہ سنا دو۔"

"یہ تجویز مجھے پسند نہیں۔"

"تو پھر احمد داؤد اور رشید امجد کو پنڈی سے بلا کر انہیں کوئی جدید افسانہ سنایا جائے۔"

"پنڈی سے آنے جانے پر خرچ بہت ہو گا۔"

"کشور ناہید کو کہتے ہیں وہ انہیں نثری نظم کے بارے میں لیکچر دے۔"

"نہیں یار۔"

"تو پھر چچا انتظار حسین کو کہتے ہیں کہ وہ انہیں چند محاورے سنائے۔"

"نہیں بھائی، وہ اہلِ زبان نہیں ہیں۔"

"امجد اسلام امجد کو بلا کر کہتے ہیں کہ لو بھئی! انہیں تم وہی والے لطیفے سنا دو جو تم ہمیں سناتے ہو۔"

"سانپوں میں حسِ مزاح بہت کم ہوتی ہے۔"

"اگر وزیر آغا ان دنوں یہاں ہوں تو ان سے کوئی انشائیہ سنوا دیا جائے؟"

"نہ"

"اظہر جاوید کو بلا لیں؟"

"سانپ مادہ نہیں ہیں۔"

"اصغر ندیم سید کو کہتے ہیں کہ وہ ان کے سامنے اپنا کوئی سا ڈرامہ پڑھے......

اور........"

"ٹھہرو، ٹھہرو" بابا اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہوا "یہ تم میرے سانپوں کے بارے میں کیا اوٹ پٹانگ منصوبے بنا رہے ہو، کمال ہے۔ آخر وہ سانپ ہیں، ٹی ہاؤس کے ادیب تو نہیں کہ ان کے ساتھ اس قسم کی زیادتی کی جائے...... مجھے نہیں منظور تمہاری یہ تجویزیں...... میں اپنے سانپوں پر یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتا..... ٹھیک ہے لٹکتے رہیں شہتیروں کے ساتھ۔ مجھے کیا کہتے ہیں؟" یہ کہہ کر بابا واک آؤٹ کر گیا۔

اگر کسی صاحب کے پاس شہتیروں سے لٹکنے والے سانپوں کے بارے میں اس کے علاوہ کوئی اور تجویز ہو تو براہ کرم مجھے ارسال کر دیں، شکریہ!

آکٹوپس کھاتے ہو شرم نہیں آتی؟

"بیگم کیا میں کُتا خور ہوں؟"

"ہیں ہیں کیا کہہ رہے ہو......؟" بیگم کی غصیلی آواز باورچی خانے میں سے آئی۔

"کہہ میں یہ رہا ہوں کہ کیا میں کتے کھاتا ہوں؟"

بیگم چائے کی پیالیاں اور ٹوسٹ ایک چھابے میں رکھے باورچی خانے میں سے باہر آئی اور مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتی ہوئی کہنے لگی "صبح ناشتے کے وقت تو کوئی ہوش کی بات کیا کرو، کتوں کی بات تو نہ کیا کرو۔"

"بس تم مجھے یہ بتا دو کہ کیا میں کُتے کھاتا ہوں؟"

"...... ظاہر ہے کہ نہیں......؟"

"تو پھر مجھے شرم نہیں آنی چاہیے...... ٹھیک ہے ناں؟"

بیگم نے قدرے فکر مند ہو کر میری طرف دیکھا اور پھر چینی چائے میں ڈال کر پیالی میرے آگے کر دی۔ میں ناشتہ کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد بیگم نے انتہائی سنجیدگی سے میرے چہرے کا معائنہ کیا اور پھر کہنے لگی "یہ کیا بات کی تھی تم نے کہ تمہیں شرم نہیں آنی چاہیے؟"

"اوہ" میں نے اخبار پر سے نظریں اٹھائیں "کتے کھانے والوں کو شرم آنی چاہیے اور چونکہ میں کتے نہیں کھاتا اس لیے مجھے تو شرم نہیں آنی چاہیے...... ٹھیک ہے ناں؟...؟"

اس پر بیگم نے جن نگاہوں سے مجھے دیکھا وہ پکار پکار کر خلقِ خدا سے کہہ رہی تھیں کہ میرے میاں کا کچھ کرو یہ میٹر ہو گیا ہے.....

"ٹھیک تو ہے"..... وہ کہنے لگی..... "لیکن یہ خیال تمہیں آیا کیسے؟

تب میں نے اسے وہ خبر دکھائی جس کی سرخی تھی "کتے کھانے والوں کو شرم آنی چاہیئے" اور جس میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ فلپائن کے نائب وزیر دفاع کو امریکہ اور یورپ سے اسّی ہزار کارڈ موصول ہوئے ہیں اور ان تمام کارڈوں پر ایک ہی تصویر بنی ہوئی ہے جس میں ایک کُتا روسٹ کیا جا رہا ہے۔ اور نیچے درج ہے "کتوں کا قتل عام بند کرو" چونکہ فلپائن میں کتے نہایت شوق سے کھاتے ہیں اس لئے یہ کارڈ یورپ اور امریکہ کے "ڈوگ لورز" کی جانب سے احتجاج کے طور پر روانہ کیے گئے۔

"تم کبھی کبھی شاید کوّے کھا جاتے ہو کیونکہ باتیں بہت کرتے ہو لیکن کم از کم کتے نہیں کھاتے ہو" بیگم نے ہنس کر کہا اور یہ ایک نادر ہنسی تھی کیونکہ بیگم ہنسنے پر یقین نہیں رکھتی۔ اس کا کہنا ہے کہ شادی سے پیشتر اس نے جتنا ہنسنا تھا ہنس لیا۔

"تو پھر مجھے شرم کیوں آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا..... میں مجرم کیوں محسوس کر رہا ہوں"

بیگم چپ ہو گئی۔ سوچا اور پوچھنے لگی "تم پتہ نہیں کہاں کہاں کی خاک چھانتے رہے ہو اور سیاحت کے دوران پتہ نہیں کیا کیا بلا کھاتے رہے ہو..... کہیں اس دوران....."

نہیں نہیں" میں نے فوراً کہا" میں نے زیادہ سے زیادہ گھوڑا کھایا ہے یا آکٹوپس اور وہ بھی غلطی سے رکتا ہرگز نہیں کھایا"

میری بیگم ناشتے کی میز سے اٹھی اور ابکائیاں لیتی ہوئی منہ پر ہتھیلی رکھے باورچی خانے کی طرف بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئی اور غصے سے کہنے لگی "غضب خدا کا گھوڑے کھاتے رہے ہو؟"

"گھوڑے نہیں صرف ایک گھوڑا۔ اور وہ بھی پورا نہیں بلکہ دو چار ماشے گھوڑا.....

ہوا یوں بیگم کہ ایک مرتبہ جنیوا سوئٹزرلینڈ میں جھیل کنارے ایک ریستوران میں گیا اور وہاں پو والوں کی ایک ڈش منگائی جس میں گوشت کے چھوٹے چھوٹے چار پانچ ٹکڑے تھے..... میں نے ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا تو وہ قدرے سخت تھا اور اسی وقت مجھے کچھ شک ہوا کہ یہ گوشت کہیں غلط قسم کا گوشت نہ ہو..... ویٹر سے پوچھا تو اس نے فرانسیسی میں کچھ بتایا..... میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے ریستوران کے سامنے ایک مجسمے کی جانب اشارہ کیا جو گھوڑے پر سوار ایک ایسے صاحب کا تھا جن کا ایک ہاتھ تلوار کے دستے پر تھا اور دوسرا شاید مجھے ہی سلام کر رہا تھا۔

"یہ گھوڑے کا گوشت ہے؟" میں نے ہراساں ہو کر پوچھا اور ویٹر نے خوش ہو کر سر ہلا دیا..... بس میں نے اتنا سا گھوڑا کھایا ہے آج تک"

بیگم پھر ابکائیاں لے رہی تھی اور ان کے دوران اس نے صرف تین لفظ کہے "اور وہ آکٹوپس؟

ہاں وہ" میں نے خوش ہو کر کہا" ہسپانیہ میں ایک مرتبہ بہر حال وہ بھی غلطی سے ہی کھایا تھا..... ویسے بھی سمندری جانور تو حلال ہوتا ہے....."

"وہی ناں..... ہزاروں ٹانگوں والا خوفناک....."

"ہاں ہاں وہی....." میں نے مزید خوش ہو کر کہا۔

"گھوڑے کھاتے ہو شرم نہیں آتی؟" بیگم نے ایک ابکائی لی، ایک مکہ میز پر مارا، اور اٹھ کھڑی ہوئی "اور آکٹوپس کھاتے ہو شرم نہیں آتی؟"

"بھئی پورا گھوڑا تو نہیں کھایا تھا، قسم لے لو.....؟

"مجھے نہیں معلوم تھا میرے ساتھ جس شخص کی شادی ہوئی ہے وہ گھوڑے کھاتا ہے ہائے میری قسمت..... خبردار جو ہمارے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا

تو..... توبہ توبہ آکٹوپس..... توبہ توبہ...... گھوڑے کھانے والوں کو شرم آنی چاہیئے۔" یہ کہہ کر بیگم واک آؤٹ کر گئی.....؟

"لوکتے کھانے والوں کو تو شرم نہیں آتی اور میں نے تو پندرہ برس پہلے ایک دوماشہ گھوڑا کھایا تھا..... مجھے کیوں شرم آئے"..... میں نے روسٹ منہ میں ڈالا تو وہ ٹھنڈا ہو کر کتے کے گوشت کی طرح سخت ہو چکا تھا۔

میرا بہترین دوست غلام رسول

یہ دو چار برس پہلے کی بات نہیں ہے تقریباً تیس برس پہلے کا قصہ ہے۔ سکول کا زمانہ تھا۔ گھر سے سکول جاتے ہوئے ایک ہلکے بخار کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ اشیاء اور محسوسات کی نئی نئی پہچان ہو رہی تھی اور اگر اس روز گھر کا کام" مکمل نہیں ہوتا تھا ہلکے بخار کے ساتھ ساتھ ٹانگیں بھی کانپ رہی ہوتی تھیں کیونکہ "مولا بخش" ان دنوں متروک نہیں ہوا تھا اور ماسٹر حضرات موقع محل کی مناسبت سے یا اپنی من مرضی سے اس کا استعمال والہانہ طور پر کیا کرتے تھے۔ انگریزی اور اردو کی پڑھائی میں "جواب مضمون" لکھنا بے حد اہمیت کا حامل تھا۔ دوسرے سوالوں کی نسبت اس کے نمبر بھی زیادہ ہوتے تھے چنانچہ جس لڑکے کو زیادہ سے زیادہ جواب مضمون یاد ہوتے تھے وہی لائق ترین شہرتا تھا ان جواب مضمونوں میں "ریلوے سٹیشن" "ایک پکنک" "میرا بہترین دوست" "ایک کرکٹ میچ" "میرا پسندیدہ استاد" وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ اس زمانے میں انہیں جواب مضمون ہی کہا جاتا تھا بعد میں یہ انشائیے بن گئے۔ ہم سب حسب مقدور ان جواب مضمونوں کے رٹے لگاتے اور اگر قسمت یاوری کرتی تو ہمارے یاد کیے ہوئے ان انشائیوں میں سے کوئی ایک سالانہ امتحان میں آجاتا اور ہم بخیر و عافیت پاس ہو جاتے۔ ہمارے انگریزی کے ٹیچر مشتاق نامی ایک لڑکے سے بے حد بیزار تھے۔ مشتاق کا کمال یہ تھا کہ وہ اسے جو بھی جواب مضمون لکھنے کو کہتے وہ کسی نہ کسی

طرح اس میں "میرا بہترین دوست" ضرور فٹ کر دیتا کیونکہ یہ وہ واحد جواب مضمون تھا جو اسے فر فر یاد تھا۔ مثلاً اسے اگر کہا جاتا کہ "ریلوے سٹیشن پر" مضمون لکھو تو وہ کچھ یوں شروع ہوتا۔ "میں اور میرے ماں باپ پھپھو کی ملیاں جانے کے لئے ریلوے سٹیشن گئے وہاں گاڑی کھڑی تھی اور گاڑی میں میرا بہترین دوست غلام رسول بیٹھا تھا۔ غلام رسول میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بھائی بہن ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں ہے۔ غلام رسول بہت اچھا لڑکا ہے۔۔۔۔۔ غلام رسول۔۔۔۔۔"

اگر اسے "میرا پسندیدہ استاد" پر مضمون لکھنے کو کہا جاتا تو وہ کچھ یوں شروع ہوتا ۔۔۔۔۔" ماسٹر افتخار میرے پسندیدہ استاد ہیں۔ ایک روز میں ان کے گھر گیا وہاں میرا بہترین دوست غلام رسول بیٹھا تھا غلام رسول میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بھائی بہن ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس۔۔۔۔۔ اور غلام رسول۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ جب کبھی "ایک کرکٹ میچ" یا "ایک پکنک" کی باری آتی تو غلام رسول وہاں بھی موجود ہوتا۔۔۔۔۔ ایک روز تنگ آ کر ماسٹر افتخار نے کہا "دیکھو مشتاق یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ہر جگہ تمہارا دوست غلام رسول موجود ہو۔۔۔۔۔ آج تم "ہوائی جہاز کا ایک سفر" پر مضمون لکھو اور یاد رکھو کہ غلام رسول ہوائی جہاز میں نہیں ہے۔" دوسرے روز مشتاق "ہوائی جہاز کا ایک سفر" پر جو مضمون لکھ کر لایا وہ کچھ اس طرح کا تھا۔۔۔۔۔ "میں اپنے ماں باپ کے ساتھ ایئرپورٹ پر گیا وہاں جہاز کھڑا تھا۔ جہاز کے دو پر تھے، ہم اس میں بیٹھ گئے۔ جہاز میں غلام رسول نہیں تھا۔ ۔۔۔۔ پھر جہاز اڑنے لگا۔ میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا تو میں نے دیکھا کہ زمین پر میرا بہترین دوست غلام رسول جا رہا ہے۔ غلام رسول میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بھائی بہن ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس۔۔۔۔۔ اور غلام رسول۔ غلام رسول ۔۔۔۔۔" ماسٹر افتخار نے یہ مضمون پڑھ کر مولا بخش پکڑ لیا اور مشتاق غریب کا جلوس

نکال دیا۔

مشتاق اور اس کے اکلوتے جواب مضمون "میرا بہترین دوست" کی یاد آنے کا سبب شیخ غلام احمد گل صاحب کا ایک خط ہے جو وزیر آباد سے مجھے وصول ہوا ہے۔ گل صاحب نے لکھا ہے۔۔۔۔ "محترم تارڑ صاحب۔۔۔۔۔ آپ کا کالم "ہر فن مولا" کے حوالے سے پڑھا۔ جہاں آپ نے مختلف "مولوں" کی نشاندہی کی ہے وہاں آپ "رولوں" کو بالکل بھول گئے۔ ایک ہوتے ہیں "ہر فن مولا" اور ایک ہوتے ہیں "ہر فن رولا" یہ حضرات اپنے آپ کو دنیا کے ہر موضوع پر اتھارٹی سمجھتے ہیں۔ اور جو بھی فن سامنے آئے اس میں رولا پا دیتے ہیں۔۔۔"

مشتاق بے چارہ بھی اپنے زمانے کا ایک چھوٹا سا "ہر فن رولا" تھا۔ اسے صرف ایک مضمون "میرا بہترین دوست" یاد تھا۔ جو وہ ہر مضمون میں فٹ کر دیتا تھا اور مار کھاتا تھا۔ لیکن آج زندگی کے تمام شعبوں میں بے شمار "ہر فن رولا" موجود ہیں جنہیں صرف ایک "میرا بہترین دوست" یاد ہے اور وہ اسے پوری زندگی جلسوں، محفلوں اور مضامین میں سناتے رہتے ہیں اور پھر بھی مار نہیں کھاتے۔ ان میں ادیب، سیاستدان اور سرکاری افسر سبھی شامل ہیں۔ موضوع "علامہ اقبال اور خودی کا فلسفہ" ہو "مرغبانی میں مرغوں کا مقام" یا "معاشرے میں منشیات کی لعنت" وہ دو چار فقرے کہنے کے بعد اپنا "بہترین دوست" نکالتے ہیں اور فٹ کر دیتے ہیں۔ البتہ ہر ایک کا "میرا بہترین دوست" مختلف ہوتا ہے۔۔۔۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں آج ایک نہایت بلند پائے کا کالم "ترقی پذیر ممالک میں تعلیم کی افادیت" کے عنوان سے لکھوں اور قارئین کو اپنی بصیرت اور وسیع مطالعہ کے زور پر متاثر کروں۔ تو جناب کالم ملاحظہ فرمایئے۔۔۔۔۔ "ترقی پذیر ممالک میں تعلیم کی افادیت ایک ایسا موضوع ہے جس پر اگر آج غور نہ کیا گیا تو ہماری آئندہ نسلیں ہمیں کبھی

معاف نہیں کریں گی، تعلیم میں افادیت سے کس کافر کو انکار ہوگا، تعلیم ایک زیور ہے، جس کی بہت افادیت ہے۔ اور افادیت وہ چیز ہے جو تعلیم کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی، تعلیم کی افادیت کے بارے میں مزید کچھ کہنے سے پہلے میں یہ عرض کروں گا کہ ایک روز میں بازار میں جا رہا تھا کہ وہاں مجھے "میرا بہترین دوست" غلام رسول مل گیا...... غلام رسول میرا کلاس فیلو تھا، اس کے تین بھائی بہن ہیں، اس کا باپ محکمہ پولیس میں ہے، غلام رسول بہت اچھا لڑکا ہے......
غلام رسول...... غلام رسول......

"میرا بہترین دوست...... غلام رسول!"



کا باڈی کا باڈی

آج اخبار میں ایک سرخی نظر آئی اور ناقابل یقین نظر آئی چنانچہ میں نے آنکھیں جھپک کر اسے دوبارہ پڑھا "پاکستان اور انگلینڈ کے مابین ۲۶ جون کو پہلا کبڈی ٹیسٹ کھیلا جائے گا"...... میں نے سوچا ضرور کاتب کی غلطی ہے اس کا شین قاف درست نہیں ہے کرکٹ کو کبڈی لکھ گیا ہے کیونکہ دونوں کا آغاز "ک" سے ہوتا ہے لیکن سرخی کے نیچے خبر پڑھی تو معلوم ہوا کہ نہیں کاتب کا شین قاف تو درست ہے البتہ انگریزوں کی مت ماری گئی ہے اور وہ اپنے اوور کوٹ بھاری اونی سویٹر جرابیں اور برساتیاں وغیرہ اتار لنگوٹ پہن کبڈی کھیلنے کے لئے میدان میں اتر آئے ہیں اور ہمارے مقابل میں اتر آئے ہیں ظاہر ہے بری طرح مار کھائیں گے لیکن پھر خیال آیا کہ انگریز صاحب بہادر کوئی بھی کام بلا سوچے سمجھے نہیں کرتا اگر جلیانوالہ باغ میں دو ہزار "بھورے باسٹرڈز" کو بھون کر رکھ دیتا ہے تو اس میں بھی کوئی مصلحت کارفرما ہوتی ہے اور برطانوی عوام جنرل ڈائر کے لئے ہزاروں پاؤنڈ چندہ جمع کرتے ہیں اور اسے اپنا ہیرو قرار دیتے ہیں...... تو پھر یہ گورے حضرات کبڈی کی طرف کیسے آگئے تو ہم سے جیتیں گے کیسے...... اس کا جواب اس نکتے میں ہے کہ پہلا کبڈی ٹیسٹ پاکستان میں نہیں بلکہ انگلستان میں کھیلا جا رہا ہے، اور مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ ماہ جون میں بھی انگلستانی موسم بے حد گیلا اور سرد ہو سکتا ہے چنانچہ ہمارے نوجوانوں کو کیچڑ بھرے میدانوں میں اتار دیا جائے گا اور وہاں یخ بستہ ہواؤں میں کانپنے لگیں گے اور "کبڈی کبڈی" کہنے کی بجائے "کب کب ڈی

ڈی ڈی" کرنے لگیں گے کیونکہ ان کے دانت بج رہے ہوں گے۔

ادھر سے انگریز حضرات "کا باڈی کا باڈی" کے نعرے لگائیں گے..... اور یہ وہ نعرہ ہے جو انہوں نے شاہجہان کے عہد میں لگانے کی اجازت چاہی تھی کہ حضور ہم تو ادھر ذرا گھومنے پھرنے اور کھیلنے آئے ہیں بس اجازت دینے کی دیر تھی وہ برصغیر کے ایک کونے سے "کا باڈی کا باڈی" کرتے دوڑے اور دوسرے سرے تک جا کر کہنے لگے کہ لو جی اب یہ علاقہ ہمارا ہے اور پھر وہ ۱۹۴۷ء تک تن تنہا اس میدان عظیم میں کا باڈی کھیلتے رہے اور جو کوئی بھی مقابلے میں اترتا اس کے لئے کوئی نہ کوئی جنرل ڈائر تیار رکھتے اس دوران یورپ کے میدان میں ہٹلر اتر آیا اور انگلش کو بوڈی" کے نعرے لگانے لگا..... امریکیوں، روسیوں اور انگریزوں نے مل ملا کر اس نئے کوڈی شاہ کو اکھاڑے سے باہر کر دیا، ہمارے دیہات میں اکثر اوقات کبڈی کے کسی اچھے کھلاڑی کا نام کوڈی شاہ پڑ جاتا ہے) دوسری جنگ عظیم میں انگریز ہٹلر جیتنے کے باوجود بری طرح "ہف" گئے اور ان کا سانس اکھڑنے لگا..... اور کبڈی میں پکے سانس کی ضرورت ہوتی ہے ادھر غلام قوموں کے سانس مضبوط ہو چکے تھے اور انہوں نے انگریز کوڈی شاہ کو اپنے اپنے ملکوں سے نکال باہر کیا..... اب ایک عرصے کے بعد انگریزوں کو کوڈی کھیلنے کا خیال آیا ہے ظاہر ہے وہ دن گئے جب وہ مدمقابل کے ہاتھ باندھ کر اس کے گرد ناچتے ہوئے "کا باڈی کا باڈی" کہا کرتے تھے اور اپنی فتح کا آپ ہی اعلان کیا کرتے تھے..... اب تو وہ میدان میں آئیں گے اور میرا کالا ہے دلدار گوریاں نوں پراں کرو..... کے نعرے گونجیں گے بے شک وہ کیچڑ بھرے میدانوں میں ہمیں اتاریں اور سرد ہواؤں کے بیچ کھڑا کر دیں جیت ہماری ہی ہوگی کیونکہ ہمارا سانس زیادہ مضبوط ہے ہمارا بدن صحت مند اور جوان ہے اور انگریز کوڈی شاہ اب بوڑھا ہو چکا ہے..... کا باڈی کا باڈی کا باڈی۔

میں اولی اللہ ہو گیا ہوں

مجھ میں جو کچھ بھی رونما ہوا ہے آج صبح ناشتے کے بعد ہوا ہے ناشتے سے قبل میں ایک نارمل پاکستانی تھا۔ اپنی بیوی اور اپنے حال پر صابر و شاکر..... البتہ مرد ہونے پر نازاں اور اس خیال کا اسیر کہ میں اپنی زندگی کے تمام فیصلے خود کرتا ہوں میری بیوی جو کہ صنف نازک ہے اپنی زندگی کے فیصلے کروانے کے لئے میری طرف دیکھتی ہے۔ بہرحال میں بالکل ٹھیک تھا اور نارمل تھا.....

ناشتے کے بعد مجھے کچھ شک ہونے لگا۔ ایک تو انگڑائیاں بہت آنے لگیں میری بیوی کہنے لگی کہ یہ نئی شرٹ پہن کر آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ اس تعریف پر میں بری طرح شرما گیا اور میرا چہرہ چقندر سرخ ہو گیا اور میں نے لجا کر کہا "ہٹو جی مجھ سے مذاق نہ کیا کرو..... ہاں" مجھے اتنی شرم آئی کہ اگر مجھے کوئی دوپٹہ مل جاتا تو اسے اوڑھ کر بیٹھ جاتا بلکہ ایک لمبا گھونگھٹ نکال کر بیٹھ جاتا۔

کپڑے تبدیل کرتے ہوئے بھی میں نے دروازہ پہلے مقفل کر لیا۔ گھر سے باہر جانے لگی..... میرا مطلب ہے جانے لگا تو ذرا خوف سا محسوس ہوا کہ ہائے اکیلا جا رہا ہوں، زمانہ بڑا خراب ہے..... سڑک پہ آیا تو نظریں جھکا کر چلنے لگا اور ایک کھمبے سے ٹکراتا ٹکراتا بچا، مارکیٹ میں پہنچا تو وہاں پان سگریٹ کی دکان سے ایک گانے کے بول بلند ہوئے نہ تم بے وفا ہو نہ ہم بے وفا ہیں..... یہ گانا سن کر جانے کیوں میں تو نروس ہو گئی..... میرا مطلب ہے ہو گیا اور سوچا کہ یہ دنیا اور یہ دنیا والے اتنے بے وفا کیوں ہوتے ہیں ہائے اتنے بے وفا دل توڑ

دیتے ہیں اللہ قسم۔

بس سٹاپ پر پہنچا تو دیوار کے ساتھ چند خواتین بس کا انتظار کر رہی تھیں میں ان کے قریب ہو کر کھڑا ہو گیا کیونکہ دوسری طرف تو نگوڑے مرد کھڑے تھے اور دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ خواتین مجھے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہیں اور ان میں سے ایک مائی کہنے لگی، "وے بے شرما شرم نہیں آتی اودھر جا کر کھڑا ہو مر"...... چنانچہ میں مجبوراً ادھر کھڑا ہو مر گیا۔ بس آئی تو تقریباً خالی تھی۔ میں آرام سے ایک نشست پر بیٹھ گیا۔ اگلے سٹاپ پر ایک نوجوان بس کے اندر آیا اور کمینہ میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے فوراً اسے کہا "آپ ادھر بیٹھو جی ہمارے ساتھ نہ بیٹھو"...... وہ قدرے حیران تو ہوا لیکن اٹھ کر اگلی نشست پر جا بیٹھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میری آواز کچھ سریلی ہوتی جاتی ہے.... آپ کا کیا خیال ہے کہ میں مذاق کر رہا ہوں اور یہ سب کچھ میرے ساتھ نہیں ہوا؟ ...... اب میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ بالکل یہی واردات ہوئی ہے.....

جب شہر پہنچا تو رش بہت تھا اور مجھے بیچ بیچا کے گذرنا پڑا پھر بھی ایک دو کندھے لگ گئے...... میو ہسپتال کی دیوار کے ساتھ پرانے فراکوں اور دیگر نیم زنانہ ملبوسات کی فروخت جاری تھی۔ میں جانے کیوں خاصی دیر وہیں کھڑا انہیں بے حد دلچسپی اور اپنائیت سے دیکھتا رہا۔

دکان پر بھی حالات کچھ مختلف تھے مثلاً ایک چھوٹے سے چوہے کو دیکھ کر میں اچھل پڑا اور "اوئی اللہ" کہہ کر کرسی پر چڑھ گیا...... مجھے جب گرمی کی وجہ سے نیند آنے لگی تو جماہیوں کی بجائے انگڑائیاں لینے لگا...... جی ہاں آج سارا دن میرے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ ان دنوں جو ناول لکھ رہا ہوں اس کا کوئی زنانہ کردار مجھ پر حاوی ہو رہا ہے لیکن جب میں نے بے اختیار "ہوا میں اڑتا جائے میرا

لال دوپٹہ ململ کا...... ہو جی!...... قسم کا فلمی گانا گنگنانا شروع کیا تو جان گیا کہ بقول شیکسپیئر "سم تھینگ از راٹن ان دی سٹیٹ آف ڈنمارک"...... مجھے کچھ ہو گیا ہے۔

مجھ میں کچھ تبدیل ہونے کو تھا کچھ رونما ہو رہا تھا...... لیکن کیا؟ ناشتے سے پیشتر میں ایک نارمل پاکستانی مرد تھا اور ناشتے کے بعد...... اب آپ سے کیا پردہ ہائے اللہ کہ آج ناشتے کے دوران میں نے مندرجہ ذیل خبر پڑھی تھی....

"رنگون سری لنکا کے ایک طبی ماہر نے اس قیاس کو لاعلمی پر مبنی قرار دیا ہے کہ عورت صنف نازک ہوتی ہے ڈاکٹر ڈینس جے الوئیس نے ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہر مرد اپنی زندگی کے ابتدائی بیس سال ماں کی نگرانی میں گزارتا ہے اس کے متعلق سارے فیصلے ماں کرتی ہے اور شادی کے بعد ان فیصلوں کا اختیار بیوی کے پاس چلا جاتا ہے یہ کام بیوی وہیں سے شروع کرتی ہے جہاں سے ماں چھوڑتی ہے، خلیج سے شائع ہونے والے ایک جریدے کے مطابق ڈاکٹر الوئیس نے کہا کہ بعد ازاں اس اختیار میں بیٹی بھی شریک ہو جاتی ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا کہ عورت نہیں بلکہ مرد صنف نازک ہے"

اور تب سے میں اوئی اللہ اور ہائے اللہ ہوا جا رہا تھا۔ مجھ سے دھوکا ہوا فریب ہوا میں لٹ گیا لوگو...... مجھے یہی کہا جاتا رہا کہ عورت صنف نازک ہے اور آج اس عمر میں جب بال تیزی سے سفید ہو رہے ہیں مجھے یہ بتایا جاتا ہے کہ میں اوئی اللہ ہوں اور صنف نازک ہوں...... اف اللہ ہم تو کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔

دس ہزار کی کال

ان دنوں "دس ہزار روپے کی ٹیلی فون کال" نامی خبر کی بڑی دھوم ہے۔ یہ خبر کچھ یوں ہے ہالینڈ میں مقیم ایک پاکستانی نے سمندری میں مقیم اپنے کسی عزیز سے گپ شپ لڑانے میں ٹیلی فون کال پر دس ہزار روپے سے زائد رقم خرچ کی یہ ٹیلیفون کال چار گھنٹے پانچ منٹ تک جاری رہی اس دوران فیصل آباد سے سمندری تمام ٹریفک معطل رہی ٹیلی فون اپریٹر نے کال ختم کرنے کے لئے بار بار درخواست کی اور بالآخر تنگ آکر خود ہی کال منقطع کر دی۔

پہلی دھوم اس بات کی ہے کہ وہ کونسا ایسا شیر دلیر امیر کبیر شخص ہے۔ جس نے اپنے کسی عزیز کے ساتھ صرف گپ شپ لگانے کے لئے دس ہزار روپے اڑا دیئے چونکہ غیر ملکی کالوں کا کچھ تجربہ اس ناچیز کے پاس بھی ہے اس لئے پہلی دھوم کی وجہ بیان کرتا ہوں...... ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے آپ ریسیور اٹھاتے ہیں......

"ہاں جی کی حال چال اے؟"

"کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"جی میں ثمرقندی بول رہا ہوں"

"شکر قندی؟"

"نہیں ثمرقندی...... بھئی کمال ہے پہچان ہی نہیں رہے ہیں ایک مرتبہ پاک ٹی ہاؤس میں ملاقات ہوئی تھی"

"جی فرمایئے"

"فرمایئے کیا بس حال چال پوچھنا تھا...... میں نے آپ سے ذکر بھی کیا تھا کہ ان دنوں باہر جانے کے چکر میں ہوں"

اب مجھے کوئی ایک صاحب تھوڑے سے یاد آئے ہیں جو غالباً ثمرقندی یا تاشقندی وغیرہ تھے۔

"جی جی یاد آگیا...... تو پھر آپ باہر گئے تھے؟"

"باہر گئے کیا میں تو باہر ہی ہوں...... نیو یارک سے بول رہا ہوں کیا حال ہے؟"

"بس ٹھیک ہوں...... لیکن...... خیریت ہے ناں"

"بالکل خیریت ہے آپ سنائیں؟"

میں ان کو سناتا ہوں وہ پھر حال چال پوچھتے ہیں میں بتاتا ہوں اور بالآخر تقریباً آدھ گھنٹہ گزرنے کے بعد پوچھتا ہوں

"ثمرقندی صاحب...... آپ کو ٹیلی فون چارجز بہت پڑ رہے ہوں گے...... میں فون بند کر دوں؟"

"اجی نہیں جناب فکر نہ کریں ایک پارٹی پر آیا تھا...... فون دیکھ کر خیال آیا کہ پاکستان کے دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگائی جائے...... آپ بات کریں...... مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا۔ سب شراب پی رہے ہیں اور کیا حال ہے؟"

ایک روز ٹیلی فون کی گھنٹی بجی میں ریسیور اٹھا کر "ہیلو" کہا تو ادھر سے آواز آئی "باؤ علم دین ہے نا؟"

"میں نے کہا" باؤ علم دین؟ قبلہ آپ نے غلط نمبر پر فون کیا ہے"

"آپ کون بول رہے ہیں؟"

"میں باؤ مستنصر بول رہا ہوں"

"لاہور سے"

"جی ہاں"

"میں ناروے سے ماجھا سائیں بول رہا ہوں لاہور کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے لیکن میں باؤ علم دین نہیں ہوں"

"او جی کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم نے لاہور کا حال چال پوچھنا تھا آپ سے پوچھ لیتے ہیں ادھر تو جی بڑی..... سردی پڑ رہی ہے برفاں ہی برفاں لاہور میں کیا حال ہے؟"

"یہاں بھی سردی ہے"

گنڈ چھولے بک رہے ہوں گے..... سری پائے اور حلیماں"

"ہاں جی بک رہے ہیں"

"لاہور کی کیا بات ہے..... ہور کی حال چال اے؟"

ماجھا سائیں نے بھی کم از کم آدھ گھنٹہ مجھ سے بات کی اور ظاہر ہے کسی نارویجین یا پاکستانی دوست کے ٹیلی فون سے۔

اس خبر کے بارے میں دھوم یہ ہے کہ آخر چار گھنٹے اور پانچ منٹ تک کیا گپ شپ ہو سکتی ہے یہ ناممکن ہے کہ کوئی بھی اتنا عرصہ صرف گپ شپ لڑاتا رہے..... لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ ناممکن ہے کیونکہ "کاکا ہوا ہوگا"..... اور اس "کاکے" کی تفصیل کچھ یوں ہے..... ہمارے ایک دوست جو خیر سے ماہر معاشیات ہیں یورپ میں رہائش پذیر ہونے کے شوق میں ہالینڈ چلے گئے وہاں ایک طویل عرصہ بیکاری کاٹی پھر ٹیکسی چلائی اور بالآخر مترجم کے طور پر امیگریشن ڈیپارٹمنٹ

میں ملازم ہو گئے انہی دنوں ہالینڈ کے محکمہ پولیس نے ان کے ساتھ رابطہ قائم کیا ہالینڈ میں ایک سکھ کے بارے میں انہیں شک تھا کہ وہ منشیات کے کاروبار میں ملوث ہے ان کے پاس اس سکھ کی ایک طویل گفتگو کا ٹیپ تھا جو اس نے امریکہ میں مقیم اپنے کسی دوست کے ساتھ ٹیلی فون پر کی اب ہالینڈ پولیس یہ چاہتی تھی کہ یہ ٹیپ جو کہ ظاہر ہے پنجابی زبان میں تھی ہمارے دوست سنیں اور انہیں بتائیں کہ منشیات کے کاروبار کے بارے میں کیا گفتگو ہوئی... کتنے لاکھ ڈالر کا لین دین ہوا اور کون کونسے بین الاقوامی گروہوں کے نام اس میں آئے ہیں..... ہمارے دوست کے سامنے ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا گیا گفتگو کچھ اس قسم تھی۔

"اوئے بنت سنگھ ہے؟"

"اوئے تو کون ہے؟"

"میں وساکھی سنگھ ہوں"

"اچھا..... کیا بات ہے؟"

"نہ تو بنتا سنگھ ہی ہے ناں؟"

"آہو بول بول"....

"اوئے میں ہالینڈ سے بول رہا ہوں تو امریکہ والا بنت سنگھ ہی ہے ناں"

اوئے تو تو ہمارا یار ہو ناں"

"آہو..... یہ بات ہے کہنے کی..... ہا اور کس کے یار ہیں"

"پر تو بنت سنگھ ہی ہے ناں؟"

"ہور کیا رنجیت سنگھ ہوں..... اوئے تو بول بول"

"یار کاکا ہوا ہے..... ودھائیاں ہوں تجھے"

"ہیں..... ہو گیا ہے..... کیا کہا کیا ہو گیا ہے؟"

"اوئے کاکا ہو گیا ہے"

"پر کس کو ہو گیا ہے؟"

"اوئے تیری برجھائی کو۔۔۔۔ بدھائیاں ہوں تجھے"

"پر کونسی برجھائی کو"

"یار تیری برجھائی کو۔۔۔۔ بدھائیاں ہوں تجھے"

"کاکا برجھائی کے ہوا ہے اور بدھائیاں مجھے دے رہا ہے"

"تو اور کس کو دوں؟"

"یا۔۔۔۔ پر یار یہ کاکا ہوا کس کے ہے۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔"

"مت ماری گئی ہے تیری۔۔۔۔ اوئے میری بوہٹی کے کاکا ہوا ہے۔۔۔۔۔ میرے بھی ہوا ہے"

"یا تو اس طرح نا کہ تیرے ہاں بھی ہوا ہے۔۔۔۔ بدھائیاں ہوں تجھے"

"کاکے" کے بارے میں یہ گفتگو پورے دو گھنٹے چلتی رہی اور جب ہالینڈ پولیس کو میرے دوست نے بتایا کہ جناب یہ سردار صاحب بالکل بے گناہ ہیں اور انہوں نے ٹیلی فون پر اپنے ایک عزیز دوست کو صرف یہ بتایا ہے کہ ان کے بیٹا تولد ہوا ہے تو پولیس والوں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ پورے دو گھنٹے میں ایک شخص آخر کتنی مرتبہ یہ بتا سکتا ہے کہ اس کے گھر کاکا ہوا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہالینڈ میں مقیم پاکستانی نے اپنے پاکستانی عزیز کو بھی چار گھنٹے اور پانچ منٹ میں یہی بتایا ہو گا کہ اس کے "گھر" کا "کاکا" ہوا ہے بدھائیاں ہوں۔

گزارا نہیں ہوتا

"یار گزارا نہیں ہوتا"

"ہاں یار گزارا نہیں ہوتا"

شکیل میرا کلاس فیلو تھا۔ بیس برس بعد راہ چلتے ملاقات ہو گئی، بلکہ صرف میری چلتے چلتے ملاقات ہو گئی کیونکہ میں پیدل چل رہا تھا اور وہ یونہی ایک سپورٹس کار میں وہاں سے گزر رہا تھا۔

اب ہم گلبرگ کے ایک چینی ریستوران میں چکن کارن سوپ دھیرے دھیرے سپ کر رہے تھے۔ اور اپنی داستانِ حیات بیان کر رہے تھے۔ اور اس داستان کے ہر دوسرے فقرے کے بعد وہ کہتا "یار گزارا نہیں ہوتا" اور میں زور زور سے سر ہلا کر اس کی تائید کرتا کہ "ہاں یار گزارا نہیں ہوتا"۔ شکیل ہر پانچ منٹ کے بعد کسی نئی اور انوکھی سی چینی ڈش کا آرڈر دے دیتا۔ اور جونہی وہ چٹکی بجا کر ویٹر کو اپنی جانب متوجہ کرتا میرا دل ڈوبنے لگتا۔ کیونکہ یہ ابھی تک طے نہیں ہوا تھا کہ بل کون ادا کرے گا۔ اگرچہ پرانے دوستوں میں سو دو سو روپے کا بل تو نہایت واجبی سی رقم ہوتی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا یونہی پیدل جا رہا تھا اور اس قسم کا بل ادا کرنے کی میری "تیاری" نہ تھی۔ بس ایک دو نوٹ تھے میری جیب میں جو قدرے معمولی نوعیت کے تھے۔ بہرحال ہم باتیں کرتے رہے اور کھاتے رہے اور مہنگائی کا رونا روتے رہے۔

"یار گذارا نہیں ہوتا" اس نے ایک مرتبہ پھر کہا۔

میں نے حسبِ معمول سر ہلا کر کہا "ہاں یار گزارا نہیں ہوتا دس کے نوٹ کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں رہی۔

شکیل نے سر اٹھایا، مجھے غور سے دیکھا اور پوچھنے لگا "دس کا نوٹ؟..... کیا وہ ابھی تک سرکولیشن میں ہے؟"

"ہاں..... ہے" میں نے اپنی جیب تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

اس نے چٹکی بجائی اور ویٹر کو بلا کر ایک اور ڈش کا آرڈر دے دیا۔

میں نے پوچھا کہ ان ڈھیر ساری ڈشوں کا آخر ہم نے کرنا کیا ہے، کھا تو نہیں سکتے۔ وہ کہنے لگا، سبھی کو چکھتے ہیں جو مزیدار ہوگی وہ کھا لیں گے۔

میں نے کہا تو باقی خوراک جو بچ جائے گی اس کا کیا ہوگا۔ وہ بولا بچی ہوئی خوراک ریستوران کے پچھواڑے میں رکھے ڈرم میں پھینک دی جاتی ہے۔ اور اسے کتے اور بلیاں وغیرہ کھا لیتے ہیں ضائع نہیں جاتی۔

شکیل کا باپ سائیکل پنکچر کا کاروبار کرتا تھا اور نسبت روڈ کے گندے نالے کے کنارے پر بیٹھ کر کرتا تھا۔ شکیل ان دنوں چھیلو تھا۔ اور اس کی غربت چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ اور اب اس کی امارت مجھ ایسے مڈل کلاسئے کے لئے انتہائی مرعوب کن تھی۔ وہ اتنا دولت مند اور خوشحال کیسے ہوا اور کیوں ہو گیا، میں نے نہیں پوچھا، کیونکہ شاید اس طرح مجھے اپنی محرومیوں کا احساس تنگ کرتا۔ گزارا تو میرا نہیں ہوتا تھا، پھر شکیل کیوں بار بار یہی فقرہ دہرائے چلا جا رہا ہے، چنانچہ میں نے پوچھا یار شکیل تم تو ٹھیک ٹھاک ہو میرا مطلب ہے کہ..... تمہارا گزارا کیسے نہیں ہوتا۔ وہ ہنسا اور دیر تک ہنستا رہا کہنے لگا میں بتاتا ہوں کیسے گزارا نہیں ہوتا۔ یہ سپورٹس کار ہے ناں، پونٹی ایک..... آٹھ میل فی گیلن کرتی ہے۔ راولپنڈی آنے جانے میں

پندرہ سو روپے کا پٹرول خرچ ہو جاتا ہے۔ بیگم کے پاس جو کار ہے وہ البتہ بہت معقول ہے۔ گیلن میں بیس میل کرتی ہے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں یورپ گئے تھے وہاں چار پانچ لاکھ خرچ ہو گیا یہاں گھر کا خرچہ ایک لاکھ سے کم نہیں بجلی بہت مہنگی ہے، چھ ایئرکنڈیشنروں کا حساب کر لو چھ سو روپے فی ایئرکنڈیشنر..... آمدن نہ ہونے کے برابر ہے، اور تم پوچھتے ہو کہ کیسے گزارا نہیں ہوتا..... ملاقات کے اختتام پر شکیل نے بل ادا کیا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کیونکہ ان دنوں ہوٹلوں میں کم از کم دس کا نوٹ سرکولیشن میں نہیں رہا۔

ہم باہر آئے اور شکیل دوبارہ ملنے کے وعدے کے ساتھ میری کمر پر ایک مربیانہ تھپکی کے بعد چلا گیا۔

اسی شام ٹی ہاؤس میں ایک ادیب دوست سے ملاقات ہو گئی میں نے پوچھا کیا حال ہے؟ کہنے لگا یار گذارا نہیں ہوتا۔ میں نے پوچھا اب بھی نہیں ہوتا پہلے تو کوئی معمولی سی ملازمت کرتے تھے اب لیکچرر ہو..... وہ کہنے لگا، چار ہزار تنخواہ ہے۔ چار ہزار کی ٹیوشنیں کرتا ہوں اور پھر بھی گذارا نہیں ہوتا۔ میں سوچ میں پڑ گیا یا خدا گذارا تو مجھ ناتواں کا نہیں ہوتا اور دہائی یہ لوگ دے رہے ہیں۔

اگلے روز چھٹی تھی میں مکان کے باہر کرسی ڈالے اخبار پڑھ رہا تھا، اور دھند آلود خنک دھوپ میں سانس لے رہا تھا۔ ایک خمیدہ کمر لیکن مضبوط ہڈیوں کا بوڑھا دور سے آتا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کر قریب آیا اور کہنے لگا۔ بابو جی روٹی مل جائے وہ شکل سے گداگر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے سوچا ایک شریف آدمی کو روٹی کھلانے سے ثواب نہیں ہوتا اس لیے میں نے ماتھے پر ہتھیلی جما کر کہا، بابا معاف کرو، وہ چلا گیا بلکہ چلنے لگا۔ میری بیوی جو گیٹ پر سے جھانک رہی تھی بولی۔ عجیب شخص ہو، کوئی روٹی مانگے تو کبھی انکار نہیں کرتے۔ میں نے کہا پکی ہوئی ہے؟ کہنے لگی پکا

لیتی ہوں تم بابے کو پکڑ لاؤ۔

بیگم نے دو موٹی موٹی روٹیاں پکائیں، فرج میں سے سالن نکالا اور گرم کر کے پلیٹ میں ڈال دیا۔ بابا روٹی کھاتا رہا اور میں اسے بغور دیکھتا رہا تاکہ وہ ہماری پلیٹ سے کرچمپت نہ ہو جائے میں نے پوچھا، بابا کہاں سے آرہے ہو؟

کہنے لگا، رائے ونڈ سے آرہا ہوں، فیصل آباد جانا ہے...... صبح سویرے چلا تھا جیب میں لاہور سے فیصل آباد تک کا کرایہ تھا اس لئے پیدل آرہا ہوں اب یہاں سے بادامی باغ چلا جاؤں گا بسوں کے اڈے پر بھوک لگی۔ اور بندہ دس پندرہ میل پیدل چلے تو لگ جاتی ہے۔ باؤجی اگر بازار سے دو روپے کی روٹی کھا لیتا تو تو پھر شیخوپورہ تک پیدل جانا پڑتا۔ کسی گھر سے روٹی مانگ لینا تو بری بات نہیں ہوتی گاؤں میں تو ہم ایسا ہی کرتے ہیں.....

بابے نے روٹی ختم کی، مونچھیں صاف کیں اور دعائیں دیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا وہ جانے لگا تو میں نے اس سے پوچھا بابا تمہارا گذارا ہو جاتا ہے؟ پہلے تو وہ میرے سوال کو نہ سمجھا پھر میں نے قدرے تفصیل سے بتایا تو کہنے لگا، باؤجی گذارا ہوتا نہیں کرنا پڑتا ہے اللہ نے صحت دی ہے کبھی بھوکا نہیں رہا، بال بچے آباد ہیں، بڑی موج ہے...... بڑا سوہنا گذارہ ہو رہا ہے...... سلام علیکم!

(پاکستان ٹیلی ویژن سے ڈرامائی تشکیل ٹیلی کاسٹ کی گئی)
